ملّتِ اسلامیّہ کی مختصر تاریخ

(پنجم)



ثروت صولت

ملّتِ اسلامیّہ کی مختصر تاریخ

(پنجم)

ثروت صولت

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ

نام کتاب: ملتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ (پنجم)
مصنف: ثروت صولت
اشاعت: دسمبر 2014ء
ایڈیشن: 7
تعداد: 600
قیمت: -/250 روپے
مطبع: مکتبہ جدید پریس، لاہور

اہتمام:
عبدالحفیظ احمد (مینجنگ ڈائریکٹر)
اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
منصورہ ملتان روڈ، لاہور پاکستان
فون: 042-35417074, 35417071
فیکس: 042-35417072
موبائل: 0300-8485030
ویب سائٹ: www.islamicpak.com.pk
ای میل: islamicpak@yahoo.com

فہرست مضامین

باب ۵۱

ایشیا

جاپان

جاپان کا رقبہ ایک لاکھ ۴۳ ہزار مربع میل (۳ لاکھ ۶۹ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) گیارہ کروڑ ستر لاکھ ہے۔

جاپانی زیادہ تر شنٹو مذہب اور بدھ مت کے پیرو ہیں۔ شنٹو جاپانیوں کا قدیم مذہب ہے اور مشرکانہ عقائد کا مجموعہ ہے۔ شنٹو عقیدے کے تحت شہنشاہ جاپان سورج دیوتا کی اولاد ہے۔ بدھ مت کی اشاعت چھٹی صدی عیسوی سے شروع ہوئی اور جلد ہی اس کے پیرووں کی تعداد شنٹو مذہب کے ماننے والوں کے برابر ہوگئی۔ لیکن بدھ مت والوں نے شنٹو مذہب کے بہت سے مشرکانہ عقائد قبول کر لیے ہیں اور بعض اوقات یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں ہوتا کہ ایک جاپانی بدھ مت کا پیرو ہے یا شنٹو مذہب کا۔ ۱۹۷۹ء میں شنٹو مذہب کے ماننے والوں کی تعداد نو کروڑ ۸۳ لاکھ تھی جب کہ بدھ مت والوں کا دعویٰ تھا کہ ان کی تعداد ۸ کروڑ ۸۷ لاکھ تھی۔[1] حالانکہ جاپان کی کل آبادی گیارہ کروڑ ستر لاکھ ہے۔ آبادی سے عدم مطابقت کی وجہ یہی ہے کہ جاپانیوں کی بڑی تعداد دونوں مذاہب کے پیرو ہونے کی دعوے دار ہے اور یہ دونوں عقیدے ایک دوسرے میں گھل گئے ہیں۔

سولھویں صدی کے وسط میں جب پرتگالی جاپان پہنچے تو ملک میں عیسائی مذہب کی اشاعت بھی شروع ہوگئی۔ اس وقت جاپان میں عیسائیوں کی تعداد نو لاکھ ۴۷ ہزار ہے۔ یہودیوں کی تعداد چار سو ہے۔

اسلام کی آمد

جاپان میں اسلام کی اشاعت کا آغاز موجودہ صدی کے پہلے عشرہ میں ہوا اور عام طور پر احمد

---

(۱) دی اسٹیٹسمین ایر بک ۱۹۸۲ء۔ ۱۹۸۳ء

اریگا اور عمر یاما اوکا کے نام اولین مسلمانوں کی حیثیت سے۔لیے جاتے ہیں۔ان دونوں نے ۱۹۰۹ء میں حج بھی کیا تھا۔لیکن نو مسلم جاپانی دانشور ابوبکر موری موتو کی تازہ تحقیق یہ ہے کہ تورا جیرو یامادا (۱۸۶۷ء تا ۱۹۵۷ء) پہلے جاپانی مسلمان ہیں جنھوں نے ۱۸۹۳ء میں ترکی میں اسلام قبول کیا پھر حج بھی کیا۔[1] جاپان میں اشاعت اسلام کی تاریخ کے ضمن میں ایک ترکستانی مہاجر عبدالرشید ابراہیم (۱۸۵۳ء تا ۱۹۴۴ء) اور ایک مصری صحافی احمد جرجاوی کا نام بھی آتا ہے۔ قاضی عبدالرشید ابراہیم کی کوششوں سے کئی جاپانی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے جن میں عمر یاما اوکا کا نام سب سے نمایاں ہے۔عمر یاما اوکا نے ٹوکیو میں واقع بیرونی زبانوں کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی تھی اور ۱۹۰۴ء تا ۱۹۰۵ء کی روسی جاپانی جنگ میں حصہ لیا تھا۔ جنگ کے بعد قاضی عبدالرشید ابراہیم سے ان کی ملاقات ہوئی اور انہوں نے اسلام قبول کیا اور جیسا کہ پیچھے بتایا جا چکا ہے انہوں نے ۱۹۰۹ء میں حج بھی کیا۔اس حج میں جس کی روئیداد انہوں نے ایک کتاب میں لکھی ہے قاضی عبدالرشید بھی ان کے ساتھ تھے۔[2]

احمد جرجاوی مذاہب عالم سے متعلق ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے ۱۹۰۷ء میں ٹوکیو گئے تھے۔انہوں نے بعد میں ایک سفرنامہ لکھا جس کا اردو ترجمہ ۱۹۰۸ء میں حمیدیہ اسٹیم پریس لاہور سے شائع ہوا۔اگر چہ ان کا جاپان میں صرف ایک ماہ قیام رہا،لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ اس مدت میں انہوں نے بارہ سو جاپانیوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔[3] لیکن جاپانی ذرائع سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی اور یہ دعویٰ مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔

جاپان میں اسلام سے وسیع پیمانے پر دلچسپی کا اظہار ۱۹۳۰ء کے بعد سے ہوا۔غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ جاپان اپنی نئی توسیعی پالیسی کو کامیاب بنانے کے لیے اسلامی ممالک کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔چنانچہ ۱۹۳۰ء سے دوسری عالمی جنگ کے آغاز

(۱) اسلامک کلچر فورم،شمارہ نمبر ۱۱۔اپریل ۱۹۷۹ء ابوبکر موری موتو کے اس مضمون کے ترجمہ کے لیے دیکھئے اُردو ڈائجسٹ، لاہور نیز روزنامہ جسارت،کراچی ۲۲،جون ۱۹۸۲ء

(۲) مسلم اقلیتوں کے انسٹی ٹیوٹ کا ششماہی مجلہ جرنل جلد اول شمارہ اول ۱۹۷۹ء مضمون کے ترجمہ کے لیے دیکھئے فکر ونظر، اسلام آباد ستمبر ۱۹۸۲ء

(۳) سہ ماہی ''الزبیر'' بہاولپور،شمارہ نمبر ۵، ۱۹۶۲ء صفحہ ۱۱۳۔

تک ملک میں متعدد تحقیقی ادارے، مراکز اور تنظیمیں قائم کی گئیں تاکہ اسلام کے بارے میں براہ راست تحقیقات کی جائے۔ چنانچہ اس کوشش کے نتیجے میں اسلام سے متعلق سیکڑوں کتابچے، کتابیں اور رسالے جاپانی زبان میں شائع ہوئے۔ (۱)

جاپان میں اس دَور کی اسلامی سرگرمیوں میں سوویت یونین سے آئے ہوئے ترک مہاجروں کا نمایاں حصہ ہے۔ ان ہی مہاجر مسلمانوں نے 1915ء میں شہر لوبے میں پہلی مسجد تعمیر کی اور پھر ۱۹۳۸ء میں ٹوکیو میں دوسری مسجد تعمیر کی۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد جب اسلامی دنیا کے بیشتر ملک آزاد ہوگئے تو ان میں سے بعض کے جاپان میں سفارت خانے قائم ہوگئے اور جاپان اور اسلامی ملکوں میں تجارتی تعلقات قائم ہوگئے۔ اس کے علاوہ مختلف اسلامی ملکوں سے خصوصاً انڈونیشیا اور پاکستان سے طلبہ بڑی تعداد میں اعلیٰ تعلیم کے لیے جاپان جانے لگے۔ اس طرح جاپانیوں کو اسلام کا زیادہ قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ لیکن اس دَور میں اسلام کی اشاعت سست رہی۔ جاپان مسلم ایسوسی ایشن کی سالانہ رپورٹ کے مطابق ۱۹۶۷ء میں آٹھ جاپانیوں نے اور ۱۹۶۸ء میں بیس جاپانیوں نے اسلام قبول کیا۔ ان میں اکثریت طلبہ کی تھی اور ان میں بعض جاپانی لڑکیاں بھی شامل تھیں جنہوں نے غیر ملکی مسلمانوں سے شادیاں کرلی تھیں۔ (۲)

مسلمانوں کی تعداد

ابوبکر موری موتو لکھتے ہیں کہ اسلام سے جاپانیوں کی حقیقی دلچسپی کا آغاز ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد ہوا جس میں عربوں نے تیل کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ جاپان چونکہ اپنے پٹرول کی درآمد کا اسی فیصد حصہ مشرقِ وسطیٰ سے خریدتا تھا اس لیے اس کی معیشت کا انحصار اسلامی ملکوں پر تھا۔ اس ضرورت نے جاپانیوں کو اسلامی دنیا اور اسلام کا قریب سے مطالعہ کرنے اور اس سے واقف ہونے پر مجبور کیا۔ اسلام سے اس دلچسپی کے نتیجے میں نومسلم جاپانیوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونا شروع ہوگیا اور جاپانی مسلمانوں کی تعداد چند سال میں چار ہزار سے

---

(۱) یقین انٹرنیشنل، کراچی۔ ۲۲، جون ۱۹۸۱ء بحوالہ جاپان مسلم ایسوسی ایشن۔

(۲) یقین انٹرنیشنل کراچی۔ ۷، مارچ ۱۹۶۹ء۔

بڑھ کر ۱۹۷۳ء میں ۲۵ ہزار ہو گئی۔ ۱۹۸۰ء تک یہ تعداد ۴۵ ہزار ہو گئی اور کہا جاتا ہے کہ اب یہ تعداد پچاس ہزار کے لگ بھگ ہے۔[1]

جاپان میں اسلام کی اس تیز رفتار ترقی کا سہرا ڈاکٹر شوقی فوتا کی (Shawqi Futaki) اور ان کی قائم کردہ تنظیم جاپان اسلامک کانگریس کے سر ہے۔ ڈاکٹر شوقی نے ۱۹۷۳ء میں اسلام قبول کیا تھا۔ اسی سال انہوں نے شاہی شفا خانہ کے نومسلم ڈائرکٹر ڈاکٹر ظاہر کا وانشی (Kawanishi) کے تعاون سے اسلامک کانگریس قائم کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر شوقی نے خود کو تبلیغ اسلام کے لیے وقف کر دیا اور ان کی اور ان کے ساتھیوں کی اَن تھک کوششوں سے پانچ چھ سال کی وقف میں پچیس ہزار سے زیادہ جاپانی دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں کانگریس کے ارکان کی تعداد ۲۵ ہزار ۲۶ تھی۔[2] نومسلموں کی ایک بڑی تعداد ڈاکٹروں، پروفیسروں، پارلیمنٹ کے ارکان اور وزیروں اور اعلیٰ عہدے داروں پر مشتمل ہے۔

اسلامی تنظیمیں

جاپانی مسلمانوں کی پہلی تنظیم "جمعیت مسلمانانِ جاپان" (جاپان مسلم ایسوسی ایشن) ہے جو ۱۹۵۲ء میں قائم کی گئی تھی۔ اس میں وہ سب جاپانی شریک تھے جو اس وقت تک اسلام قبول کر چکے تھے۔ جمعیت کے پہلے صدر صادق ایما ایزومی (Imaizumi) تھے۔ ان کے بعد ممتاز دانشور ابوبکر موری موتو صدر رہوئے۔ ۱۹۸۱ء میں محمد عمر ای اوکی بے (Iokibe) اس کے صدر تھے۔

اسلام کلچر سوسائٹی

اس جماعت کو ۱۹۷۴ء میں الحاج ابوبکر موری موتو نے قائم کیا تھا۔ ابوبکر موری موتو نے ۱۹۶۵ء میں اسلام قبول کیا تھا۔ وہ ٹوکیو کی تاکوشوکو یونیورسٹی میں تاریخ اور فارسی کے پروفیسر ہیں۔ اس سوسائٹی کی طرف سے انگریزی زبان میں ایک رسالہ اسلامک فورم بھی شائع کیا جاتا ہے۔

---

(۱) دنیا کی مسلمان اقلیتیں (انگریزی) مطبوعہ موتمر عالم اسلامی، کراچی ۱۹۷۷ء، ماہنامہ "یونیورسل میسج"۔ نومبر ۱۹۸۱ء اور ہفت روزہ "مسلم ورلڈ" کراچی۔ ۲۰، مارچ ۱۹۸۲ء۔

(۲) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ) مارچ ۱۹۷۹ء۔

جاپان اسلام کانگریس

یہ جاپانی مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم ہے جسے ڈاکٹر شوقی فوتا کی نے ۱۹۷۴ء میں قائم کیا۔ کانگریس کی سرگرمیاں بڑی ہمہ گیر ہیں۔ کانگریس کی طرف سے عربی سکھانے کا انتظام کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو قرآن کی تعلیم دینے کے لیے اسٹڈی سرکل قائم کیے گئے ہیں۔ مستحق اور لائق طلبہ کو اسلامی ملکوں میں اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے وظیفے بھی دیئے جاتے ہیں۔ کانگریس نے پان عرب نیوز ایجنسی (Pana) کے نام سے ایک خبر ایجنسی بھی قائم کی ہے جس کا مقصد عرب اور اسلامی ملکوں سے صحیح خبروں کو جاپان تک پہنچانا ہے۔ اسلامی کانگریس نے عربی اور انگریزی سے جاپانی زبان میں اسلامی کتب منتقل کرنے کا پروگرام بھی بنایا ہے۔ ڈاکٹر شوقی نے مفت طبی امداد کا ایک پروگرام بھی شروع کر رکھا ہے۔ وہ علاج کے سلسلہ میں کچھ خصوصی طریق بھی استعمال کرتے ہیں۔ ان کے کامیاب طریقۂ علاج کی وجہ سے جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ان میں مشہور سائنس دان اور موجد ڈاکٹر ذاکر جیرو فوجی ماسو (Jiro Fuji Masu) کا نام بہت اہم ہے۔ ۱۹۸۰ء میں اسلامی کانگریس کی طرف سے اسلامی سیاست، اسلامی ثقافت، اسلامی معاشیات، اسلامی سائنس اور اسی قسم کے مختلف موضوعات پر متعدد مطالعاتی اجتماعات کیے گئے تھے جن سے متاثر ہو کر نو سیاسی رہنماؤں اور مفکرین نے اسلام قبول کیا۔ ۱۹۸۱ء تک جاپانی پارلیمنٹ کے سات رکن اسلامی کانگریس کی کوشش سے اسلام قبول کر چکے تھے۔[1]

۱۹۶۱ء میں جاپان میں مسلمان طلبہ کی پہلی تنظیم "جمعیت طلبۂ مسلمین" قائم ہوئی جو جاپانی مسلمان طلبہ اور اسلامی ملکوں سے آنیوالے طلبہ پر مشتمل ہے۔ اس دَوران میں ترکی، انڈونیشیا، پاکستان اور دوسرے ملکوں کے طلبہ نے بھی اپنی اپنی تنظیمیں قائم کر لیں۔ کچھ عرصہ بعد جمعیت مسلمانان جاپان اور جمعیت طلبہ مسلمین کو ایک دوسرے میں ضم کر دیا گیا اور اس مشترکہ تنظیم کا نام "مجلس اسلامی" رکھا گیا۔

اسلامی مرکز

۱۹۶۶ء میں اس مجلس میں دوسرے اسلامی ملکوں کی تنظیمیں بھی شامل ہو گئیں اور اس طرح

---

(۱) ہفت روزہ "مسلم ورلڈ" (موتمر عالم اسلامی کراچی۔ ۲۸، مارچ ۱۹۸۱ء

مرکز اسلامی، جاپان وجود میں آیا۔ مرکز اسلامی کے روح رواں چونکہ غیر ملکی طلبہ تھے اس لیے ان کے وطن واپس چلے جانے کے بعد مرکز اسلامی کمزور پڑ گیا۔ لیکن ۱۹۷۵ء میں شاہ فیصل کے دورہ جاپان کے بعد اسلامی مرکز نے پھر ایک فعال ادارے کی شکل اختیار کری۔ جاپان کی تمام جماعتیں مع جاپان اسلامی کانگریس اس مرکزی ادارے کے تحت متحد کر دی گئی ہیں اور اس میں ہر تنظیم کو نمائندگی ملی ہوئی ہے۔ اسلامی مرکز کے گیارہ ڈائرکٹر ہیں جن میں چھ جاپانی ہیں اور باقی پانچ پاکستان، شام، ترکی، مصر اور سوڈان سے لیے گئے ہیں۔ اسلامی مرکز کا دفتر ٹوکیو کی مسجد کے قریب ہے۔

اسلامی مرکز مذاکرات، لیکچروں اور مطبوعات کے ذریعہ جاپانیوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کراتا ہے۔ ۱۹۷۸ء تک مرکز سے مختلف موضوعات پر بیس سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ مرکز سے ''اسلام'' کے نام سے ایک سو صفحات پر مشتمل ایک رسالہ بھی پانچ ہزار کی تعداد میں شائع کیا جاتا ہے۔ مرکز کی طرف سے طلبہ کو اسلامی ممالک میں جا کر تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظیفے دیئے جاتے ہیں۔ مرکز کے کتب خانہ میں ۱۹۷۸ء میں دو ہزار کتابیں تھیں۔ [۱] مولانا مودودی کے رسالہ دینیات کا بھی جاپانی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

قرآن اور مسجدیں

قرآن کا پہلا جاپانی ترجمہ ۱۹۲۱ء میں ساکاموتو مرحوم نے انگریزی ترجمہ سے کیا تھا۔ دوسرا ترجمہ احمد ایری گا اور تکاہشی نے مشترکہ طور پر جرمن ترجمۂ قرآن سے کیا، تیسرا ترجمہ شوی اوکاوا نے براہ راست عربی سے کیا۔ لیکن جاپانی زبان میں سب سے زیادہ مستند ترجمۂ قرآن حاجی عمر ریوا اچی میتا (Ryo Ichi) کا ہے۔ یہ ترجمہ ایک پاکستانی مسلمان حاجی ارشد اور سعودی سفارت خانہ کی مدد سے ۱۹۶۹ء میں مکمل ہوا اور اس کا پہلا ایڈیشن رابطہ عالم اسلامی نے ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔ دوسرا اڈیشن جس میں ترجمہ کو مزید بہتر بنایا گیا ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ [۲]

(۱) اسلامی مرکز کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے جمعیت طلبۂ مسلمین کے جمیل صاحب کا انٹرویو ملاحظہ کیجیے۔ جو روزنامہ جسارت، کراچی مورخہ ۱۱۔ اگست ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا ہے۔

(۲) ایشیا، لاہور۔ ۱۹، مارچ ۱۹۶۹ء، مسلمان اقلیتیں (موتمر کراچی)، اسلامک فورم، ٹوکیو۔ اپریل ۱۹۷۹ء۔

جاپان کی پہلی موجود مسجد ۱۹۳۵ء میں شہر کوبے میں اور دوسری ۱۲۔ مئی ۱۹۳۸ء کو ٹوکیو میں تعمیر ہوئی۔ اسی زمانے میں شہر نگویا میں ایک مسجد تعمیر ہوئی۔ یہ مسجد دوسری عالمی جنگ میں بمباری میں تباہ ہوگئی اور ابھی تک تعمیر نہیں ہو سکی۔ ان مسجدوں کے علاوہ جاپان اسلامک کانگریس نے اپنے وسائل سے ٹوکیو میں تین مزید مسجدیں تعمیر کی ہیں۔ اب ٹوکیو میں ایک کروڑ ڈالر کے خرچ سے ایک عالی شان چھ منزلہ اسلامی مرکز تعمیر کیا جا رہا ہے۔ جو درسی کمروں، ایک کتب خانہ اور لیکچر ہالوں پر مشتمل ہوگا۔ اسلامی مرکز کا سنگ بنیاد ۱۹۸۲ء کے شروع میں رکھا جا چکا ہے۔[۱]

جاپان میں "مجلس برائے مساجد" بھی قائم ہو چکی ہے جو رابطۂ عالم اسلامی کی اعلیٰ عالمی مجلس برائے مساجد کی ایک شاخ ہے۔ اس کے صدر انور اپانی (Apani) ہیں، دوسرے ممبر علی حسن سمنی (Samni) فواد دبس (DEBS) اور ڈاکٹر عبدالکریم سائیتوہ ہیں۔ سائیتوہ جنرل سکرٹری ہیں۔ مجلس نے ٹوکیو مسجد کی تجدید و مرمت کا فیصلہ بھی کیا ہے۔

---

(۱) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل۔ مارچ ۱۹۸۲ء اسلامی مرکز کا ۷، دسمبر ۱۹۸۲ء کو افتتاح ہوگیا۔

کوریا

دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ کے بعد سے (۱۹۴۵ء) کوریا دو حصوں میں تقسیم ہے۔ایک شمالی کوریا جس کا رقبہ ۴۷ ہزار مربع میل (ایک لاکھ ۲۲ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۷۵ء) ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہے اور صدر مقام پیونگ یانگ ہے۔ دوسرا جنوبی کوریا، جس کا رقبہ ۳۸½ ہزار مربع میل (۹۸½ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) ۳ کروڑ ۷۴ لاکھ ہے اور سیول صدر مقام ہے۔

کوریا کے باشندوں کی اکثریت بدھ مت کی پیرو ہے۔ کچھ لوگ کنفیوشس اور شامانی مذہب کے ماننے والے بھی ہیں۔ شمالی کوریا میں چونکہ کمیونسٹ حکومت قائم ہے اس لیے وہاں بیشتر کمیونسٹ ملکوں کی طرح مذہب کو کچل دیا گیا ہے، اس کے برخلاف جنوبی کوریا میں مکمل مذہبی آزادی ہے بلکہ مذہبی عقائد کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے تاکہ لوگ کمیونزم سے دور رہیں۔ مسیحی اداروں کے تخمینوں کے مطابق جنوبی کوریا کی سولہ فیصد آبادی عیسائی ہے، جس میں تیرہ فیصد پروٹسٹنٹ اور باقی رومن کیتھولک کلیسا سے تعلق رکھتے ہیں۔

اسلام

اگرچہ کوریا کی قدیم تاریخ میں عربوں کی آمد کا پتہ چلتا ہے، لیکن یہاں اسلام کا حقیقی آغاز کوریا کی جنگ کے زمانہ میں ترک فوجی دستہ کی بدولت ہوا۔ ترکوں کا یہ دستہ ستمبر ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۳ء تک کوریا میں رہا۔ دستہ میں امامت کے فرائض امام عبدالرحمن اور زبیر کوچو دو شخص دیتے تھے۔ ان ہی دونوں کی کوشش سے کوریا کے چند تعلیم یافتہ اشخاص نے اسلام قبول کیا اور اس طرح کوریا میں اسلام کی اشاعت شروع ہوئی۔ ان ابتدائی مسلمانوں میں جنہوں نے ترک دستہ کے امام کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ایک حاجی محمد یون (yoon) ہیں جو حاجی صابری سوہ کے بعد کورین

مسلم فیڈریشن کے صدر منتخب ہوئے۔[1]

جنگ کے نتیجے میں ملک میں جو تباہی پھیلی تھی، اس کے پس منظر میں اسلام کی دعوت مؤثر ثابت ہوئی اور لوگ تیزی سے اسلام قبول کرنے لگے۔ جاپان کی طرح یہاں بھی اشاعت اسلام کے روح رواں مقامی باشندے تھے۔ ایک اندازہ کے مطابق ۱۹۷۵ء تک کوریا میں مسلمانوں کی تعداد تین ہزار ہو چکی تھی۔[2] ۱۹۷۷ء میں یہ تعداد پانچ ہزار،[3] ۱۹۸۰ء میں پندرہ ہزار[4] اور ۱۹۸۱ء میں انیس ہزار ہوگئی۔ جاپان کی طرح جنوبی کوریا میں بھی اسلام قبول کرنے والوں میں دانشور طبقہ یعنی پروفیسر، صحافی، انجینیر، ڈاکٹر، تجارت پیشہ افراد اور طلبہ کی تعداد بہت ہے۔ ابتدائی مسلمانوں میں عمر کم (Kim) اور صابری صوہ (Suh) کے نام اہم ہیں جنہوں نے ۱۹۵۵ء میں حج کیا۔ وہ کوریا کے سب سے پہلے حاجی ہیں۔

کورین مسلم فیڈریشن کے اعداد و شمار کے مطابق مسلمان حسب ذیل تعداد میں مختلف مقامات پر پھیلے ہوئے ہیں:

سیئول	گیارہ ہزار
پوسان	۸½ سو
گوانگسو	۳½ سو
سعودی عرب	پانچ ہزار پچاس
کویت	ایک ہزار نو سو
دیگر مقامات	چار سو
کل	۱۹ ہزار ۵ سو پچاس[5]

کورین مسلم فیڈریشن کے اعلان کے مطابق ۱۹۶۷ء میں مسلمانوں کی تعداد صرف دو ہزار

(۱) مسلم ورلڈ (موتمر عالم اسلامی) کراچی۔ ۵، ستمبر ۱۹۸۱ء

(۲) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ)۔ جون ۱۹۸۱ء

(۳) دنیا کی مسلمان اقلیتیں (انگریزی)، موتمر عالم اسلامی، کراچی ۱۹۷۷ء۔

(۴) مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ)۔ جون ۱۹۸۱ء

(۵) جرنل (مسلمان اقلیتوں کے امور کا انسٹی ٹیوٹ) جدہ۔ جلد سوم شمارہ نمبر ۲، موسم سرما ۱۹۸۱ء۔

دوسو ساٹھ تھی، ۱۹۷۶ء میں تین ہزار پانچ سو پچاس ہوگئی، ۱۹۷۷ء میں نو ہزار پچپن، ۱۹۷۸ء میں گیارہ ہزار چار سو ۲۸، ۱۹۷۹ء میں پندرہ ہزار چار سو پچاس اور ۱۹۸۰ء میں انیس ہزار پانچ سو پچاس ہوگئی۔

اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ جنوبی کوریا میں مسلمانوں کی متعدد تنظیمیں قائم ہونا شروع ہوگئیں۔ کورین اسلامک سوسائٹی پہلی جماعت ہے جو ۱۵، ستمبر ۱۹۵۵ء کو قائم ہوئی۔ عمر کم جن اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ ۲۵۔ مارچ ۱۹۶۶ء کو کورین مسلم فیڈریشن قائم کی گئی اور اسلامک سوسائٹی اس میں ضم ہوگئی۔[1] مئی ۱۹۶۷ء میں فیڈریشن کو وزارت ثقافت و اطلاعات میں جو مذہبی امور کی دیکھ بھال کرتی ہے رجسٹرڈ کرایا گیا۔ حاجی صابری صوہ، فیڈریشن کے پہلے صدر تھے۔ ۱۹۷۶ء میں ان کے مستعفی ہونے کے بعد امام حاجی محمد یون صدر منتخب ہوئے۔

کورین مسلم فیڈریشن کا پروگرام قرآن، حدیث اور عربی زبان کی تعلیم، اسلامی مطبوعات کی اشاعت، اسلام پر لیکچروں کے انتظام اور غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ پر مشتمل ہے۔ مئی ۱۹۷۷ء میں فیڈریشن کے زیر سرپرستی مسلمان طلبہ کی ایک ایسوسی ایشن بھی قائم کی گئی ہے۔ فیڈریشن کی طرف سے پندرہ روزہ پرچہ "کوریا اسلام ہیرلڈ" اور طلبہ تنظیم کی طرف سے "المسجد" کے نام سے ایک تبلیغی ہفت روزہ شائع کیا جاتا ہے۔[2]

ستمبر ۱۹۷۰ء میں صدر پارک نے دارالحکومت سیول میں جامع مسجد اور اسلامی مرکز کے لیے پانچ ہزار مربع میٹرز مین عطیہ دی جس پر مئی ۱۹۷۶ء میں دو لاکھ ۴۵ ہزار ڈالر کے خرچ سے پہلی مسجد اور اسلامی مرکز کی تعمیر مکمل ہوگئی۔ ۱۲۔ ستمبر ۱۹۸۰ء کو بندرگاہ پوسان میں دوسری مسجد اور اسلامی مرکز کا افتتاح ہوا۔ یہ مرکز لیبیا کے ایک مخیر ڈاکٹر علی بی فلاغ (Fellagh) کے فیاضانہ عطیہ سے تعمیر ہوا جب کہ سیول کی مسجد اور مرکز مختلف عرب ملکوں کی مدد سے تعمیر کیے گئے تھے۔ کوریا کی تیسری مسجد کویت کے ایک مخیر عبدالعزیز الریس کی مالی امداد سے سانگ یونگ (snag yong) میں تعمیر کی گئی ہے جس کا افتتاح جون ۱۹۸۱ء کو ہوا۔ سانگ یونگ شہر سیلول کے جنوب مشرق میں

(۱) جرنل (مسلمان اقلیتوں کے امور کا انسٹی ٹیوٹ) جدہ۔ جلد سوم شمارہ نمبر ۲، موسم سرما ۱۹۸۱ء۔

(۲) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل، مکہ۔ جون ۱۹۸۱ء

۷۴ کلومیٹر کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے۔ [1]

اس وقت سیول کے جنوب مشرق میں یونگن کیا نگی ڈو کے مقام پر ایک شاندار اسلامی یونیورسٹی زیر تعمیر ہے، جس کے لیے حکومت کوریا نے جولائی ۱۹۸۰ء کو چار لاکھ تیس ہزار مربع میٹر کا ایک قطعہ اراضی دیا تھا۔ جب عام مسلمانوں اور سعودی حکومت نے دس لاکھ ڈالر فراہم کر دیئے تو ستمبر ۱۹۸۰ء میں یہاں سب سے پہلے ایک مسجد اور اسلامی مرکز کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ سنگ بنیاد کی اس تقریب میں پاکستان سے جسٹس افضل چیمہ، خلیل حامدی اور احسان الٰہی ظہیر نے شرکت کی۔ پورے منصوبہ پر دو کروڑ ڈالر خرچ آئیں گے۔ یونیورسٹی میں تین علمی شعبے (فیکلٹی) اور نو تعلیمی شعبے (ڈپارٹمنٹ) ہوں گے اور طلبہ کی تعداد تین ہزار دو سو ہو گی۔ [2]

کراچی میں جنوبی کوریا کے قونصل جنرل کے ایک بیان کے مطابق یونیورسٹی کی تعمیر کے اخراجات سعودی حکومت برداشت کرے گی اور اس میں دوسرے ملکوں کے طلبہ کو بھی تعلیمی سہولتیں حاصل ہوں گی۔ [3]

---

(۱) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل، مکہ۔ جون ۱۹۸۱ء

(۲) ایضاً

(۳) روزنامہ ''جسارت'' کراچی۔ ۲۹، دسمبر ۱۹۸۰ء

چین

چین سے اسلام کا تعلق بہت قدیم ہے، اور اگر چینی روایات کو تسلیم کرلیں تو یہ تعلق عہد رسالت یا زیادہ سے زیادہ خلافت راشدہ کے زمانہ ہی میں قائم ہوگیا تھا۔ اس کے ثبوت میں شہر کنیٹن کا وہ مزار پیش کیا جاتا ہے جو حضورؐ کے ماموں اور مشہور صحابی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص سے منسوب ہے۔ روایت کے مطابق حضرت عثمانؓ نے ۶۵۱ء/۲۹ھ میں سعد بن ابی وقاص کو تبلیغ اسلام کے لیے چین بھیجا تھا لیکن اس قسم کی روایتیں قابل اعتبار نہیں۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے آخری زمانے میں احنف بن قیس نے ایران کے آخری ساسانی حکمران یزدگرد کو ایران سے نکال دیا تو وہ تانگ خاندان کے مشہور حکمران تائی چونگ (Tai Tsung)[1] کے پاس مدد کے لیے چین گیا تھا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے دَور میں یزدگرد نے اپنی سلطنت واپس لینے کی جو آخری کوشش کی تھی وہ چین کی مدد سے ہی کی تھی۔ لیکن چین کے یہ دستے چینی فوج پر مشتمل نہیں تھے بلکہ چین کے باجگذار ترک سرداروں اور ترک باشندوں پر مشتمل تھے۔

اس کے بعد اموی دَور میں مشہور سپہ سالار اور فاتح ترکستان قتیبہ بن مسلم نے ۷۱۵ء/۹۶ھ میں کاشغر فتح کرلیا اور وہ طرفان[2] کے شہر تک بڑھتا چلا گیا اور ابن اثیر کی روایت کے مطابق مسلمانوں کا ایک وفد ہبیرہ کلابی کی قیادت میں چین کے شہنشاہ کے دربار میں گیا اور اس کو اسلام کی دعوت دی۔ چین کے شہنشاہ ہوان چنگ[3] (Hsuan Tsung) نے جزیہ دے کر اپنی جان چھڑائی۔ اگرچہ یہ جزیہ علامتی نوعیت کا تھا اور فی الحقیقت ہدیہ تھا۔ غالباً یہ واقعہ مسلمانوں اور چین

---

(۱) تائی چونگ نے ۶۲۷ء تک حکومت کی۔ وہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کا ہمعصر تھا۔

(۲) بدرالدین چینی: چین وعرب کے تعلقات صفحہ ۱۳۹ (انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۴۹ء)

(۳) ہوان چونگ نے ۷۱۲ء تا ۷۵۶ء حکومت کی۔

کے درمیان تعلقات کا پہلا مستند تاریخی واقعہ ہے۔ بدرالدین چینی نے اپنی کتاب ''چین وعرب کے تعلقات'' میں لکھا ہے کہ قتیبہ کے تھوڑے دن بعد اویغور قوم کے ایک سردار اویغور ابن قراخان نے اسلام قبول کرلیا۔ اویغور ترکوں کا وہ قبیلہ ہے جو مشرقی ترکستان میں جسے چینی ترکستان کہا جاتا ہے آباد ہے۔ اس زمانے کے حالات کے مطابق اس کے بعد یقیناً اس قبیلے کے بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا ہوگا۔ اس طرح مشرقی ترکستان میں جو اس وقت چین کی عملداری میں ہے اسلام یقینی طور پر پہلی صدی ہجری کے آخر یا دوسری صدی ہجری کے آغاز میں پہنچ گیا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ۷۰۴ء میں جب قتیبہ نے سمرقند فتح کیا تو مسلمانوں نے چینی قیدیوں سے کاغذ بنانا سیکھا۔ لیکن یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کاغذ سازی کی صنعت مسلمانوں نے ان قیدیوں سے سیکھی تھی جو ۷۵۱ء میں جنگ تالاس میں پکڑے گئے تھے۔ اس جنگ میں پچاس ہزار چینی ہلاک اور بیس ہزار قید ہوئے تھے۔[1] اس جنگ کے چار سال بعد ہی چین میں ایک زبردست بغاوت ہوگئی جسے اویغور اور عرب مسلمانوں کے ایک دستے نے جو شہنشاہ چین کی درخواست پر بھیجا گیا تھا فرو کیا۔ اس خدمت کے صلے میں مسلمانوں کو چین کے مختلف شہروں میں آباد ہونے کی اجازت مل گئی۔ چین میں مسلمانوں کی آبادکاری کا یہ پہلا مستند ثبوت کہا جاسکتا ہے۔

اس واقعہ کے بعد ہمیں چین کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کے بارے میں کوئی معلومات نہیں اگرچہ تیسری صدی ہجری سے مسلمانوں نے جو سفرنامے اور جغرافیہ کی کتابیں لکھیں ان میں چین کا حال ضرور ہے۔ اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان تاجروں نے چین کے شہروں میں بستیاں قائم کرلی تھیں۔ بدرالدین چینی نے اپنی کتاب میں ایسی تیس کتابوں کے نام اور ان کے اقتباسات پیش کیے ہیں۔ چین کے ابتدائی مسلمان سیاحوں میں سلیمان تاجر کا نام اہم ہے جو تیسری صدی کے اول نصف میں چین گیا تھا۔ مسلمان تجارت کے سلسلے میں بحری راستے سے بھی جاتے تھے اور وسط ایشیا کے خشکی کے راستے بھی، چینیوں نے بھی اس زمانہ میں یعنی عہد تانگ میں عرب اور اسلام سے متعلق کتابیں لکھیں۔ چینی مورخوں نے بنی امیہ کے زمانہ میں سترہ اور بنی عباس کے زمانہ میں پندرہ سفارتوں کے چین آنے کا تذکرہ کیا ہے۔[2] لیکن

---

(۱) بارتھولڈ کی کتاب ''ترکستان منگولوں کے حملے تک'' (انگریزی) صفحہ ۱۹۶ء

(۲) بدرالدین چینی: چین وعرب کے تعلقات۔

ان میں سے بیشتر کی تصدیق مشکل ہے۔

جہاں تک مشرقی ترکستان کا تعلق ہے وہاں کا اویغور حکمران صاتق بغرا خاں ۹۵۰ء/ ۳۲۹ھ میں اسلام لایا اور اس کا نام عبدالکریم رکھا گیا۔ اس کو مشرقی ترکستان میں آج بھی ولی کا درجہ حاصل ہے۔ اس کو بخارا کے تاجروں نے مسلمان کیا تھا۔[۱] اس کے بعد اس کے لڑکے بائے تاس کے زمانے میں جس کا اسلامی نام موسیٰ تھا مشرقی ترکستان کے تمام باشندوں نے اسلام قبول کر لیا۔[۲] تاریخ میں مشرقی ترکستان کے اس پہلے حکمران خاندان کو ایلک خانی کہا جاتا ہے۔ اس خاندان نے ۳۸۰ء سے ۶۰۹ء تک حکومت کی اور اس کا مرکز کاشغر تھا۔ پھر ۳۹۵ میں مغربی ترکستان کی سامانی حکومت کو ختم کرنے اور بخارا پر قبضہ کرنے کے بعد دوسرا مرکز سمرقند ہو گیا تھا۔

عہد سونگ

اسی زمانہ میں جب کہ ترکستان میں ایلک خانی خاندان حکومت کر رہا تھا چین میں تانگ خاندان کی جگہ ایک نیا خاندان برسر اقتدار آیا جو سونگ کہلاتا ہے۔ سونگ خاندان ۹۶۰ء سے ۱۲۷۰ء تک چین میں برسر اقتدار رہا۔ اس خاندان کے آخری دور میں بحری تجارت عروج پر پہنچ گئی تھی اور چین اور عرب کے درمیان چین اور عرب تاجروں کی آمدورفت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ تجارت کے اس فروغ کے ساتھ ساتھ چین میں عربوں کی آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا اور اسلامی ثقافت چین میں پھیلنے لگی۔ مسلمانوں نے چوہان چاؤ اور ہانگ چاؤ کے ساحلی شہروں میں مسجدیں بنالیں۔ شمالی مغربی چین میں بھی مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہوا۔ چینی ثقافتی امور کے دفتر واقع تائپیہ (Taipei) نے ۱۹۵۵ء میں پروفیسر لوسیانگ لنگ (Lo Hsiang-Lin) کی ایک تحقیقی کتاب شائع کی تھی جس کا نام تھا "پوشوکینگ اور اس کے دور کا نیا مطالعہ۔"[۳] اس میں بتایا گیا ہے کہ اس زمانے میں چین اور دوسرے ملکوں خصوصاً عربوں کے ساتھ وسیع پیمانے پر تجارت ہوتی تھی۔ اس تجارت کی وجہ سے دونوں قوموں نے اقتصادی ترقی بھی کی اور ان کے درمیانی

---

(۱) رضا نور: ترک تاریخی (ترکی) جلد دوم صفحہ ۳۴۸۔ استنبول ۱۹۷۹ء

(۲) اے دلاچار: توندغوبلیک کا تنقیدی مطالعہ (ترکی) صفحہ ۱۷۲ (انقرہ ۱۹۷۲ء)

(۳) A. new study of pushoukeng and his times

تعلقات کو بھی فروغ ہوا اور ایک دوسرے پر تہذیبی اور ثقافتی اثرات بھی پڑے۔

یوآن خاندان کا دورِ حکومت

سونگ خاندان کی حکومت منگولوں نے ختم کر دی۔ پہلے چنگیز خاں شمالی چین پر قابض ہوا پھر اس کے جانشینوں نے جنوب کی طرف بڑھنا شروع کیا یہاں تک قوبلا خاں ۱۲۶۰ء تا ۱۲۹۴ء کے دَور میں منگول پورے چین پر قابض ہو گئے۔ اس خاندان نے ۱۲۶۰ء سے ۱۳۶۸ء تک چین پر حکومت کی۔ یہ وہی زمانہ ہے جب برصغیر پاکستان و ہند میں خاندان غلامان، خلجی اور تغلق کی حکومت تھی۔ ایران اور ترکستان منگولوں کے قبضہ میں تھے اور مصر و شام ممالک پر حکمران تھے۔ منگولوں کے اس خاندان کو چین میں یُوآن کہا جاتا ہے۔

منگول سلطنت چین سے لے کر دریائے فرات تک پھیلی ہوئی تھی۔ ایران، ترکستان اور روس کے منگول حکمرانوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور جب انہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا اس وقت بھی وہ ملکی انتظام اور تمدنی ترقی کے لیے مسلمان حکام اور ماہرین کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ چین کے منگولوں سے ان کے تعلقات برقرار رہے اور تجارتی اور ثقافتی سرگرمیاں پوری منگول دنیا میں جاری رہیں اس لیے مسلمانوں کی چین میں آمدورفت بھی بڑھ گئی اور چین کی منگول حکومت میں ترکستان اور ایران کے مسلمانوں کو بلند عہدوں پر فائز کیا جانے لگا۔

شروع میں قوبلا خاں ہر ملت اور عقیدے کے لوگوں سے رواداری سے پیش آتا تھا لیکن ایران کے ایلخانی حکمران اباخاں (۱۲۶۵ء/ ۶۶۳ھ تا ۱۲۸۲ء/ ۶۸۰ھ) نے جس کی بیوی عیسائی تھی ایک وفد بھیج کر قوبلا خاں کو مسلمانوں کے خلاف کر دیا۔ چنانچہ وہ مسلمانوں پر سختی کرنے لگا۔ شرع کی بجائے مسلمانوں سے منگولی قانون یاسا کی پابندی کرائی۔ اماموں کو مسجدوں سے نکال دیا اور ذبیحہ پر پابندی لگا کر مسلمانوں کو غیر ذبیحہ کھانے پر مجبور کیا گیا۔ چین کے مسلمان سات سال تک سخت آزمائش سے گزرتے رہے۔ ان پابندیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان تاجروں کی آمدورفت کم ہو گئی اور حکومت کی مالگزاری گھٹ گئی۔ چنانچہ قوبلا خاں نے اس مالی نقصان سے بچنے کے لیے اپنا حکم واپس لے لیا۔ اور مسلمانوں کی آزمائش کا دَور ختم ہو گیا۔[1]

---

(۱) بدرالدین چینی: چین و عرب کے تعلقات۔ صفحہ ۳۰۸۔

قوبلا خاں کے زمانے میں چین کے بارہ صوبوں میں سے آٹھ صوبوں کے گورنر مسلمان تھے۔ ان میں سے چند ممتاز مسلمانوں کے حالات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔

سید اجل

چین کے منگولی دَور میں جو لوگ بلند ترین عہدوں پر فائز کیے گئے ان میں سب سے نمایاں نام شمس الدین عمر (۱۲۱۰ء تا ۱۲۷۹ء) کا ہے جو سید اجل کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ بخارا کے رہنے والے تھے اور قوبلا خاں کے زمانے میں چین چلے آئے تھے۔ شروع میں وہ وزیر مالیات رہے، اس کے بعد صوبہ یونان فتح کرنے کے لیے ان کو قائد اعلیٰ بنایا گیا اور جب یہ صوبہ جو جنوبی چین میں برما کی سرحد پر واقع ہے فتح ہو گیا تو سید اجل نے وہاں ۱۲۷۴ء سے ۱۲۷۹ء تک صوبہ کے گورنر کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ انہوں نے اس صوبہ میں پہلی دو مسجدیں تعمیر کیں جو اشاعت اسلام کا مرکز بن گئیں۔ سید اجل کے نو بیٹے تھے۔ ان سے کئی بڑے خاندان پیدا ہوئے۔ یہاں تک کہ یونان کے اکثر مسلمان خود کو سید اجل کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ سید اجل کے خاندان میں استاد نور الحق ایک ممتاز مصنف گزرے ہیں۔ انہوں نے ۱۲۸۶ء میں حج کیا پھر واپس آ کر یونان کے ایک مدرسہ میں صدر مدرس ہو گئے۔ چینی، عربی اور فارسی میں انہوں نے کئی کتابیں لکھیں۔

اس دَور کے ایک اور ممتاز مسلمان احمد بناکتی ہیں جنہوں نے سید اجل کے بعد ۱۲۷۶ء سے ۱۲۹۲ء تک وزیر مالیات کے فرائض انجام دیئے۔

سید اجل اور احمد بناکتی کے بعد اس دَور کا تیسرا ممتاز مسلمان عہدے دار، سپہ سالار علی یحییٰ الیغوری تھا۔ قوبلا خاں نے اس کو سیانگ یانگ فو اور فان چینگ کے شہروں کو فتح کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اس نے ان شہروں کو پانچ سال کے محاصرے کے بعد ۱۲۷۳ء میں اس وقت فتح کیا جب عراق سے آنے والے دو مسلمان توپ سازوں، اسماعیل اور علاء الدین نے توپیں بنا کر دیں چینی مورخوں کے مطابق چین میں یہ توپ کا پہلا استعمال تھا۔

قوبلا خاں کے دَور کا ایک اور ممتاز مسلمان، امیر آنندہ تھا۔ اس نے صوبہ قانصو (کانسو) میں اسلام پھیلانے کی کوشش کی۔ قرآن کا حافظ تھا عربی جانتا تھا اور علماء کا سرپرست تھا۔

قوبلا خان کے زمانے میں نئے دارالسلطنت خان بالغ میں جہاں بادشاہ ۱۲۶۴ء میں منتقل ہو گیا تھا سولہ مسجدیں تھیں اور مسلمانوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ یہ مسجدیں ناکافی ہو گئی تھیں حالانکہ ان میں ایک لاکھ آدمیوں کے نماز پڑھنے کی گنجائش تھی۔(۱) ان میں چھ مسجدوں کے اخراجات امیر آئندہ پورے کرتا تھا۔

منگول دَور کا پانچواں ممتاز مسلمان امیر، محمود یلادش تھا جو ۱۲۳۸ء سے ۱۲۵۴ء تک پیکنگ کا گورنر رہا۔

اس دور کا چھٹا مسلمان حاکم پوشوکینگ تھا۔ یہ نسلاً عرب تھا۔ پو کا لفظ عربی ابو کی چینی شکل ہے۔ اس کو ۱۲۴۵ء کے قریب چوان چو (chuanchow) میں کمشنر چنگی مقرر کیا گیا تھا اور وہ تیس سال تک اس عہدے پر رہا۔ ۱۲۶۰ء میں جب منگولوں نے پورا چین فتح کر لیا تو پوشو کو شاہی بحریہ کی گودی کا نگران مقرر کیا گیا۔ اس نے شاہی بحریہ کو منظم کیا اور ۱۲۸۰ء میں جاپان کے خلاف ایک بحری مہم کی قیادت کی۔(۲)

قوبلا خاں کے دَور میں عربی طب اور علم ہیئت کی بھی سرپرستی کی گئی۔ شاہی کتب خانہ میں عربی کتب منگوائی گئیں، خان بالغ میں ایک رصدگاہ قائم کی گئی، جو ایک مسلمان جمال الدین نے قائم کی تھی۔ کئی صدیوں تک اس رصدگاہ کا انتظام کسی نہ کسی مسلمان کے سپرد رہا۔ ۱۳۳۸ء میں اسلامی تقویم بھی اختیار کر لی گئی جو تین سو سال تک چین میں جاری رہی۔(۳)

مینگ خاندان کا دَور

منگولوں کے بعد چین میں مینگ خاندان اقتدار میں آیا۔ یہ چینی خاندان تھا جس نے ۱۳۶۸ء سے ۱۶۴۴ء تک حکومت کی۔ مسلمانوں نے منگول حکومت کا تختہ پلٹنے میں چونکہ چینیوں کی مدد کی تھی اس لیے جب مینگ خاندان کا اقتدار قائم ہوا تو اس نے مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور مسلمانوں کو اس دور میں عہد منگول سے بھی زیادہ عروج حاصل ہوا۔ اسلامی ملکوں

(۱) بدرالدین چینی: چینی مسلمان اور چین و عرب کے تعلقات۔

(۲) ڈیوڈ لو: مسلمز ان چائنا ٹوڈے صفحہ ۵۔۶ ہانگ کانگ ۱۹۶۴ء

(۳) ایضاً۔ صفحہ ۵۔

سے تعلقات کو فروغ دیا گیا اور عربوں اور اسلام سے متعلق کتابیں لکھی گئیں۔ اس زمانہ میں اسلام اور مسلمانوں کا اثر چین کے ہر شعبہ زندگی پر پڑا۔ خاص طور پر سیاست اور صنعت وحرفت پر یہ اثرات زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

مینگ دور کے ممتاز مسلمانوں میں حاجی جہاں (۱۳۷۱ء تا ۱۴۳۵ء) کا نام سب سے ممتاز ہے چینی زبان میں اس کو چینگ ہو (Cheng Ho) اور جنوب مشرقی ایشیا میں چین سان تائی پو (Chen san tai po) کہا جاتا ہے۔ حاجی جہاں غالباً چین کی تاریخ کا سب سے بڑا امیر البحر ہوا ہے۔ اس نے ۱۴۰۵ء اور ۱۴۳۳ء کے درمیان کم از کم سات مہموں کی بحر ہند میں قیادت کی جن کے دوران وہ جاوا اور ساترا سے خلیج فارس، صومالیہ اور حجاز تک گیا۔ یہ مہمیں چین کی بالادستی قائم کرنے کے لیے یا مختلف اسلامی ملکوں سے خیر سگالی کے جذبہ کے تحت بھیجی گئی تھیں۔[1]

مانچو دورِ حکومت

مینگ خاندان کے بعد منچوریا کا مانچو خاندان (۱۶۴۴ء تا ۱۹۱۱ء) برسراقتدار آیا۔ یہ دور مسلمانوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ مسلمان چونکہ مینگ خاندان کے وفادار سمجھے جاتے تھے اس لیے مانچو حکمرانوں نے ان کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔ ان کو سرکاری ملازمتوں سے الگ کر دیا۔ اسی دور میں ۱۸۷۸ء میں چین نے مشرقی ترکستان پر قبضہ کیا اور اس کو چینی ترکستان کا نام دیا پھر اس کا نام سنکیانگ کر دیا۔ مانچو مظالم کی وجہ سے صوبہ کانسو اور مشرقی ترکستان میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی مسلمانوں نے بار بار بغاوت کی۔

مسلمانوں نے ان مظالم کے باوجود چین میں اپنا قومی وجود قائم رکھا۔ جب وہ سیاست سے بے دخل ہوئے تو وہ تجارت، زراعت اور علم و ادب کی طرف مائل ہو گئے۔ چنانچہ چینی مسلمانوں نے سب سے زیادہ کتابیں اسی دور میں لکھیں۔ اس دور کے مسلمان مصنفوں میں لیوتش (Liu Chih) جن کو لیوتشی بھی لکھا جاتا ہے سب سے بڑے مصنف تھے۔ انہوں نے اسلامی موضوعات پر جن میں سیرت محمدی بھی شامل ہے ایک سو کتابیں لکھیں۔[2] بدرالدین چینی

---

(۱) ڈیوڈلو: مسلمز ان چائنا صفحہ ۸ نیز لینگر کی تاریخ عالم کی انسائیکلوپیڈیا۔ (انگریزی)

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں مقالہ "الصین" پر بدرالدین چینی کی کتاب "چین وعرب کے تعلقات"

نے لکھا ہے کہ اگر حکومت مسلمانوں کی ادبی سرگرمیوں کو نہیں دباتی تو بہت امکان تھا کہ ان کی ادبی تحریکیں غیر مسلم معاشرہ پر اثر انداز ہوتیں۔

اس دَور میں تجارت اور زراعت پر توجہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں میں خوشحالی عام ہوگئی۔

جمہوری دَور

۱۹۱۱ء میں چین میں جمہوری انقلاب آیا اور مانچو خاندان کا اقتدار ختم ہوا، مسلمانوں کو بھی مانچو دَور کے مظالم سے نجات ملی۔ چین نسلی لحاظ سے پانچ گروہوں کا ملک ہے یعنی ھان (چینی)، مانچو (منچوریا کے باشندے) منگول، تبتی اور ہوئی (خوئی) یعنی چینی بولنے والے، وہ مسلمان جو عرب، ترک اور ایرانی نسل سے ہیں، نئے جمہوری آئین کے تحت ان سب کو چینی قوم کا ایک حصہ سمجھ کر مساوی درجہ دیا گیا اور ان پانچوں گروہوں کی نمائندگی کرنے کے لیے قومی جھنڈے میں پانچ رنگ دیئے گئے۔ مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی دی گئی۔ اور جمہوریہ چین کی کانگریس میں آبادی کے تناسب سے نشستیں دی گئیں۔

اس دَور میں چینی مسلمانوں نے متعدد مذہبی اور سماجی تنظیمیں قائم کیں جن میں انجمن اتحاد سب سے اہم تھی۔ یہ مختلف اسلامی انجمنوں کی یونین تھی اور اس کا مقصد مسلمانوں پر سے ان پابندیوں کو اٹھانا تھا جو مانچو دَور میں ان پر عائد کی گئی تھیں۔ مسلمانوں کو اپنے نجی مدرسے قائم کرانے کی بھی آزادی تھی۔ چنانچہ مسلمانوں نے جدید طرز کے کئی ایسے مدرسے قائم کر لیے جنہوں نے مسجدوں میں قائم دینی مدرسوں کی جگہ لے لی۔ ان مدرسوں میں چینی اور عربی دونوں زبانیں پڑھائی جاتی تھیں، عربی کے نصاب میں مصر کی مشہور درسی کتاب ''القراۃ الرشیدیہ'' شامل تھی۔

جمہوری دَور میں چینی مسلمانوں میں صحافت کا بھی آغاز ہوا اور ان کے متعدد اخبار اور رسالے نکلنے لگے۔ ۱۹۳۲ء میں جو رسالے شائع ہو رہے تھے ان میں مجلہ اسلامیہ (یونان) تصارۃ الہلال (پیکنگ) نور الاسلام (تیان تسن)، المجلہ الاسلامیہ اور المومن (کینٹن) قابل ذکر ہیں۔

جمہوری دَور میں چین میں مسجدوں کی تعداد دس ہزار سے ۴۲ ہزار تک بیان کی جاتی ہے۔[1] چینی مسلم ایسوسی ایشن کے مطابق پیکنگ میں ۴۲، شنگھائی میں چودہ، ہانکاؤ میں گیارہ اور اُرمچی (مشرقی ترکستان) میں چھ مسجدیں تھیں۔

اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کے مطابق قرآن کا پہلا چینی ترجمہ ۱۹۲۷ء میں ہوا تھا جسے ایک غیر مسلم لی تی چنگ نے جاپانی ترجمہ قرآن سے چینی میں منتقل کیا تھا۔ اس کے بعد ایک ممتاز چینی عالم وانگ چنگ زائی نے ایک دارالترجمہ قائم کر کے قرآن کا ترجمہ کرانا شروع کیا جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں چینی زبان میں قرآن کا ایک اور چینی ترجمہ مع تفسیر مکمل ہوا۔ جمہوری دَور میں اسلام پر بھی متعدد کتابیں شائع ہوئیں اور عہد مانچو کے مشہور عالم لیوتشی کی تصنیف حیات محمدی اور دیگر کتابیں شائع کی گئیں۔

اس دَور کے مشہور مسلمانوں میں جنرل مافوہیانگ (Ma Fu-Hsiang) اور جنرل عمر پائی چنگ سی (Pai chung-Hsi) کے نام بہت ممتاز ہیں۔ جنرل مافو ایک باعمل مسلمان تھے۔ شنگھائی اور پیکنگ کے مسلمانوں کے مدرسوں کی وہ فراخ دلی سے مالی امداد کرتے تھے اور انہوں نے اپنی جائداد کا تقریباً نصف حصہ غریبوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ جنرل عمر پائی چنگ سی "چینی اسلامی امدادی وفاق" کے صدر تھے۔ ۱۹۳۷ء میں جب جاپان نے چین پر حملہ کیا تھا تو یہ تنظیم حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ یہ تنظیم جہاں مسلمانوں کو اپنے وطن کے دفاع کے لیے تیار کرتی تھی وہاں جاپانی مقبوضہ علاقوں سے بیدخل ہونے والے مسلمانوں کی آبادکاری کے کام میں بھی مدد کرتی تھی۔ اس تنظیم کا صدر مقام چنگ کنگ میں تھا۔ اس زمانہ میں مسلمان فوجوں نے شمال مغربی چین میں غیر معمولی بہادری کا ثبوت دیا۔ یہ فوج اپنے پانچ مسلمان سپہ سالاروں کے نام پر جن میں سے ہر ایک کے نام کا پہلا لفظ ما تھا، ماؤں کی فوج کہلاتی تھی۔

اشتراکی دَور

۱۹۴۹ء میں چین کا جمہوری دَور ختم ہو گیا۔ چین کے صدر چیانگ کائی شیک کمیونسٹوں سے

(۱) دس ہزار کی تعداد بدرالدین چینی نے اپنی کتاب "چین و عرب کے تعلقات" میں بیان کی ہے۔ چینی مسلم ایسوسی ایشن نے یہ تعداد بیس ہزار بتائی ہے اور ۱۹۴۴ء میں حکومت چین کے سرکاری اعلان میں مسلمانوں کی تعداد چار کروڑ ۸۱ لاکھ اور مسجدوں کی تعداد ۴۲ ہزار ۳ سو ۷ بتائی گئی تھی۔

شکست کھا کر چین چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء کو عوامی جمہوریہ چین کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ ۲۰۔ ستمبر ۱۹۵۴ء کو نیا آئین نافذ کیا گیا جس میں چین میں آباد تمام قوموں کے وجود اور ان کے مساوی حقوق کو تسلیم کیا گیا۔ مشرقی ترکستان، ترک باشندوں کا اصل وطن اور ابتدائی اسلامی تہذیب کا گہوارہ تھا، یہاں کے باشندوں نے اشتراکی انقلاب کے وقت اپنی آزاد حکومت قائم کر لی تھی، لیکن اشتراکی چین نے آزادی تسلیم نہیں کی اور اس پر قبضہ کر لیا۔[1] یکم اکتوبر ۱۹۵۵ء کو اس ملک کو اندرونی خود مختاری دی گئی اور اس کا نام ''اویغور خود مختار علاقہ'' رکھا گیا، ۲۵۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو صوبہ کانسو سے ننگشیا کو الگ کر کے جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی دوسرا ''خود مختار علاقہ'' قرار دیا گیا۔ بظاہر یہ ایک بڑی پیش رفت ہے جو پچھلے دَور کے مقابلے میں ہوئی، لیکن چین کے آئین کے تحت چونکہ مقامی یا علاقائی قوانین اور اصلاحات کو بالائی ادارے منسوخ کر سکتے ہیں اور یہ کہ ان علاقوں میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی، جو کمیونسٹ نظریات سے متصادم ہو، اس لیے یہ آزادی بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ چنانچہ ان علاقوں کے مسلمانوں نے اپنی بے بسی پر بارہا احتجاج کیا لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور احتجاج کرنے والے حکام کو برطرف کر دیا گیا۔ اسی طرح ۱۹۶۶ء میں ننگشیا کے دو مسلمان رہنما تطہیر کی مہم کا شکار ہو گئے کیونکہ ان پر قوم پرستانہ رجحانات کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس معاملہ میں چین کی وہی پالیسی ہے جو وسط ایشیا کے مسلمانوں کے بارے میں روسی اشتراکیوں کی پالیسی ہے۔

اس سے بھی بڑا نقصان جو ان علاقوں اور چین کے تمام مسلمانوں کو اشتراکی دَور میں ہوا وہ مذہبی آزادی کا خاتمہ ہے۔ وہ تمام مدرسے جو جمہوری دور میں مسلمانوں نے قائم کیے تھے بند کر دیے گئے اور وہ تمام تنظیمیں ختم کر دی گئیں جو مسلمانوں نے اپنے معاشرے کی اصلاح کے لیے قائم کی تھیں۔ اسی طرح ان کے اخبار اور رسالے بھی بند کر دیے گئے۔ سرکاری مدرسوں میں الحاد کی تعلیم دی جانے لگی۔ ۱۹۵۳ء میں چینی اسلامی ایسوسی ایشن قائم کی گئی تاکہ مسلمانوں کو دینی تعلیم کی سہولتیں فراہم کی جائیں لیکن اس انجمن کے تحت تنگ زی پیلو مسجد، پیکنگ کے دینی مدرسہ میں

(۱) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ حصہ دوم باب ۳۲ اور موجودہ جلد کا باب ''اشتراکی دنیا''

اسلامی تعلیم کی جگہ ماوزی تنگ کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔[1] ثقافتی انقلاب کی مہم (۱۹۶۴ء تا ۱۹۷۰ء) کے دوران خاص طور پر مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا۔ قرآن کے نسخے اور دینی مطبوعات ضائع کر دی گئیں۔ حج پر پابندی لگا دی گئی۔ ۱۹۶۶ء میں دوسری عبادت گاہوں کے ساتھ مسجدیں بھی بند کر دی گئیں۔ شنگھائی کا اسلامی چھاپہ خانہ بند کر دیا گیا۔ اسلامی ایسوسی ایشن کے رہنماؤں پر دائیں بازو سے تعلق کا الزام لگایا گیا۔ اور اس کی سرگرمیاں بند کر دی گئیں، مسلمانوں کے مذبحے بند کر دیے گئے۔ مسلمان مزدور اور فوجی جو کمیونوں میں اجتماعی شکل میں کھانا کھاتے تھے ان کو حرام کھانا کھانے پر مجبور کیا گیا۔ ۱۹۶۸ء میں پیکنگ میں دونگسی کی مسجد اس لیے کھول دی گئی کہ اسلامی ملکوں کے سفارت خانوں کا عملہ اس میں نماز پڑھ سکے۔

۱۹۷۶ء میں ماوزی تنگ کے انتقال کے بعد چین میں جو مفید تبدیلیاں ہوئیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ دینی آزادی کو بحال کر دیا گیا۔ ۱۹۸۱ء میں رابطہ عالم اسلامی کا ایک وفد چینی مسلم ایسوسی ایشن کی دعوت پر، جس کی سرگرمیاں اب بحال کر دی گئی ہیں چین گیا تھا۔ اس وفد کو نائب وزیر اعظم ینگ جی (Yung Ji) نے جو مسلمان ہیں یک ملاقات میں بتایا کہ ثقافتی انقلاب نے چینی ثقافت کی تمام خصوصیات تباہ کر دیں، لیکن اب مذہبی اقلیتوں کو مکمل مذہبی آزادی ہے۔ اس آزادی کے باوجود وفد کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ پیکنگ میں صرف دو قابل ذکر مسجدیں رہ گئی ہیں حالانکہ ۱۹۴۵ء میں ان کی تعداد ۷۴ تھی۔

مشرقی ترکستان (سنکیانگ)، کانسو اور ننگشیا، چین کے وہ علاقے تھے جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن ثقافتی انقلاب کے دوران یہاں اس کثرت سے چینی آباد کیے گئے کہ سوائے مشرقی ترکستان کے سب علاقوں میں چینیوں کی اکثریت ہوگئی اور ترکستان میں بھی ایک کروڑ بیس لاکھ کی آبادی میں پچاس لاکھ چینی ہیں۔ رابطہ عالم اسلامی کا وفد مشرقی ترکستان بھی گیا تھا۔ اس نے اپنی رپورٹ میں یہ تاثر ظاہر کیا ہے کہ چین کے مقابلے میں ترکستان میں اسلام کے لیے فضا زیادہ سازگار ہے۔ یہاں کے صدر مقام ارمچی کی ۲½ لاکھ آبادی میں مسلمان صرف ۲۴ فیصد ہیں اور مسجدوں کی تعداد ۷۴ ہے۔ ترکستان کے دورے کے موقع پر وفد کو بتایا گیا کہ یہاں قرآن کا

(۱) ڈیوڈلو: مسلمز ان چائنا ٹوڈے۔ صفحہ ۳۶۔

ترکی ترجمہ بھی شائع کیا گیا ہے اور اب صحیح بخاری کا ترکی ترجمہ شائع کیا جارہا ہے۔[1]

چین میں قرآن کی اشاعت بھی بہت محدود ہے۔ جب سے اشتراکی انقلاب آیا ہے اس وقت سے اب تک صرف ایک مرتبہ اپریل ۱۹۵۵ء میں قرآن شائع کیا گیا۔ موتمر عالم اسلامی کراچی کے ہفت روزہ مسلم ورلڈ کی ایک اطلاع کے مطابق اب مصر کے فارغ التحصیل پروفیسر ماجیان (Majian) کا چینی ترجمۂ قرآن شائع کیا جارہا ہے۔ جو اشتراکی دور کا پہلا ترجمہ ہوگا۔

بہرحال مذہب کے بارے میں چین کی پالیسی میں یہ نئی تبدیلی خوش آئند ہے۔ پرانی مسجدیں کھلنے لگی ہیں اور نئی مسجدیں قائم ہورہی ہیں۔ حج پر سے بھی محدود پیمانہ پر پابندی اٹھالی گئی ہے۔ ۱۹۷۹ء میں پندرہ سال بعد سولہ چینی مسلمانوں نے پہلی مرتبہ حج کیا۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے طلبہ کو اسلامی ملکوں میں بھیجا جارہا ہے۔ اور اب چینی مسلمانوں کے وفود بھی اسلامی دنیا کا دورہ کرنے لگے ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ابھی تک صورت حال اطمینان بخش نہیں کہی جاسکتی۔ پوری صورت حال واضح ہونے میں وقت لگے گا۔

مسلمانوں کی تعداد

چین میں مسلمانوں کی تعداد ایک ایسا متنازعہ مسئلہ ہے جس کے بارے میں تحقیقی طور پر کوئی قطعی فیصلہ کرنا ممکن نہیں کیونکہ چین میں مردم شماری کے خانے میں مذہب کا خانہ کبھی نہیں رہا۔ روس میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً تمام کی تمام غیر روسی اور ترک ہے، اس لیے ہم مختلف قومیتوں کی تعداد کی بنیاد پر مسلمانوں کی کل تعداد کا بڑی حد تک صحیح اندازہ کرسکتے ہیں۔ لیکن چین میں یہ بھی ممکن نہیں۔ ترکی النسل آبادی صرف مشرقی ترکستان تک محدود ہے جب کہ مسلمان پورے چین میں پھیلے ہوئے ہیں۔ محققین نے مسلمانوں کی آبادی کے متعلق تخمینے لگائے ہیں جن کی بنیاد پر

---

(۱) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ) نومبر ۱۹۸۱ء۔ جرنل کی اسی رپورٹ میں فرانس کے مشہور اخبار لی موند (LEMONDE) کے نمائندے کے دورۂ مشرقی ترکستان کی ایک رپورٹ بھی شائع ہوئی ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ "یہاں آنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ آدمی ایک مفتوحہ علاقہ میں آگیا ہے اور ارمچی میں حکام سے باتیں کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ علاقہ کا انتظام مقامی باشندوں کے ہاتھ میں نہیں۔

۱۹۸۲ء میں مسلمانوں کی آبادی چھ کروڑ سے بارہ کروڑ تک ہونا چاہیے۔ لیکن یہ سب قیاس آرائیاں ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں چینی مسلم ایسوسی ایشن نے مسلمانوں کی آبادی پانچ کروڑ بتائی تھی۔ تیس سال میں آبادی چونکہ دوگنی ہوجاتی ہے اس لیے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس تخمینہ کی بنیاد پر اب دس کروڑ سے زیادہ مسلمان ہوں گے۔[۱] لیکن یہ سب قیاس آرائیاں ہیں اور ان اعداد کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں۔

اشتراکی دور میں جو اعداد وشمار جاری کیے گئے ہیں ان میں مسلمانوں کی تعداد ۱۹۸۰ء میں صرف ایک کروڑ ۳۱ لاکھ بتائی گئی ہے۔ مسلمانوں کی آبادی میں اتنی حیرت انگیز کمی تمام محققین کے لیے تعجب کا باعث ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یا تو اشتراکی انقلاب کے دوران مسلمانوں کی اکثریت قتل کردی گئی یا وہ ڈر کی وجہ سے مسلمان ہونا ظاہر نہیں کرتی۔ اشتراکی چین کے تخمینہ کی بنیاد مختلف قومیتوں کی آبادی پر ہے۔ چین میں نسلی لحاظ سے ۵۵ اقلیتی قومیں ہیں۔ ان میں سے دس وہ قومیں ہیں جو مسلمان سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں ۶۴ لاکھ ۹۰ ہزار ہوئی ہیں ہوئی ان مسلمانوں کو کہتے ہیں جو نسلاً چینی نہیں ہیں لیکن چینی زبان بولتے ہیں۔ ۵۴ لاکھ ۸۰ ہزار او یغور ترک ہیں جو تقریباً سب مشرقی یعنی چینی ترکستان میں آباد ہیں، آٹھ لاکھ قازق ہیں، ان کی اکثریت بھی ترکستان میں آباد ہے۔ ایک لاکھ نوے ہزار دونگن ہیں اور ایک لاکھ ۹۲ ہزار باقی چھ نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں یعنی کرغیز، سالار، تاجیک، ازبک، باوآں (Baoan) اور تاتار۔[۲]

چین کے مسلمانوں سے متعلق جو مصنف آجکل تحقیق کر رہے ہیں ان میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد سے متعلق اب تک جو اعداد وشمار پیش کیے جاتے رہے ہیں وہ مبالغہ آمیز ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک کروڑ ۳۱ لاکھ کا تخمینہ بھی صحیح نہیں، کیونکہ اول تو اس کی بنیاد صحیح نہیں ہے دوم صوبوں کے حکام کی طرف سے مختلف صوبوں میں مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں جو

---

(۱) مختلف تخمینوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۲ میں مقالہ ''الصین'' نیز جدہ یونیورسٹی کی مسلمان اقلیتوں کے انسٹی ٹیوٹ کا مجلہ ''جرنل'' جلد ۲ شمارہ نمبر ۱ اور جلد ۳ شمارہ نمبر ۲ (۱۹۸۱ء)

(۲) اس موضوع پر ملاحظہ کیجئے باربرا پلسبری (Pillshbury) اور حاجی یوسف چانگ کے مضامین جو جدہ یونیورسٹی کے مسلم اقلیتوں کے امور کے مجلہ ''جرنل'' جلد سوم شمارہ نمبر ۱، ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئے ہیں۔

اعلانات ہوتے رہتے ہیں وہ پیکنگ کی تعداد سے مختلف ہوتے ہیں بلکہ ان میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ بتائی جاتی ہے۔ ۱۹۵۳ء کی مردم شاری میں مسلمان قوموں کی تعداد ۸۷ لاکھ بتائی گئی تھی۔ گزشتہ تیس سال میں چین کی آبادی دوگنا ہوگئی ہے۔ مسلمانوں میں شرح پیدائش عام چینیوں سے زیادہ ہے اس لیے ان کی تعداد خود سرکاری تخمینہ کے مطابق ایک کروڑ ساٹھ لاکھ سے زیادہ ہو جانا چاہیے۔ ان حقائق کے پیش نظر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ چین میں مسلمانوں کی صحیح تعداد تین اور چار کروڑ کے درمیان ہوگی۔ [1]

حاجی یوسف چانگ کی تصریح کے مطابق مسلمانوں کی اسی فیصد تعداد سنکیانگ اور ننگشیا کے خودمختار علاقوں اور چنگھائی، کانسو، شینسی اور یونان کے صوبوں میں رہتی ہے۔ باقی آبادی بڑے بڑے شہروں اور چند خودمختار اضلاع میں رہتی ہے۔ اسی طرح ان کی اسی فیصد آبادی زراعت پیشہ ہے۔ [2]

مسلمانوں کی اکثریت صرف صوبہ سنکیانگ (مشرقی ترکستان) میں ہے۔ اشتراکی انقلاب سے پہلے یہاں چینیوں کا تناسب صرف چھ سات فیصد تھا لیکن اب ۳۶ فیصد ہوگیا ہے۔ کانسو اور ننگشیا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان میں بھی پہلے مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن اب مسلمان اقلیت میں ہوگئے ہیں۔ جنوب مغرب میں صوبہ یونان میں مسلمانوں کا تناسب ۲۵ سے ۳۳ فیصد تک بتایا جاتا ہے۔ شہر پیکنگ یا بیجنگ میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ ساٹھ ہزار، شنگھائی میں ۳۵ ہزار اور کینٹن میں ۴۳ ہزار ہے۔ [3] رابطۂ عالم اسلامی کے وفد نے شنگھائی میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ بیان کی ہے۔ شنگھائی میں دس اور کینٹن میں دو مسجدیں ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں شنگھائی میں چودہ اور ہانکاؤ میں گیارہ مسجدیں تھیں۔ [4] ایک تازہ اطلاع کے مطابق سنکیانگ میں مسجدوں کی

---

(۱) ایضاً۔

(۲) جرنل (جدہ) جلد ۳ شمارہ نمبر ۲۔

(۳) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ) نومبر ۱۹۷۱ء، بار برا پلسبری نے جرنل (جدہ) جلد ۳ شمارہ نمبر ۲ میں شنگھائی میں مسلمانوں کی تعداد ۳۵ ہزار دی ہے۔

(۴) مسلمان اقلیتیں (انگریزی) موتمر عالم اسلامی کراچی ۱۹۷۶ء۔

تعداد بارہ ہزار[1] اور ننگشیا میں ایک ہزار دو سو ہے۔

تائیوان

جزیرہ تائیوان جسے پہلے فارموسا کہا جاتا تھا ابھی تک چین کے تسلط سے آزاد ہے۔ چیانگ کائی شیک کی قومی جمہوری حکومت کو جب چین میں کمیونسٹوں کے مقابلے میں شکست ہوگئی تو یہ حکومت ۱۹۴۹ء میں تائیوان میں منتقل ہوگئی، اور امریکہ کی مدد کی وجہ سے ابھی تک قائم ہے۔ یہاں کی آبادی میں تقریباً بیس لاکھ چینی ایسے ہیں جو چین سے فرار ہوکر پناہ لینے کے لیے اس جزیرے میں آ گئے تھے۔

تائیوان کے باشندے بھی چین کی طرح کنفیوشس اور بدھ مت کے پیرو ہیں۔ تقریباً ۲½ فیصد آبادی عیسائی ہے۔ مسلمانوں کی تعداد صرف چالیس ہزار ہے۔ ان میں بیس ہزار وہ مسلمان ہیں جو ۱۹۴۹ء میں جزیرے میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔

تائیوان میں کل پانچ مسجدیں ہیں۔ دارالحکومت تائیپیہ میں ایک بڑی جامع مسجد ہے۔ چینی مسلم ایسوسی ایشن، مسلمانوں کی واحد تنظیم ہے۔ یہ وہی جماعت ہے جو ۱۹۳۷ء میں چین میں قائم ہوئی تھی اور چین پر کمیونسٹ اقتدار قائم ہونے کے بعد تائیوان منتقل ہوگئی۔ انجمن کی طرف سے مسلم ان چائنا کے نام سے ایک دو ماہی پرچہ بھی عربی اور چینی میں شائع ہوتا ہے۔ انجمن اشتراکی چین کے برعکس ہر قسم کے سیاسی دباؤ سے آزاد ہے۔ اس کے علاوہ دو اور تنظیمیں بھی ہیں۔ ایک اسلامی کلچرل اور تعلیمی فاونڈیشن جو ۱۹۷۶ء میں قائم کی گئی تھی اور دوسری چینی نوجوانوں کی مسلم ایسوسی ایشن۔ یہ دونوں تنظیمیں، چینی مسلم ایسوسی ایشن میں شامل ہیں۔

تائیوان کے مسلمانوں میں حاجی خالد شیہ (Shih) کا کیا ہوا قرآن کا چینی ترجمہ مستعمل ہے۔ اس ترجمہ پر چھ بار نظر ثانی ہوچکی ہے۔ وہ یا تو سرکاری ملازمت کرتے ہیں یا تجارت کرتے ہیں۔ لیکن ابھی تک انہوں نے دینی تعلیم کا کوئی اچھا انتظام نہیں کیا ہے اور مسلمان بچے سرکاری یا مسیحی تبلیغی اداروں کے مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہیں۔

---

(۱) جسارت کراچی۔ ۱۴۔ اپریل ۱۹۸۳ء

اسلامی کلچرل اور تعلیمی فاونڈیشن نے تائپیہ میں شاہ فیصل موریل لائبریری کے نام سے ایک اچھا کتب خانہ قائم کیا ہے جس میں چینی، عربی، انگریزی، فرانسیسی، ترکی اور فارسی کی کئی ہزار کتابیں ہیں۔[1]

(۱) تائیوان کے مسلمانوں سے متعلق بیشتر معلومات نیشنل تائیوان یونیورسٹی، تائپیہ کے موسیٰ لیہ سین ٹنگ (Leh-sen Ting) اور چینی اسلامی کلچرل اور تعلیمی فاونڈیشن کے حاجی حکمت کے مضامین پر مشتمل ہے جو جدہ یونیورسٹی کے مسلمان اقلیتوں کے انسٹی ٹیوٹ کے مجلہ ''جرنل'' جلد ۳ اور شمارہ نمبر ۲ (۱۹۸۱ء) میں شائع ہوئے ہیں۔

ہانگ کانگ

ہانگ کانگ ایک برطانوی نوآبادی ہے جو دریائے کینٹن کے دہانے پر شہر کینٹن سے نوے میل جنوب میں واقع ہے۔ یہ چند جزیروں اور برّاعظم کے ایک حصہ پر جو جزیرہ نما کولون کہلاتا ہے مشتمل ہے۔ ہانگ کانگ فی الحقیقت چین ہی کا ایک حصہ ہے جس پر برطانیہ نے ۱۸۴۱ء میں قبضہ کیا تھا۔ یہ قبضہ ابھی تک برقرار ہے۔ ہانگ کانگ بین الاقوامی شہرت کی بندرگاہ اور مشرق بعید میں برطانیہ کا اہم بحری اڈہ ہے۔

ہانگ کانگ کولونی کا کل رقبہ ۳۹۸ مربع میل ہے۔ جزیرہ ہانگ کانگ کا رقبہ ۲۹ مربع میل ہے اور علاقہ کا صدر مقام وکٹوریہ اسی حصہ میں ہے۔ باقی حصہ کولون اور نئے علاقوں پر مشتمل ہے جسے برطانیہ نے ۱۸۹۸ء میں چین سے ۹۹ سال کے پٹہ پر لیا تھا۔ ۱۹۸۱ء میں آبادی ۵۱ لاکھ تھی تقریباً ساری آبادی چینی ہے، بیس ہزار باشندے برطانوی نژاد ہیں اور برصغیر پاکستان و ہند کے لوگ بھی کئی ہزار ہیں۔ اکثریت بدھ مت کی پیرو ہے، کچھ عیسائی، ہندو اور سکھ بھی ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۲۵ ہزار ہے۔ جن کی اکثریت چینی ہے، باقی تعداد ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں پر مشتمل ہے۔[1]

ہانگ کانگ میں مسلمانوں کی متعدد تنظیمیں قائم ہیں جنہوں نے ۱۹۸۰ء میں ایک فیڈریشن بنالی ہے۔ یہ فیصلہ مدینہ یونیورسٹی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عبداللہ کے دورے کے بعد کیا گیا تھا۔ اسلامک یونین ہانگ کانگ کے صدر ایک برطانوی نومسلم ادریس پیک (Peake) وفاق کے پہلے صدر اور شیخ ادریس صلاح سکرٹری منتخب ہوئے۔ مدینہ یونیورسٹی نے مسلمان

(1) ماہنامہ "یونیورسل میسج" کراچی جنوری ۱۹۸۲ء، جس میں ہانگ کانگ کے ڈائرکٹوریٹ آف انفرمیشن سروس کے مسٹر ھیووٹ (Hugh witt) کا فیچر شائع ہوا تھا۔

طلبہ کو وظیفہ دینے کا فیصلہ بھی کیا۔ اس سے قبل اسلامی یونین سب سے بڑی تنظیم تھی اور اس کے ارکان کی تعداد آٹھ سو تھی۔

ہانگ کانگ میں ۱۹۸۱ء میں چار مسجدیں تھیں اور ایک زیر تعمیر تھی۔ ان میں سب سے بڑی مسجد عمار اور عثمان رمجو صادق ہے۔ جو ونچائی کے بارونق علاقہ میں واقع ہے۔ اس کے ساتھ ایک اسلامی مرکز بھی ہے۔ یہ آٹھ منزلہ عمارت ہے اور اس کی تعمیر پر ۸۵ لاکھ ہانگ کانگ ڈالر خرچ آئے۔ یہ مسجد ۱۹۸۱ء میں مکمل ہوئی ہے۔ عمار اور عثمان رمجو صادق جن کے نام پر مسجد کا نام رکھا گیا ہے دو ممتاز مسلمان رہنما تھے۔ دونوں ہانگ کانگ میں پیدا ہوئے تھے اور دونوں اسلامی یونین کے صدر رہ چکے تھے۔ عثمان صادق نے برسوں تک ہانگ کانگ کے مسلمانوں کی بہتری کے لیے کام کیا تھا اور مسجد کی تعمیر کے لیے ایک کثیر رقم وصیت میں چھوڑی تھی۔ حکومت نے بھی ۲۵ لاکھ ڈالر اس لیے دیے ہیں کہ ایک سڑک کی تعمیر کے سلسلے میں مسجد کو شہید کرنا پڑا تھا۔ اس کے علاوہ حکومت نے مسجد اور اسلامی مرکز کی تعمیر کے لیے پانچ ہزار مربع میٹر پر مشتمل ایک قطع زمین بھی دیا تھا۔ آٹھ منزلہ عمارت میں مسجد کے لیے صرف دو منزلیں مخصوص ہیں۔ باقی منزلیں کتب خانہ، کمیونٹی ہال اور دفاتر پر مشتمل ہوں گی۔

باقی تین مسجدیں شیلے اسٹریٹ، کیپ کولنسن (collinson) اور اسٹینلے کے مقام پر واقع ہیں۔ ان میں آخر الذکر مسجد جیل کے احاطے میں ہے۔ ہانگ کانگ کی پانچویں زیر تعمیر مسجد کولون (kowloon) میں واقع ہے۔ اس کا ڈیزائن بمبئی کے معمار آئی، ایم، قادری نے روایتی انداز میں تیار کیا ہے۔ یہ مسجد اُس مسجد کی جگہ بنائی جا رہی ہے جس کو ۱۸۶۶ء میں برطانوی فوج نے اپنے مسلمان سپاہیوں کے لیے تعمیر کیا تھا۔ تعمیر کے بعد یہ مسجد رمجو صادق کے بعد دوسری سب سے بڑی مسجد ہوگی۔ اس کی تعمیر کے لیے پندرہ لاکھ ڈالر اسلامی ملکوں نے دیئے ہیں۔[1]

حال ہی میں ہانگ کانگ میں عثمانی رمجو اسلامک سنٹر میں ہانگ کانگ اسلامک یوتھ ایسوسی

(۱) یونیورسل میسج، کراچی، جنوری ۱۹۸۲ء

ایشن کی افتتاحی تقریب ہوئی۔ یہ تقریب ۲۵۔دسمبر ۱۹۸۱ء کو ہوئی نور محمد سات یوتھ ایسوسی ایشن کے اعزازی صدر منتخب ہوئے ہیں۔ (۱)

---

(۱) ہفت روزہ "مسلم ورلڈ" کراچی ۳۰۔جنوری ۱۹۸۲ء۔

فلپائن

فلپائن کا رقبہ ایک لاکھ پندرہ ہزار مربع میل (۲ لاکھ ۱۹، ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی ۱۹۸۰ء ۴ کروڑ ۹۷ لاکھ ہے۔ منیلا دارالحکومت ہے، لیکن سرکاری دفاتر اور عمارتیں کوئی زن (quezon) سٹی میں واقع ہیں جو منیلا کی حدود میں ایک نواحی بستی ہے، جس کو دارالحکومت کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ بے شمار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ فلپینی، ہسپانوی اور انگریزی کو سرکاری حیثیت حاصل ہے۔

فلپائن کی اکثریت عیسائی ہے۔ یہ مذہب سولہویں صدی میں ہسپانوی باشندوں کے ذریعہ آیا۔ کچھ آبادی مشرکانہ عقائد رکھتی ہے اور پانچ فیصد باشندے مسلمان ہیں۔

فلپائن کے باشندے نسلاً ملیے اور انڈونیشی باشندوں سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ تیرہویں صدی میں شمالی ساترا میں اسلام پھیل چکا تھا۔ اس کے بعد اگلی صدی میں جاوا اور انڈونیشیا کے دوسرے جزیروں میں اسلام پھیلنا شروع ہوا۔ اسی زمانہ میں فلپائن کے جنوبی جزیروں، خصوصاً پالاوان، جولو، باسیلان، سولو اور منڈاناؤ میں بھی اسلام کی اشاعت ہوئی۔

پرتگالی جہازراں فرڈیننڈ ماجیلان (magellan) جو ہسپانیہ کی ملازمت میں تھا پہلا یوروپی ہے جو فلپائن (۱۵۲۱ء) پہنچا اور اگلے سال مقامی باشندوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ جس زمانے میں ہسپانوی فلپائن پہنچے، یہاں ہر جزیرے میں ایک یا ایک سے زیادہ حکومتیں تھیں، جن کا سربراہ سلطان یا راجہ کہلاتا تھا۔ ہر سلطان کے تحت داتو ہوتے تھے۔ سب سے بڑے جزیرے لوزان میں راجہ سلیمان کی حکومت تھی۔ ابتدائی مہموں کی ناکامی کے بعد اسپین کے شہنشاہ فلپ دوم نے سپہ سالار میگل لوپس (Miguel Lopez) کو ۱۵۶۵ء میں فلپائن روانہ کیا۔ لوزان میں راجہ سلیمان نے اس کا ۱۵۷۰ء تک مقابلہ کیا، لیکن ہسپانوی سپہ سالار نے اس کو سازش کر کے مروا

دیا۔ میگل پولپس کے مطابق اس زمانے میں خلیج منیلا کے کنارے اسی ہزار مسلمان آباد تھے۔ لوپس نے ۱۵۷۱ء میں شہر منیلا کی بنیاد ڈالی اور اس کو ہسپانوی مقبوضات کا صدر مقام قرار دیا۔ اسی نے ملک کا نام اسپین کے شاہ فلپ کے نام پر فلپائن رکھا۔

۱۶۰۰ء تک جنوبی جزائر منڈاناؤ، سولو اور پالاوان کو چھوڑ کر باقی جزیروں پر اسپین کا قبضہ ہوگیا۔ جنوب کے مسلمان اس کے بعد بھی ۱۸۳۷ء تک منیلا تک بحری چھاپے مارتے رہے۔ ۱۸۵۰ء میں جولو (سولو) پر ہسپانوی قبضہ کے بعد مسلمانوں کا زور ٹوٹ گیا۔ لیکن جنوب کے جزیروں پر اسپین کبھی بھی پوری طرح قابض نہیں ہوسکا۔

ہسپانوی ۱۵۲۱ء سے ۱۸۹۸ء تک تقریباً پونے چار سو سال فلپائن پر قابض رہے۔ اس مدت میں انہوں نے مقامی باشندوں کی اکثریت کو جو مشرکانہ عقائد رکھتی تھی جبراً اسی طرح عیسائی بنایا جس طرح اندلس کے مسلمانوں کو بنایا تھا۔ اسپین کے مسلمانوں کو چونکہ مور کہا جاتا تھا اس لیے ہسپانویوں نے فلپائن کے مسلمانوں کو بھی مورو کہنا شروع کردیا۔ ۱۵۔ فروری ۱۸۹۸ء میں امریکہ اور اسپین میں لڑائی چھڑ گئی جس کے نتیجے میں اسپین ۱۰۔ دسمبر ۱۸۹۸ء کو فلپائن، جزیرہ گوام اور پورٹو ریکو سے امریکہ کے حق میں دست بردار ہوگیا۔ امریکہ نے ان علاقوں کا دو کروڑ معاوضہ ادا کیا۔

منڈاناؤ اور سولو پر چونکہ اسپین کا مؤثر کنٹرول نہیں تھا اس لیے امریکہ نے ان جزیروں میں فوجی حکومت قائم کی۔ ۱۸۹۹ء میں سولو کے سلطان نے امریکہ کی بالادستی قبول کرلی۔ اس کے بعد امریکہ نے فوجی کاروائی کے ذریعہ جنوب کے باقی جزیروں پر بھی جہاں مسلمان حکمران تھے۔ ۱۹۰۳ء تک اپنا تسلط قائم کرلیا۔ ۱۹۴۰ء میں امریکہ نے سولو کے سلطان کی حکومت ختم کرکے اس کو فلپائن میں ضم کرلیا۔

مئی ۱۹۴۲ء سے ستمبر ۱۹۴۵ء تک جاپانی فلپائن پر قابض رہے۔ اس کے بعد جب امریکہ کا فلپائن پر دوبارہ قبضہ ہوا تو انہوں نے ۴۔ جولائی ۱۹۴۶ء کو فلپائن کی آزادی تسلیم کرلی۔

مسلمانوں کی تعداد

فلپائن کی ۸۵ فیصد آبادی عیسائی ہے، لیکن جنوب کے کئی جزیروں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ فلپائن کے مسلمانوں کی بیشتر تعداد منڈاناؤ اور دوسرے جنوبی جزیروں میں

مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ مسلمانوں کی اکثریت کا یہ علاقہ اس وقت اکیس صوبوں میں تقسیم ہے، لیکن گزشتہ ۷۰ سالوں میں شمال سے عیسائی آبادی اس کثرت سے جنوب میں منتقل کی گئی کہ اب سات آٹھ صوبوں کے علاوہ سارے علاقے میں عیسائی اکثریت ہوگئی ہے۔ یہ عیسائی آبادکاری مسلمانوں کے لیے حیات وموت کا مسئلہ بن گئی ہے اور اس کی وجہ سے جنوب میں مسلمانوں اور فلپائن کی حکومت کے درمیان مستقل کشمکش جاری ہے۔

سرکاری تخمینہ کے مطابق فلپائن میں مسلمانوں کا تناسب پانچ فیصد ہے۔ ۱۹۸۰ء میں فلپائن کی آبادی ۴ کروڑ ۹۷ لاکھ تھی۔ پانچ فیصد کے تناسب سے مسلمانوں کی کل تعداد ۲۴ لاکھ ہوتی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں یہ تعداد ۱۵ لاکھ ۸۵ ہزار تھی۔ موتمر عالم اسلامی کے بیان کے مطابق ۱۹۷۷ء میں مسلمانوں کی تعداد پچاس لاکھ تھی۔ [1] لیکن اس کی صحت مشکوک ہے کیونکہ فلپائن میں باقاعدہ مردم شماری ہوتی ہے اور اس میں مذہب کا خانہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی حسب ذیل سات صوبوں میں اکثریت ہے۔

(۱) شمالی لاناؤ۔ (۲) جنوبی لاناؤ۔ (۳) باسیلان۔ (۴) جزائر سولو۔ (۵) تاوی تاوی۔
(۶) کوٹاباٹو۔ (۷) جنوبی پالاوان۔

شمالی اور جنوبی لاناؤ کا مجموعی رقبہ دو ہزار ۷ سو مربع میل اور آبادی ۱۹۷۰ء میں نو لاکھ ۲۳ ہزار تھی۔ ۶۵ فیصد آبادی مسلمان ہے، تیس فیصد عیسائی اور باقی مظاہر پرست ہیں۔ [2] قصبہ مراوی (آبادی ۳۸ ہزار) جنوبی لاناؤ کا صدر مقام ہے۔ قصبہ جھیل مراوی کے کنارے ایک بلند سطح مرتفع پر واقع ہے اور اپنے خوشگوار موسم کی وجہ سے جنوبی فلپائن کا مقبول گرمائی مرکز ہے۔ ہر طرف مسجدوں کے گنبد اور مینار نظر آتے ہیں۔ یہاں مسلمانوں کی ایک یونیورسٹی بھی ہے جس میں پانچ ہزار طلبہ ہیں۔ یہاں علماء کو بھی تربیت دی جاتی ہے۔ منڈاناؤ کی اسٹیٹ یونیورسٹی بھی اسی قصبہ میں ہے۔ یونیورسٹی کے احاطہ میں ایک مسجد ہے جس کا نام شاہ فیصل مسجد ہے۔ مراوی مسلمانوں کی دستکاری اور ہتھیار سازی کا مرکز بھی ہے۔

---

(۱) دنیا کی مسلمان اقلیتیں، (انگریزی) کراچی ۱۹۷۷ء

(۲) امریکانا انسائیکلو پیڈیا۔

جزیرہ باسیلان کا رقبہ ۵ سو تیس مربع میل ور آبادی (۱۹۶۰ء) ۵۵ ہزار ہے۔ یہ پہلے جنوبی زمبوانگا کا ایک حصہ تھا جس کا رقبہ چار ہزار دو سو مربع میل اور آبادی (۱۹۶۰ء) سات لاکھ ۴۲ ہزار تھی اور مسلمانوں کی اکثریت تھی۔

جزائر سولو جزائر سولو کا رقبہ ایک ہزار ۸۷ مربع میل اور آبادی (۱۹۶۰ء) تین لاکھ ۲۶ ہزار ہے۔شہر جولو (آبادی ۳۳ ہزار) صدر مقام ہے۔ اسپین کے خلاف یہ شہر فوجی کارروائیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا اور اب تحریک آزادی کا بڑا مرکز ہے۔

تاوی تاوی یہ پہلے جزائر سولو کا حصہ تھا اب علیحدہ صوبہ ہے۔

مذکورہ بالا صوبوں کے علاوہ منڈ ناؤ میں کوٹا باٹو کا علاقہ بھی مسلمانوں کا بڑا مرکز ہے۔ یہاں صوبہ ماگوئن ڈانو (Maguindano) میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ پالاوان جزائر فلپائن کے مشرق میں اور ملیشیا کی ریاست صباح کے شمال میں ایک بڑا جزیرہ ہے جو پانچ ہزار سات سو مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔ کبھی یہ جزیرہ سلطان صولو کی سلطنت میں شامل تھا اور ساری آبادی مسلمان تھی۔ اب مسلمانوں کی اکثریت صرف نصف جنوبی حصہ میں رہ گئی ہے۔

تحریک آزادی

جنوب کے صوبوں میں شمال کے عیسائی باشندوں کی مسلسل آبادکاری اور مسلمانوں کی زمینوں پر قبضہ اور مسلمان علاقوں کو عیسائی اکثریت کے علاقوں میں تبدیل کرنے کی پالیسی نے مسلمانوں میں بے چینی پیدا کر دی اور انہوں نے اس پالیسی کے خلاف سخت مظاہرے کیئے۔ اس پر حکومت نے ۱۹۷۲ء میں مارشل لا لگا دیا اور مسلمانوں کے خلاف جنوب میں فوجی کارروائی شروع کر دی۔ حکومت فلپائن کے اس طرز عمل نے مسلمانوں کو مسلح جدوجہد پر مجبور کر دیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ''منڈ اناؤ اور سولو محاذ آزادی'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ اس نے عسکر المسلمین کے نام سے ایک فوج بنائی جس میں ۱۹۷۷ء تک اسی ہزار حریت پسند شامل ہو چکے تھے۔ محاذ آزادی نے جنوبی صوبوں کو اندرونی خود مختاری دینے کا مطالبہ کیا اور اپنے وطن کا نام ''بنگسا مورو'' (Bangsa Moro) رکھا۔ محاذ آزادی نے اپنی ایک یادداشت میں اسلامی سکریٹریٹ، جدہ کو بتایا کہ کس طرح ان کی گرجیں بھی جارہی ہیں، مساجد کو نذر آتش کیا جا رہا ہے

اور عورتوں کی عصمت دری کی جا رہی ہے۔ یادداشت میں یہ بھی کہا گیا کہ ہمارا اصل مسئلہ دین ہے، اگر ہم آج اسلام ترک کر کے عیسائیت قبول کر لیں تو ہماری ساری مشکلات ختم ہو جائیں۔ اس یادداشت کے بعد اسلامی سکرٹریٹ نے ۱۹۷۳ء میں چار ملکی کمشن مقرر کیا تا کہ وہ ثالثی کے فرائض انجام دے، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ تین سال بعد لیبیا کے صدر قزافی کی کوشش سے طرابلس میں حکومت فلپائن اور قومی محاذ کے درمیان دسمبر ۱۹۷۶ء میں جنوب کے تیرہ صوبوں کو خود مختاری دینے کا فیصلہ کیا گیا اور معاہدہ پر عمل درآمد کے لیے اسلامی کانفرنس کی ایک مصالحتی کمیٹی مقرر کر دی گئی۔ حریت پسندوں کا شروع میں مطالبہ تھا کہ "بنگسا مورو" وطن میں پورا منڈاناؤ، باسیلان، سولو اور پالاوان شامل کیا جائے۔ یہ علاقہ اکیس صوبوں پر مشتمل ہے۔ لیکن طرابلس کے مذاکرات میں حریت پسندوں نے تصفیہ کی خاطر اپنا مطالبہ نرم کر دیا اور وہ صرف تیرہ صوبوں کو نئی ریاست میں شامل کرنے پر راضی ہو گئے۔ یہ صوبے حسب ذیل ہیں:

(۱) تادی تادی۔ (۲) سولو۔ (۳) باسیلان۔ (۴) جنوبی لاناؤ۔ (۵) ماگوئن ڈاناؤ۔ (۶) شمالی زمبوانگا۔ (۷) جنوبی زمبوانگا۔ (۸) شمالی لاناؤ۔ (۹) سلطان قدرت (۱۰) شمالی کوٹاباٹو۔ (۱۱) جنوبی کوٹاباٹو۔ (۱۲) جنوبی ڈاواؤ۔ (۱۳) شمالی ڈاواؤ۔

ان صوبوں میں پہلے تین جزیرے ہیں جبکہ باقی دس صوبے جزیرہ منڈاناؤ میں ہیں اور اُن دس کی مجموعی آبادی تیس لاکھ عیسائیوں، بیس لاکھ مسلمانوں اور چند لاکھ مظاہرہ پرستوں پر مشتمل ہے۔

اس تصفیہ کے بعد جب مذاکرات شروع ہوئے تو خود مختاری کی حدود پر حکومت فلپائن سے اختلافات پیدا ہو گئے۔ اور حریت پسندوں کی ایک جماعت نے مکمل آزادی کا مطالبہ کر دیا۔ مسلمانوں کے ان اختلافات سے فائدہ اٹھا کر فلپائن کی حکومت نے اگست ۱۹۷۷ء سے پھر فوجی کارروائی شروع کر دی تا کہ مسلمانوں پر اپنی مرضی کا تصفیہ مسلط کر دے۔ مئی ۱۹۷۹ء میں فاس میں ہونے والی دسویں اسلامی کانفرنس نے حکومت فلپائن پر معاہدۂ طرابلس کی خلاف ورزی کا الزام لگایا اور مسلمانوں کے قتل عام پر مارکوس حکومت کی مذمت کی۔ قرارداد میں تمام مسلمان ملکوں سے حریت پسندوں کو مادی اور اخلاقی مدد دینے کی اپیل کی۔[۱] معاہدۂ طرابلس کو اب سات سال

(۱) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ) جون ۱۹۷۹ء

پورے ہو جائیں گے لیکن جنوبی فلپائن کا مسئلہ جہاں تھا وہیں ہے۔ جنگ جاری ہے۔ ہاں اس دوران میں ۱۹۷۹ء میں صدر مارکوس نے ایک حکم جاری کیا جس کے تحت مغربی منڈاناؤ اور بعض صوبوں میں مجالس قانون ساز کے انتخابات کرائے گئے اور ان صوبوں کو یک طرفہ طور پر محدود خود مختاری دے دی گئی۔

فلپائن میں مسلمانوں کی تین بڑی تنظیمیں ہیں۔ ایک جمعیۃ الفلپین الاسلامیہ (مسلم ایسوسی ایشن آف دی فلپائن)۔ یہ سب بڑی اور پرانی تنظیم ہے۔ اس کے بانی ڈاکٹر احمد الونتو (Alonto) ہیں جنہوں نے اس کو ۱۹۲۶ء میں قائم کیا تھا۔ اس وقت جنرل پینداتن (Pendatun) اس کے صدر ہیں۔ مسلمانوں کی دوسری تنظیم انصار الاسلام کہلاتی ہے۔ اس کا مقصد مسلمانوں کی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا ہے۔ مسلمانوں کی تیسری بڑی تنظیم نو مسلم مسلمانوں کی ہے۔ یہ تنظیم ایسے نومسلموں پر مشتمل ہے جو یہ عہد کرتے ہیں کہ ان میں ہر شخص ہر سال کم از کم ایک شخص کو ضرور مسلمان کرے گا۔ اس کے صدر نسطور، بی گرمیو (Nestor B.Germio) اور سکرٹری عبدالرحمن، آر۔ ٹی۔ لنزاگ (R.T.Linzag) ہیں۔ یہ سوسائٹی فلپائن اسلامک جرنل کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع کرتی ہے۔[۱]

عبدالرحمن لنزاگ اسلامک دعوٰی کونسل (مجلس اشاعت اسلام) کے صدر بھی ہیں۔ یہ کونسل کوالالمپور میں نومبر اور دسمبر ۱۹۸۱ء میں ہونے والی بین الاقوامی دعوٰی کانفرنس کے فیصلہ کے مطابق قائم کی گئی ہے۔ اس کونسل کا مقصد فلپائن میں تبلیغی تحریکوں کو متحد کرنا ہے۔[۲]

فلپائن میں مسلمان خواتین کی بھی ایک تنظیم قائم ہے جو (Apmwip) کہلاتی ہے۔ اس تنظیم کے زیر اہتمام ایشیا اور مشرق وسطٰی کی مسلمان عورتوں کی پہلی بین الاقوامی کانفرنس ۱۴۔ ۱۸۔ دسمبر ۱۹۸۱ء کو منیلا میں منعقد ہوئی تھی۔

(۱) ہفت روزہ "مسلم ورلڈ" کراچی۔ ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء۔
(۲) ہفت روزہ "مسلم ورلڈ" کراچی۔ ۲۰۔ فروری ۱۹۸۲ء

ویت نام

دوسری عالمی جنگ سے پہلے جو علاقہ فرانسیسی ہند چینی کہلاتا تھا وہ اب تین آزاد ریاستوں میں تقسیم ہے: اول ویت نام دوم لاؤس اور سوم کمپوچیا۔ ویت نام ۱۹۷۵ء تک دو حصوں میں تقسیم رہا۔ ایک شمالی ویت نام جس پر کمیونسٹوں کا قبضہ تھا اور دوسرا جنوبی ویت نام جس پر امریکہ کے حامی ویت نامی قابض تھے۔ ۱۹۷۵ء میں جنوبی ویت نام نے ہتھیار ڈال دیئے اور اس طرح پورے ویت نام پر کمیونسٹ اقتدار قائم ہو گیا۔

ویت نام کا رقبہ ایک لاکھ ۲۶ ہزار مربع میل (۳ لاکھ ۲۹ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۱ء) پانچ کروڑ چالیس لاکھ ہے۔ آبادی کی اکثریت تاؤ اور بدھ مت کی پیرو ہے۔ عیسائیوں کی تعداد پچاس لاکھ کے قریب بتائی جاتی ہے۔

ویت نام کے مسلمانوں سے متعلق دنیا کو بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ حال ہی میں ویت نام کے ایک مسلمان مہاجر عبدالحلیم کا ایک مضمون امریکہ میں مسلمان طلبہ کی ایسوسی ایشن (M S A) کے انگریزی رسالہ الاتحاد (Al-Ittihad) میں ''ہند چینی میں اسلام اور مسلمان'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ ذیل میں ہم اس کا اختصار پیش کر رہے ہیں۔[1] یہ معلومات جنوبی ویت نام کے مسلمانوں سے متعلق ہے کیونکہ شمال میں کمیونسٹ اقتدار کی وجہ سے آہنی پردہ پڑا ہوا ہے۔

جنوبی ویت نام میں مسلمانوں کی تعداد نوے ہزار ہے۔ یہ سب چام نسل سے تعلق رکھتے ہیں ان میں چالیس ہزار مسلمان کوچین چائنا کے علاقہ میں جو انتہائی جنوب میں ہے آباد ہیں۔ ان

---

(۱) الاتحاد کا یہ مضمون رابطہ عالم اسلامی کے ماہنامہ ''مسلم ورلڈ لیگ۔ جرنل'' مکہ کی جنوری اور فروری ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں بھی شائع ہوا ہے۔ ایم۔ ایس۔ اے نے ہند چینی کے پناہ گزینوں کی مدد کے لیے جو امدادی پروگرام شروع کر رکھا ہے مضمون کے مصنف عبدالحلیم اس میں کام کرتے ہیں۔

کی آبادی زیادہ تر چاوڈوک (chau doc) تائے نن (tai ninh) اور سیگون میں ہے جس کا نام اب ہوچی منہہ سٹی رکھدیا گیا ہے۔ پچاس ہزار مسلمان مہہ تھوان (nihh thuan) کے علاقے میں آباد ہیں۔ لیکن یہ لوگ اسلامی تعلیم کے فقدان کی وجہ سے اسلام سے واقف نہیں رہے۔ ان کی مسجدیں صرف جمعہ کو کھلتی ہیں اور امام مسجد میں داخل ہوکر ان کی طرف سے نماز پڑھ لیتا ہے۔ اسی طرح رمضان کے روزے بھی ان کی طرف سے امام ہی رکھتا ہے۔ امام کو آنگ موم (aung mum) اور مؤذن کو آنگ دین (aung din) کہا جاتا ہے۔ ان کے پاس قرآن بھی مکمل شکل میں نہیں ہے۔ صرف چند سورتیں جیسے سورۂ فاتحہ، اخلاص اور الکافرون ہیں ان کے پاس ہیں جو ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں اور سالہا سال سے چلی آرہی ہیں۔ ان مسلمانوں کی نئی نسل میں بعض لوگ عیسائی اور بعض بہائی ہوگئے ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں کوچین چائنا کے مسلمانوں نے ہندوستان کے بعض مسلمان تاجروں کو بلاکر صحیح اسلامی تعلیمات سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جس کے بعد کئی ہزار مسلمان اسلام اور عبادت کرنے کے صحیح طریقوں سے واقف ہوئے اور ایسی مسجدیں بھی تعمیر کیں جن میں پانچوں وقت نماز ہوتی ہے۔

ان چام مسلمانوں نے ۱۰۔ اگست ۱۹۶۱ء کو ''ویت نام کے چام مسلمانوں کی انجمن قائم کی تاکہ لوگوں کو دینی احکام وفرائض سے آگاہ کیا جائے۔

جنوبی ویت نام کی جمہوری حکومت کے زمانہ میں دو مسلمانوں نے سیاست میں بھی حصہ لیا۔ ان میں ایک ایوان نمائندگان کا اور دوسرا سینٹ کا رکن منتخب ہوا۔ ویت نامی حکومت نے اقلیتوں کی ترقی کے لیے ایک وزارت بھی قائم کی تھی۔ ایک چام وزیر اس کا سربراہ تھا۔

جب اپریل ۱۹۷۵ء میں جنوبی ویت نام پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہوگیا تو جو ہزاروں لوگ جان بچا کر فرار ہوئے ان میں مسلمان بھی تھے۔ کمیونسٹوں نے مسجدوں اور دینی مدرسوں کو شفا خانوں اور دفتروں میں تبدیل کردیا۔ یہی سلوک سیگون کی جامع مسجد کے ساتھ کیا گیا جو ویت نام کی سب سے بڑی مسجد تھی۔ بعد میں مسلمان سفراء کی کوششوں سے یہ مسجد مسلمانوں کو واپس کردی گئی تاکہ مسلمان سفیر اس میں نماز پڑھ سکیں۔ شمالی ویت نام میں کمیونسٹوں نے ہنوئی کی مسجد کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا تھا اور اس میں فیکٹری قائم کردی تھی۔ یہ مسجد بھی

مسلمان سفیروں کی کوششوں سے بحال کی گئی ہے۔ لیکن کمیونسٹ مقامی مسلمانوں کو مسجد میں جانے کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے رہتے ہیں۔ جنوبی ویت نام پر کمیونسٹ اقتدار کے چھ سالہ دَور میں مسلمان افلاس کی اس حد پر پہنچ گئے ہیں کہ وہ اپنے مُردوں کے لیے آسانی سے کفن تک فراہم نہیں کر سکتے۔

کمپوچیا

کمپوچیا، جسے پہلے کمبوڈیا لکھا جاتا تھا جنوب مشرقی ایشیا کا ایک تاریخی ملک ہے۔ یہاں کی کھمر (khmer) سلطنت نویں صدی سے تیرہویں صدی تک تھائی لینڈ سے لے کر لاوس اور ویت نام تک پھیلی ہوئی تھی۔ ویت ناميوں اور تھائی لینڈ کے حملوں کے نتیجے میں ۱۸۰۰ء تک سلطنت کی حدود سمٹ کر موجودہ حدود تک آ گئیں۔ ۱۸۶۳ء میں فرانس نے کمپوچیا پر قبضہ کر لیا اور ۱۸۸۷ء میں اسے فرانسیسی ہند چینی کی یونین کا حصہ بنا دیا جس کے دوسرے ملک لاوس اور انام (ویت نام) تھے۔ ۱۹۴۵ء میں جاپان نے کمپوچیا پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۴۶ء میں فرانسیسی اقتدار بحال ہو گیا لیکن فرانس نے فرانسیسی یونین کے اندر کمپوچیا کو خود مختاری دے دی۔ ۱۹۵۴ء میں کمپوچیا مکمل طور پر آزاد ہو گیا۔

مارچ ۱۹۷۰ء میں جب کہ یہاں کے سربراہ شہزادہ سہانوک ماسکو میں تھے امریکہ کے حامی عناصر نے لیفٹیننٹ جنرل لون نول (Ion Nol) کی قیادت میں ان کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ اس کے بعد یہاں کے اشتراکی عناصر نے ویت نام کی مدد سے ہنگامے شروع کر دیئے۔ پانچ سال تک لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا جن میں ایک لاکھ افراد مارے گئے۔ بالآخر ۱۷۔ اپریل ۱۹۷۵ء کو کھمیر روگ (Khmer Rouge) نے صدر مقام نوم پنھ فتح کر لیا۔ سہانوک کو سربراہ مقرر کیا گیا لیکن ۱۹۷۶ء میں وہ مستعفی ہو گئے۔ اس کے بعد تباہی اور بربادی کا ایک وحشت ناک دور شروع ہوا جس میں مخالفوں کے علاوہ خود کمیونسٹوں نے کمیونسٹوں کا گلا کاٹا۔ جس کے نتیجے میں پول پاٹ حکومت کے چار سالوں (۱۹۷۵ء تا ۱۹۷۹ء) میں تیس لاکھ افراد ہلاک ہو گئے۔[۱] ۸۔ جنوری ۱۹۷۹ء کو پول پوٹ حکومت ختم ہو گئی اور اس کے بعد سے عوامی انقلابی کونسل حکمراں ہے۔

---

(۱) روزنامہ ''جسارت'' کراچی ۲۲۔ نومبر ۱۹۷۹ء

کمپوچیا کا رقبہ تقریباً ستر ہزار مربع میل (ایک لاکھ ۸۱ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی ۱۹۸۱ء) ۷۵ لاکھ ہے۔ لوگ عام طور پر بدھ مت کے پیرو ہیں۔ نوے فیصد آبادی کی زبان کھمیر ہے۔ کمپوچیا میں اسلام پندرھویں صدی میں پھیلا۔ مسلمان زیادہ تر چام قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پول پوٹ حکومت کے زمانے میں سب سے زیادہ تباہی کا شکار مسلمان ہوئے اور ان پر انسانیت سوز مظالم ہوئے۔ حکومت نے تمام لسانی، نسلی اور مذہبی گروہوں کو کھمیر قوم میں ضم ہونے پر مجبور کیا، لوگوں کو مذہب ترک کرنے پر مجبور کیا گیا۔ رہنماؤں کو قتل کیا گیا۔ پول پوٹ اور اس کے ساتھیوں پر، ان کی غیر موجودگی میں نوم پنھ میں جو مقدمہ چلایا گیا اس میں بتایا گیا کہ لوگوں کے ہاتھ پیر باندھ کر اور بوری میں بند کر کے دریائے میکانگ میں غرق کر دیا جاتا تھا۔[۱] موجودہ حکومت کا کہنا ہے کہ پول پوٹ حکومت کے دَوران ہر تین میں دو مسلمان قتل کر دیئے گئے۔ ان کے رہنما ریس لاس (Reslos) کو کھولتے پانی میں ڈال کر شہید کر دیا گیا۔[۲] مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ملک چھوڑ کر تھائی لینڈ اور ملایا کی ریاست کیلانتن میں پناہ گزیں ہے۔

مسلمانوں کی تعداد

مسلمانوں کی تعداد اور ان کی تباہی کے متعلق اعداد و شمار مختلف ہیں۔ تباہی سے قبل بعض مغربی ذرائع میں مسلمانوں کی تعداد ۸۵ ہزار اور ڈھائی لاکھ کے درمیان بتائی گئی ہے۔ موتمر عالم اسلامی کے تخمینے کے مطابق مسلمانوں کی تعداد پانچ لاکھ ستر ہزار تھی۔ جن میں ساڑھے پانچ لاکھ چام مسلمان تھے۔ مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد کمپونگ چانگ کے علاقے میں تھی یعنی تین لاکھ۔ لیکن موجودہ حکومت کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کی تعداد سات لاکھ تھی جن میں سے دو لاکھ زندہ بچے ہیں۔

موتمر عالم اسلامی کے مطابق مسجدوں کی تعداد ایک سو بچاسی تھی، جن میں نو مسجدیں نوم پنھ میں اور انسٹھ مسجدیں کمپونگ چانک کے علاقے میں تھیں۔ کمپوچیا میں جاوا کے مسلمان بھی آباد ہیں جن کی اپنی مسجدیں ہیں۔ کمپوچیا کی موجودہ حکومت کے مطابق ملک میں مسجدوں کی کل تعداد ایک سو تیرہ تھی جن میں سے صرف بیس تباہی سے بچی ہیں۔ روزنامہ ''سن'' بالٹی مور نے ۱۵۔ جولائی ۱۹۸۱ء کو یہاں کے مسلمانوں کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی جس میں بتایا گیا کہ ''کمبوڈیا

---

(۱) روزنامہ ''جسارت'' کراچی ۲۲، نومبر ۱۹۷۹ء

(۲) روزنامہ ''سن'' بالٹی مور (امریکہ) ۱۵، جولائی ۱۹۸۱ء نیز ماہنامہ ''جرنل'' مکہ معظمہ جولائی ۱۹۸۱ء

کی مسلمان اقلیت'' قتل عام کے بعد بہت کم ہوگئی ہے۔ ایک زمانے میں ان کی عظیم سلطنت تھی، لیکن اب وہ شکستہ مسجدوں اور جلائے ہوئے قرآنوں کے درمیان اپنے مذہب اور روایات کے تحفظ میں مصروف ہیں'' اگرچہ یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ کتنے مسلمان بچے ہیں لیکن پناہ گزینوں کے بیان کے مطابق ان کی تعداد میں بہت کمی آگئی ہے اور بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اب شاید مسلمان اپنا علیحدہ وجود قائم نہ رکھ سکیں۔ اس طرح اس سیاہ بخت قوم کی داستان ختم ہو جائے گی جو کسی زمانے میں ہند چینی کے وسیع علاقوں پر حکمراں تھی۔

''نوم پنھ کے شمالی مضافات میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور ۱۹۷۵ء میں یہ جگہ بڑی دلکش تھی۔ تین بڑی مسجدیں تھیں جن میں قرآنی مدرسے قائم تھے۔ بیشتر چام باشندے، ماہی گیر، ریشم بننے والے اور گلہ بان تھے، لیکن اب چھرانگ چامریاس (Chhrang Chamreas) کا یہ محلہ بدنما جھونپڑیوں سے پُر ہے، جہاں کبھی لکڑی کے کشادہ مکانات تھے۔ دو مسجدیں اور بیشتر گھر پول پوٹ نے زمین کے برابر کر دیئے اور ایک مقامی افسر کے مطابق یہاں آٹھ ہزار باشندوں میں سے صرف دو سو باقی ہیں۔ ان میں سے ایک مسجد کے دروازے عبادت کے لیے کھلے ہوئے ہیں اور ملحقہ عمارت میں اکتالیس سالہ محمد علی روزانہ بچوں اور بڑوں کو دینی تعلیم دیتا ہے۔''[1]

مذاہب اور امن کی عالمی کانفرنس (WCRP) کے کھمیر پروگرام کے ڈائرکٹر ڈیوڈ، آر ہاک (Hawk) نے بتایا ہے کہ انہوں نے اپنے پروگرام کے سلسلے میں جب کمپوچیا کا دورہ کیا تو نوم پنھ کے نواح میں ان کی ملاقات کھمیر مسلمانوں سے ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ اب صرف دو لاکھ مسلمان زندہ بچے ہیں اور صرف بیس مسجدیں رہ گئی ہیں جن میں پانچ نوم پنھ اور اس کے نواح میں ہیں۔ نئی حکومت نے مسجدوں کو از سر نو بنانے، مذہبی تعلیم دینے مذہبی تقریبات منعقد کرنے اور شادی بیاہ اور کفن دفن کی اسلامی رسوم کو ادا کرنے کی اجازت دے دی ہے۔[2]

رابطہ عالم اسلامی نے کمپوچیا اور ویت نام میں مسلمانوں کی حالت معلوم کرنے کے لیے دو افراد پر مشتمل ایک وفد ان ملکوں میں بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔[3]

(۱) روزنامہ ''S U N'' بالٹی مور ۱۵۔ جولائی ۱۹۸۱ء اور ''دی جرنل'' مکہ معظمہ، جولائی ۱۹۸۱ء

(۲) ہفت روزہ ''مسلم ورلڈ'' کراچی ۶۔ جون ۱۹۸۱ء

(۳) ایضاً ہفت روزہ ''مسلم ورلڈ'' کراچی ۳۰۔ جنوری ۱۹۸۲ء

تھائی لینڈ

تھائی لینڈ کا رقبہ ایک لاکھ ۹۸ ہزار مربع میل (۵ لاکھ ۱۴ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) چار کروڑ ستر لاکھ ہے۔ بنکاک دارالحکومت ہے۔ تین چوتھائی باشندے تھائی نسل سے ہیں۔ چودہ فیصد چینی اور تین فیصد میلے نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۹۵ فیصد آبادی بدھ مت کی پیرو ہے اور چار فیصد مسلمان ہیں۔ ایک فیصد آبادی عیسائی ہے۔

تھائی لینڈ میں اسلام سب سے پہلے دسویں صدی عیسوی[1] میں پٹانی کے علاقے میں پہنچا جو ملایا کے شمال میں واقع ہے۔ اس کے بعد ہی پٹانی میں ایک مسلمان ریاست قائم ہوگئی جو اپنے عروج کے زمانہ میں چھ اور دس ارض البلد کے درمیان پچاس ہزار مربع میل میں پھیلی ہوئی تھی۔[2] حکومت تھائی لینڈ کا دعویٰ ہے کہ ۱۲۸۳ء سے پٹانی کا صوبہ تھائی لینڈ کا ایک حصہ ہے لیکن پٹانی کے محاذ آزادی کا دعویٰ ہے کہ پٹانی کی ریاست آزاد تھی اور تھائی لینڈ نے اس پر ۱۷۸۵ء میں پہلی مرتبہ حملہ کیا اور ۱۸۳۰ء تک پٹانی پر بالادستی حاصل کرلی، ۱۹۰۱ء میں پٹانی کے آخری سلطان تنکو عبدالقادر قمر الدین کو برطرف کر کے پٹانی کا براہ راست تھائی لینڈ سے الحاق کرلیا۔ پٹانی کے باشندوں کی اکثریت ملحقہ ملایا کے باشندوں کی طرح میلے نسل سے تعلق رکھتی ہے، میلے زبان بولتی ہے اور یہ سب مسلمان ہیں۔

وسطی اور شمالی تھائی لینڈ میں مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ سترہویں صدی سے شروع ہوا۔ یہ عام طور پر تاجر تھے اور پاکستان، ہندوستان اور ایران سے آئے تھے۔ بعد میں چین کے صوبہ یونان کے مسلمان پناہ گزین بھی پہنچ گئے اور جنوب سے کچھ انڈونیشی اور میلے بھی آ گئے۔ لیکن

(۱) ماہنامہ "اسلامک ہیرلڈ" کوالالمپور جلد ۴ شمارہ نمبر ۱۔ بحوالہ پٹانی: ماضی اور حال مرتبہ اے۔ بی۔ بنگارا۔

(۲) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل، مکہ۔ فروری ۱۹۸۲ء

سب مسلمان تھائی معاشرے میں جذب ہو گئے اور انہوں نے زبان بھی تھائی اختیار کر لی۔

وسطی اور شمالی علاقے کے ان مسلمانوں سے تھائی لینڈ کی حکومت کا طرزِ عمل شروع سے اچھا رہا ہے اور ان کو حکومت میں بھی بڑے بڑے عہدے ملتے رہے ہیں۔ لیکن ۱۹۳۹ء میں جب مارشل سونگرام نے اپنی آمریت قائم کی تو مسلمانوں پر بالخصوص پٹانی کے مسلمانوں پر مظالم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مسلمانوں کو مہاتما بدھ کے مجسموں کے آگے سر جھکانے پر مجبور کیا گیا، چینیوں اور مسلمانوں کو تھائی تہذیب میں جذب ہونے کا حکم دیا گیا، عربی نام بدل کر تھائی نام اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا۔ مسلمانوں سے کہا گیا کہ اگر وہ سرکاری ملازمت چاہتے ہیں یا فوجی اکادمی میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ان کو مذہب بدلنا ہوگا۔ ۱۹۴۳ء میں شرعی عدالتیں بھی ختم کر دی گئیں۔

مارشل سونگرام کے بعد مذہبی جبر تو ختم ہو گیا لیکن سونگرام کے بعد جو حکومت آئی اس نے تھائی باشندوں کو بڑی تعداد میں جنوبی صوبوں میں آباد کرنا شروع کر دیا تا کہ ان صوبوں میں میلے اور مسلمان باشندوں کی اکثریت ختم کی جا سکے۔ ان کارروائیوں نے جنوب کے مسلمانوں میں شدید بے چینی پیدا کر دی اور انہوں نے ۱۹۴۷ء میں حسب ذیل مطالبات پیش کیے:

(۱) جنوب کے چار صوبوں کے باشندوں کو ایک خود مختار حکومت منتخب کرنے کا حق دیا جائے۔

(۲) جنوب کے ان صوبوں میں کم از کم اَسی فیصد سرکاری ملازم مسلمان ہوں۔

(۳) ابتدائی مدرسوں میں میلے زبان کی تعلیم دی جائے۔

(۴) مسلمانوں کے شخصی قوانین کے تحفظ کے لیے شرعی عدالتیں قائم کی جائیں۔

حکومت نے ان میں صرف آخری مطالبہ تسلیم کیا۔ باقی مطالبات نہ صرف یہ کہ منظور نہیں کیے بلکہ جنوب میں غیر مسلم تھائی باشندوں کو آباد کرنے کی مہم اور تیز کر دی۔ چنانچہ ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۳ء تک دس سال کی مدت میں پچاس ہزار بودھ باشندے شمال سے لا کر جنوب کے تین صوبوں یالا، ساتول اور ناراتھیواٹ میں آباد کیے گئے۔[1]

تھائی لینڈ کی حکومت کے اس طرزِ عمل سے مایوس ہو کر پٹانی کے حریت پسندوں نے ۲۲۔ جنوری ۱۹۶۸ء کو "پٹانی متحدہ تنظیم آزادی"[2] کے نام سے ایک تنظیم قائم کی تا کہ جنوبی

(۱) اسلامک ہیرلڈ، کوالالمپور۔ جلد ۴ شمارہ ۱۔ ۲

(۲) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل، مکہ۔ فروری ۱۹۸۲ء

صوبوں کی آزادی کے لیے مسلح جدوجہد شروع کی جا سکے۔ فلپائن کی طرح جنوبی تھائی لینڈ کے مسئلہ کا بھی ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا ہے اور آزادی کی یہ مسلح جنگ جاری ہے۔ تھائی لینڈ کی حکومت نے اس کو کمیونسٹ تحریک کہہ کر دبانے کی کوشش کی لیکن پی۔ یو۔ ایل۔ او کے سکرٹری جنرل کبیر عبدالرحمن نے ۲۷۔ اپریل ۱۹۸۱ء کو اقوام متحدہ کے سکرٹری کو ایک یادداشت میں وضاحت کی ہے کہ ان کی تنظیم کا کمیونسٹوں سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ صرف اپنے علاقہ کی آزادی چاہتی ہے اور یہ کہ ملایا کی کمیونسٹ پارٹی کے لوگوں نے خود تھائی لینڈ کی حکومت کی چشم پوشی سے پٹائی میں پناہ لے رکھی ہے۔[1]

مذکورہ بالا تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ تھائی لینڈ میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ جنوب کے میلے مسلمانوں کا ہے۔ جہاں تک تھائی زبان بولنے والے مسلمانوں کا تعلق ہے وہ حکومت کے طرز عمل سے مطمئن ہیں۔

مسلمانوں کی تعداد

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق تھائی لینڈ کی آبادی کا تین اعشاریہ آٹھ فیصد حصہ مسلمان ہے۔ اس حساب سے ۱۹۸۰ء میں چار کروڑ ستر لاکھ آبادی میں تقریباً اٹھارہ لاکھ مسلمان ہونے چاہئیں۔ لیکن تھائی لینڈ کے شیخ الاسلام حاجی اسماعیل کے مطابق ۱۶۵ء میں مسلمانوں کی تعداد ۲۴½ لاکھ سے زیادہ تھی۔ موتمر عالم اسلامی کے کتابچہ میں مسلمانوں کا تناسب بارہ فیصد بتایا گیا ہے اور جدہ یونیورسٹی کے مسلمان اقلیتوں کے انسٹی ٹیوٹ کے بلیٹن میں بھی مسلمانوں کا تناسب بارہ فیصد ہی بتایا گیا ہے۔ اس حساب سے مسلمانوں کی تعداد ۵۶ لاکھ ہونا چاہیے۔ لیکن غالباً یہ مبالغہ ہے۔

مسلمانوں کی اکثریت جنوب کے پانچ صوبوں میں آباد ہے۔ ان میں پٹانی، ناراتھی واٹ، یالا اور ساتول میں مسلمانوں کا تناسب ۸۵ سے نوے فیصد تک بتایا جاتا ہے۔[2] صوبہ سونگ کھالا میں بھی مسلمان کافی تعداد میں ہیں۔ یہ تمام مسلمان میلے نسل سے ہیں اور میلے زبان بولتے ہیں۔

---

(۱) ایضاً

(۲) جرنل (جدہ یونیورسٹی کے مسلمان اقلیتوں کے انسٹی ٹیوٹ کا رسالہ) جلد ۳ شمارہ نمبر ۲، ۱۹۸۱ء (raymond seupin) کا مضمون "وسطی اور شمالی تھائی لینڈ کے مسلمانوں کی سماجی اور معاشی حیثیت"۔

باقی تھائی لینڈ میں جو مسلمان آباد ہیں وہ شاید پوری مسلم آبادی کا دس فیصد سے زیادہ نہیں۔ ان کی سب سے بڑی تعداد دارالحکومت بنکاک اور اس کے نواح میں آباد ہے۔ ۱۹۷۰ء کی مردم شماری کے مطابق بنکاک میں مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی۔ ینگ مسلم ایسوسی ایشن کے مطابق ۱۹۷۷ء میں بنکاک میں چار لاکھ مسلمان تھے۔ مسلمانوں کے دوسرے تخمینوں میں شہر میں مسلمانوں کی تعداد دو لاکھ اور دو لاکھ تیس ہزار بتائی گئی ہے۔[1] شمال میں شہر چینگ مائی میں مسلمانوں کی تعداد سوا چار ہزار کے قریب ہے ان میں ڈھائی ہزار پاکستانی اور ایک ہزار سات سو چینی مسلمان ہیں۔[2]

مذہبی آزادی

تھائی لینڈ میں مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے۔ مسلمانوں کے مذہبی امور کی دیکھ بھال کے لیے ایک سربراہ ہوتا ہے جسے چولا راج منتری کہا جاتا ہے۔ ۱۹۴۸ء سے ۲۲۔ مارچ ۱۹۸۱ء کو اپنی وفات تک اس عہدے پر حاجی سووانسرت (Suwansart) فائز تھے جن کا اسلامی نام حاجی اسمٰعیل تھا۔ جنوبی صوبوں میں اسلامی شخصی قوانین کے نفاذ کے لیے قاضی مقرر ہیں۔ حج پر جانے والوں کو سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ بادشاہ عید میلاد النبی اور دوسری مذہبی تقاریب میں شرکت کرتا ہے کیونکہ وہ آئینی طور پر تمام مذاہب کا سرپرست ہے۔ کوالالمپور میں قرأت کے جو مقابلے ہو رہے ہیں ان میں تھائی لینڈ کے قاری پندرہ سال سے شرکت کر رہے ہیں اور بعض مقابلوں میں جن میں عورتیں بھی شامل ہیں انعامات بھی حاصل کیے ہیں۔[3]

حاجی اسماعیل نے تھائی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا ہے لیکن وہ شاید ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ اس وقت حاجی ابراہیم قریشی کا ترجمہ جو تین جلدوں میں شائع ہو چکا ہے رائج ہے۔ حاجی ابراہیم کے والد پاکستان کے ضلع ہزارہ سے نقل مکانی کر کے تھائی لینڈ میں آباد ہو گئے تھے۔ حاجی

---

(۱) جرنل (جدہ یونیورسٹی کے مسلمان اقلیتوں کے انسٹی ٹیوٹ کا رسالہ) جلد ۳ شمارہ نمبر ۲، ۱۹۸۱ء (raymond seupin) کا مضمون ''وسطی اور شمالی تھائی لینڈ کے مسلمانوں کی سماجی اور معاشی حیثیت۔

(۲) ایضاً

(۳) روزنامہ جنگ، کراچی۔ ۲۸۔ جون ۱۹۷۸ء، تھائی لینڈ کے سفیر مقیم پاکستان کا مضمون ملاحظہ کیجیے۔

ابراہیم نے صحیح بخاری اور سیرت النبی کے ترجمے بھی شائع کیے ہیں۔ ان ترجموں کے علاوہ تھائی لینڈ کی حکومت نے نیشنل اسلامک کونسل کی نگرانی میں قرآن بھی چھاپا ہے۔ ملیے زبان میں قرآن کے ترجمے ملایا سے درآمد کیے جاتے ہیں۔ [1]

مولانا مودودی کے رسالہ دینیات کا بھی تھائی زبان میں ترجمہ ہو گیا ہے۔

جنوب میں دینی تعلیم کے جو مدرسے ہیں ان کو پنڈوک (Pondok) کہا جاتا ہے۔ ان میں قرآن کے علاوہ عربی اور ملیے زبان بھی سکھائی جاتی ہے۔ ایسے مدرسوں کی تعداد چار سو ہے اور طلبہ کی تعداد ۲۲ ہزار [2] شمال میں اس قسم کے اسی (۸۰) مدرسے ہیں اور ہر مدرسہ میں طلبہ کی تعداد نوے ہے۔ [3] بنکاک میں ۱۹۵۰ء سے ایک اسلامیہ کالج کام کر رہا ہے، چنگ مائی میں چینیوں کی مسجد کے ساتھ ایک جدید طرز کا دینی مدرسہ ہے جو ۱۹۷۳ء میں ایک لاکھ ڈالر کے خرچ سے تعمیر کیا گیا۔ اس میں قرآن، تفسیر، حدیث، تاریخ اسلام اور عربی زبان کی تعلیم کے ساتھ انگریزی، سائنس، جغرافیہ، حساب بھی پڑھایا جاتا ہے۔ اس مدرسہ کی تعمیر میں شاہ فیصل نے پچاس ہزار ڈالر دیئے تھے۔ [4]

سرکاری اعلان کے مطابق تھائی لینڈ میں مسجدوں کی تعداد پندرہ سو ہے۔ جن صوبوں میں ایک سو سے زیادہ مسجدیں ہیں وہ یہ ہیں:

پٹانی	۳۵۸
ناراتھی واٹ	۳۱۴
سونگ کھالا	۱۶۸
یالا	۱۵۵
بنکاک	۱۳۴

پٹانی میں ایک بڑی مسجد ۱۹۶۴ء میں سرکاری خرچ سے تعمیر کی گئی۔ شہر چنگ مائی میں چار

---

(۱) جدہ یونیورسٹی کے مسلمان اقلیتوں کے شعبہ کا بلیٹن جلد ۴ شمارہ ۲، ۳ (فروری مارچ ۱۹۸۰ء)

(۲) مسلمان اقلیتیں (موتمر عالم اسلامی، کراچی) ۱۹۷۷ء

(۳) جدہ یونیورسٹی کے مسلمان اقلیتوں کے انسٹی ٹیوٹ کا جرنل جلد ۳ شمارہ نمبر ۲، ۱۹۸۱ء

(۴) ایضاً

مسجدیں ہیں۔ دو پاکستانیوں کے محلے میں اور دو چینیوں کے محلے میں۔ اس شہر میں سب سے پہلی مسجد ۱۸۸۰ء میں پاکستانیوں نے تعمیر کی تھی۔ (۱)

تھائی لینڈ میں مسلمانوں کی کئی تنظیمیں ہیں۔ ان میں جمعیۃ الاسلام سب سے پرانی ہے۔ اس کو موجودہ صدی کے پہلے عشرے کے اختتام پر برصغیر پاکستان کے مسلمانوں نے قائم کیا تھا۔ یہ جمعیت مبلغین کی تربیت کرتی ہے اور تھائی زبان میں لٹریچر شائع کرتی ہے۔ جمعیت ایک ماہنامہ ''الجہاد'' کے نام سے شائع کرتی ہے۔ ینگ مسلم ایسوسی ایشن اور الاصلاح ایسوسی ایشن دوسری تنظیمیں ہیں۔ یہ بھی اسلام پر کتابیں شائع کرتی ہیں۔ سیاسی جماعتوں میں پٹانی نیشنل لبریشن فرنٹ جو ۱۹۶۰ء میں قائم ہوئی تھی اور پٹانی یونائیٹڈ لبریشن فرنٹ جو ۱۹۶۸ء میں قائم ہوئی اہم ہیں۔ یہ دونوں جنوبی صوبوں کی آزادی کی علمبردار ہیں۔

---

(۱) جدہ یونیورسٹی کے مسلمان اقلیتوں کے انسٹی ٹیوٹ کا جرنل جلد ۳ شمارہ نمبر ۲، ۱۹۸۱ء

سنگاپور

سنگاپور، ملایا کے جنوب میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جس کا رقبہ صرف دو سو پچیس مربع میل (۵۸۱ مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) ۲۴ لاکھ ہے۔ پہلے یہ جزیرہ نما ملایا کا ایک حصہ تھا اور یہاں کی آبادی صرف میلے باشندوں پر مشتمل تھی، لیکن برطانوی دور میں اس کثرت سے چینی آباد کیے گئے کہ اب وہ کل آبادی کا ۷۴ فیصد ہیں۔ چینیوں کی یہی اکثریت ۱۹۶۵ء میں وفاق ملیشیا سے علیحدگی کا باعث ہوئی۔ جزیرہ میں میلے باشندوں کا تناسب صرف چودہ فیصد ہے۔ آٹھ فیصد ہندوستانی اور پاکستانی باشندے ہیں جن میں ۲۲ فیصد مسلمان ہیں۔ کم از کم پانچ سو خاندان پاکستانی مسلمانوں کے ہیں جو تجارت پیشہ ہیں۔ مسلمانوں کی کل تعداد ۳ لاکھ ۸۴ ہزار ہے، جو کل آبادی کا سولہ فیصد ہوتے ہیں جن میں ۳ لاکھ ۳۶ ہزار میلے اور ۴۱ ہزار ہندوستانی اور پاکستانی مسلمان ہیں۔ میلے باشندے ۹۹ اعشاریہ ۳ فیصد، ہندوستانی پاکستان ۲۱ اعشاریہ ۸ فیصد، چینی اعشاریہ ایک فیصد مسلمان ہیں۔ دوسری آباد قوموں میں مسلمانوں کا تناسب ½۶ فیصد ہے۔ عیسائی کل آبادی کا دس فیصد اور ان کی بڑی تعداد چینی ہے یا ہندوستانی۔[1] چینی، میلے، تامل اور انگریزی سرکاری زبانیں ہیں اور دفتری زبان انگریزی ہے۔

سنگاپور کے مسلمانوں کی اکثریت ملازمت پیشہ ہے یا چھوٹی موٹی تجارت کرتی ہے۔ بڑا کاروبار سب چینیوں کے ہاتھوں میں ہے۔ مسلمانوں میں سب سے دولتمند طبقہ عرب تاجروں کا ہے۔ ہندوستانی اور پاکستانی مسلمان بھی معاشی اور تعلیمی لحاظ سے سب سے پست میلے مسلمان ہیں۔ لیکن ۱۹۷۰ء کے بعد سے ان کی حالت بہتر ہوتی جا رہی ہے۔[2] ۱۹۸۰ء میں سنگاپور

(۱) جرنل (مسلمان اقلیتوں کا انسٹی ٹیوٹ، جدہ) جلد ۳ شمارہ نمبر ۲ (۱۹۸۱ء) تفصیل کے لیے دیکھیے پانگ اینگ فونگ (Pang Eng Fong) کا مضمون سنگاپور کے میلے مسلمانوں کے بارے میں۔

(۲) ایضاً

پارلیمنٹ میں سات ارکان مسلمان تھے اور کابینہ میں دو مسلمان وزیر۔ یہ سب حکمران پیپلز پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔

سنگاپور کے مسلمان اسلامی تشخص اور حقوق کے معاملے میں خاصے باشعور مستعد اور منظم ہیں۔ [1] یکم جولائی ۱۹۶۸ء سے "مسلم ریلیجس کونسل آف سنگاپور" کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے جس کا ملیے نام (majlis ugama islam singapore) ہے۔ یہ مجلس زکوٰۃ، فطرہ، اوقاف، حج اور دینی تعلیم کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ وراثت کا دعویٰ جب شافعی فقہ کے مطابق طے کرنا ہو تو شریعت کورٹ طے کرتا ہے ورنہ مجلس کرتی ہے۔ ۱۹۷۵ء سے مجلس نومسلموں کے ناموں کے اندراجات کا کام بھی کرتی ہے۔ مسجدوں کا انتظام بھی مجلس کے سپرد ہے۔ سنگاپور سے ہر سال ایک ہزار مسلمان حج کو جاتے ہیں، ان کا انتظام بھی مجلس کرتی ہے۔ یہ مجلس ایک بااختیار ادارہ ہے۔ اس کے صدر کا تقرر سنگاپور کا صدر کرتا ہے۔ سنگاپور میں اگست ۱۹۵۷ء سے مذہبی عدالتیں قائم ہیں۔

سنگاپور میں مسلمانوں کی جو تنظیمیں قائم ہیں ان میں سب سے بڑی اور سب سے پرانی جمعیت دعوت الاسلامیہ (مسلم مشنری سوسائٹی) سنگاپور ہے۔ اس کی بنیاد برصغیر پاکستان و ہند کے مشہور مبلغ مولانا عبدالعلیم صدیقی نے مقامی علماء کی مدد سے ۱۹۳۱ء میں رکھی تھی۔ ۱۹۶۸ء میں شاہ فیصل نے دو لاکھ ڈالر کی رقم دی، جس سے دفتر کے لیے جدید طرز کی شاندار عمارت تعمیر کی گئی۔ جمعیت کے تحت تعلیم، تبلیغ اور نشر و اشاعت کے شعبے ہیں۔ تبلیغی شعبہ کے تحت سنگاپور میں ہر ماہ تیس تا چالیس افراد اسلام لاتے ہیں، جن میں ہندو، سکھ اور عیسائی بھی شامل ہیں لیکن اکثریت چینیوں کی ہوتی ہے۔ جمعیت کی طرف سے "وائس آف اسلام" کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع کیا جاتا ہے۔ [2] ۱۹۶۸ء سے سنگاپور میں ایک "مجلس علمائے اسلام" بھی قائم ہے جو مساجد، اوقاف اور دینی مدارس کی دیکھ بھال کرتی ہے۔

سنگاپور میں کل ۸۵ مسجدیں اور پچیس مدرسے ہیں۔ مسجدوں کی مرمت اور تعمیر کے لیے

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے محمد صلاح الدین مدیر جسارت کے مضامین جو جسارت، کراچی میں ۱۱، نومبر تا ۱۴، نومبر ۱۹۸۰ء شائع ہوئے۔

(۲) ایضاً۔ نیز دیکھیے اسلامک ہیرلڈ، کوالالمپور۔ جلد ۵ شمارہ ۵۔ ۶ (۱۹۸۱ء)

مسلم مجلس کو چندہ جمع کرنے کا اختیار دیا گیا ہے مجلس کے تحت جو نئی مسجدیں تعمیر ہو رہی ہیں وہ تین منزلہ ہوتی ہیں اور ہر مسجد میں مدرسہ، کانفرنس ہال اور کتب خانہ ہوتا ہے۔

سنگاپور میں سب سے اہم دینی تعلیم ادارہ "مدرسہ الجنید الاسلامیہ" ہے جسے ۱۹۲۷ء میں ایک عرب تاجر عبدالرحمن الجنید بن عمر نے قائم کیا تھا۔ یہاں دینی تعلیم کے ساتھ عام نصاب بھی پڑھایا جاتا ہے۔ ذریعہ تعلیم عربی ہے اور ہر سال چالیس طالب علم اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ ازہر بھیجے جاتے ہیں۔ یہاں کے طلبہ میں حاجی یحییٰ رجائی اس لحاظ سے ممتاز ہیں کہ انہوں نے جنوبی فلپائن کے علاقوں سولو اور منڈاناؤ میں ایک سو چھ مدرسے قائم کیے اور تحریک آزادی کی داغ بیل ڈالی۔ (۱)

---

(۱) روزنامہ جسارت، کراچی۔ ۱۱، نومبر تا ۱۴، نومبر ۱۹۸۰ء

برما

برما کا رقبہ ۲ لاکھ ۶۲ ہزار مربع میل (۶ لاکھ ۷۸ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۷۹ء) ۳ کروڑ تیس لاکھ ہے۔ ملک کی ۷۲ فیصد آبادی برمی ہے، باقی شان، کرن، کاچن، چینی اور ہندوستانی ہے۔ ملک کی ۸۵ فیصد آبادی بدھ مت کی پیرو ہے۔ باقی آبادی مسلمانوں، ہندوؤں اور عیسائیوں پر مشتمل ہے۔ برمی مسلمانوں کے دعوے کے مطابق برما کی دس سے پندرہ فیصد آبادی مسلمان ہے۔

برما میں اسلام سب سے پہلے اراکان میں پہنچا۔ اشاعت اسلام کا باعث عرب تاجر تھے، لیکن اس دور کی تاریخ واضح نہیں۔ پندرہویں صدی سے اراکان کا مسلمانوں سے مستقل تعلق قائم ہوگیا۔ ۱۴۳۰ء/۸۳۳ھ میں یہاں کے بدھ راجہ نے برمیوں کا حملہ روکنے کے لیے بنگال کے سلطان سے مدد لی اور اس کا باجگذار بن گیا۔ راجہ کا نام نرامیہ کلا (Narameihkla) تھا۔ یہ راجہ بنگال میں جلاوطنی کا زمانہ گزارنے کے بعد اپنے مسلمان مددگاروں کے ساتھ ۱۴۳۰ء میں واپس آیا اور مروہانگ (Mrohaung) میں دارالحکومت قائم کیا اور وہاں ایک مسجد تعمیر کی جو مسجد سندی خاں کہلاتی ہے۔ اگلی صدی میں چاٹگام پر بنگال اور اراکان کی کئی مرتبہ لڑائی ہوئی۔ ۱۶۶۰ء/ ۱۰۷۰ھ میں شہزادہ شجاع نے اورنگ زیب سے شکست کھا کر اراکان میں پناہ لی، لیکن یہاں کے راجہ نے فروری ۱۶۶۱ء میں اس کو قتل کر کے اس کے خزانہ پر قبضہ کر لیا اور شجاع کے سپاہیوں کو ملازم رکھ لیا۔ پانچ سال بعد بنگال کے تیموری گورنر شائستہ خاں نے جوابی کاروائی کر کے ۱۶۶۶ء/ ۱۰۷۶ھ میں چاٹگام واپس لے لیا اور اس وقت سے یہ ضلع بنگال کا مستقل حصہ ہے۔

۱۶۹۲ء/ ۱۱۰۳ھ میں اراکان کے مسلمان سپاہیوں نے بغاوت کر کے بیس سال تک اراکان پر حکومت کی۔ ۱۷۸۴ء/۱۱۹۹ھ میں اراکان پر برما کا قبضہ ہوگیا اور اس کی آزاد حیثیت

ختم ہوگئی۔ مسلمانوں سے ساڑھے تین سو سال کے تعلقات کے نتیجے میں اراکان میں مسلمانوں کی مستقل آبادی قائم ہوگئی اور اسلام کی اشاعت ہوئی۔ اراکان کے بدھ حکمران بھی اسلامی تہذیب سے متاثر ہوئے۔ وہ لوگوں کو مسلمانوں جیسے خطابات دیتے تھے، سکے بنگال کے نمونہ پر ڈھالے جاتے تھے اوران پر فارسی تحریر حتیٰ کہ کلمہ تک درج ہوتا تھا۔ فوج اور انتظامی محکموں میں مسلمان افسر بڑی تعداد میں تھے۔ بنگالی زبان کے ممتاز مسلمان شاعر دولت قاضی اور سید علاول دربار اراکان کے شاعر تھے اور مسلمان افسر اور حکام ان کی سرپرستی کرتے تھے۔

انیسویں صدی میں برما پر انگریزوں نے قبضہ کر کے اس کو برطانوی ہند کا ایک صوبہ بنا دیا اور اس کی یہ حیثیت ۱۹۳۶ء تک رہی۔ ۱۹۳۷ء میں برما برطانوی ہند سے الگ کر دیا گیا۔ اس زمانہ میں اراکان کے ضلع اکیاب میں بنگال سے کثرت سے مسلمان آئے اور جنوبی برما میں ہندوستانی باشندے آ کر آباد ہوئے جن میں مسلمان بھی تھے۔ انہوں نے برمی عورتوں سے شادیاں کیں اور اس طرح جو اولاد ہوئی وہ برمی بولنے لگی۔

اس وقت برمی مسلمان تین بڑے گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ برصغیر کے ہندوستان اور پاکستان، بنگالی بولنے والے مسلمان اور برمی نسل کے مسلمان۔ ان کے علاوہ موگوک (mogok) کے علاقے میں چینی صوبے یونان سے آنے والے چینی مسلمان جو پنتھائے (panthay) کہلاتے ہیں اور جنوب میں خصوصاً بوک پن (bokpin) میں پاشو میلے، مسلمان بھی پائے جاتے ہیں۔ شمالی اراکان کے مسلمان روہنگیا کہلاتے ہیں اور برمیوں کے مقابلے میں تہذیب و تمدن میں بنگالیوں سے زیادہ مشابہ ہیں۔ لیکن تعلیم اور معاشی میدان میں برما کے باقی مسلمانوں سے بہت پیچھے ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد پانچ لاکھ سے زیادہ ہے اور ضلع اکیاب کے کئی حصوں میں ان کی اکثریت ہے۔

مسلمانوں کی تعداد

برما میں مذہبی بنیاد پر مردم شماری نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کی صحیح تعداد معلوم کرنا مشکل ہے۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں ایک کروڑ ۴۶ لاکھ آبادی میں پانچ لاکھ ۸۴ ہزار مسلمان تھے، یعنی کل آبادی کا چار فیصد۔ ان میں تین لاکھ ۹۶ ہزار برصغیر پاکستان و ہند سے تعلق رکھتے تھے۔

ایک لاکھ ۸۶ ہزار مقامی نومسلم تھے۔ جن میں بیشتر کا تعلق اراکان سے تھا۔ چینی مسلمانوں کی تعداد ایک ہزار چار سو تھی۔ (۱)

برمی مسلمانوں کے بیان کے مطابق برما میں ۱۹۸۰ء میں مسلمانوں کی تعداد تیس اور پچاس لاکھ کے درمیان تھی، یعنی کل آبادی کا دس سے پندرہ فیصد۔ (۲)

اگر یہ بیان صحیح ہے تو اس سے صرف یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ خاص برمی باشندوں میں اسلام کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہوئی جس کا ہمیں کوئی علم نہیں اور اس موضوع پر تحقیق کی جانی چاہیے۔

موتمر عالم اسلامی کے مطابق برما میں مسجدوں کی تعداد پانچ ہزار ہے، جب کہ برمی صحافی مانگ کو غفاری مدیر ''لائٹ آف اسلام'' نے مسجدوں کی تعداد ڈھائی ہزار بتائی ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ رنگون اور مانڈلے میں ستر ستر مسجدیں اور مولمین میں تیس مسجدیں ہیں اور تقریباً ہر شہر میں ایک مسجد اور ایک مدرسہ ہے۔ (۳)

برمی مسلمانوں کی اکثریت حنفی ہے، لیکن شافعی، اہل حدیث اور شیعہ بھی پائے جاتے ہیں۔ برما میں مسلمانوں کے شخصی قوانین پر عمل ہوتا ہے، لیکن ۱۹۶۲ء کے سوشلسٹ انقلاب کے بعد حج پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ اس کے اٹھارہ سال بعد ۱۹۸۰ء میں حکومت نے ڈیڑھ سو مسلمانوں کو حج پر جانے کی اجازت دی۔

دینی تعلیم کے لیے مدرسے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ان کو یا تو انفرادی طور پر چلایا جاتا ہے یا کسی کمیٹی کے تحت مسلمانوں کے چندے سے چلایا جاتا ہے۔ موتمر عالم اسلامی کے اندازے کے مطابق ساٹھ فیصد بچے ان مدرسوں میں اسلامی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور بیس فیصد اپنے گھروں پر۔ علماء، اماموں، خطیبوں کو تربیت دینے کے لیے بیس دار العلوم ہیں۔ حافظوں کی تیاری کے لیے چھ خصوصی ادارے بھی ہیں۔ عربی صرف دار العلوم میں پڑھائی جاتی ہے۔ رنگون میں جدید تعلیم کے مسلمانوں کے تین کالج تھے جن کو ۱۹۶۴ء میں قومی تحویل میں لے لیا گیا۔ مسلمانوں کا ایک مرکزی ٹرسٹ بھی ہے، جو اسلامی تعلیم کے فروغ اور اشاعت کتب کے علاوہ

(۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور، مقالہ ''برما''۔

(۲) اسلامک ہیرلڈ، کوالالمپور، جلد ۴ شمارہ ۹۔ ۱۰ (۱۹۸۰ء) مضمون از مانگ کو غفاری، نیز مسلم ورلڈ، کراچی۔ ۱۳۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء

(۳) ایضاً

ضرورت مندوں کی مدد بھی کرتا ہے، لیکن کاروبار اور تجارت کو قومی تحویل میں لینے کی وجہ سے ٹرسٹ کی آمدنی کم ہوگئی ہے۔ اب یہاں صرف قرآن چھاپا جاتا ہے اور ضرورت مند طلبہ کی مدد کی جاتی ہے۔

قرآن کا برمی زبان میں ترجمہ ہوگیا ہے، ایک تفسیر بھی ہے۔ ترجمہ اور تفسیر دونوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ معیاری ہیں، لیکن ابھی صرف چند سپارے چھپے ہیں۔ حکومت کی منظوری لینے کی وجہ سے طباعت میں دیر ہورہی ہے۔ کاغذ بھی حکومت سے لینا پڑتا ہے۔ کتابوں کی درآمد کا کام حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور وہ عربی یا اردو کتابیں درآمد نہیں کرتی۔ تحفہ کے طور پر بھی قرآن حاصل کرنے پر پابندی ہے اور برمی زبان میں مذہبی کتابیں کم تعداد میں چھپتی ہیں۔

برما میں مسلمانوں کی کئی تنظیمیں ہیں۔ ان میں جمعیت الاسلام، آل برما مسلم آرگنائیزیشن اور مذہبی امور کی اسلامی کونسل قابل ذکر ہیں۔ برمی مسلمان سرکاری ملازمتوں، فوج، تجارت، صنعت، کاشتکاری اور ماہی گیری، تمام پیشوں میں پائے جاتے ہیں۔ بیشتر برمی مسلمانوں کے رشتہ داروں میں بودھ بھی پائے جاتے ہیں۔ خالص برمی مسلمان دیہات میں اور ہندوستانی شکل اور صورت کے مسلمان شہروں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے دینی مدرسوں میں اردو ذریعہ تعلیم ہے۔ مسلمان اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز ہیں لیکن آبادی کے تناسب سے کم ہیں۔ بحیثیت مجموعی برما کے مسلمان، خواندگی، فی کس آمدنی اور اعلیٰ تعلیم کے لحاظ سے کئی ملکوں کے مسلمانوں سے آگے ہیں۔

روہنگیا مسلمان

جس طرح فلپائن اور تھائی لینڈ میں جنوبی علاقوں کے مسلمانوں کا مسئلہ سیاسی اہمیت رکھتا ہے اسی طرح برما میں مذہبی آزادی کے باوجود اراکان کے روہنگیا مسلمانوں کا مسئلہ سیاسی اہمیت اختیار کرگیا ہے۔ یہ مسلمان پانچ سو سال سے آباد ہیں اور اس ساری مدت میں انہوں نے اپنی زبان اور تہذیب کا تحفظ کیا، جس کی وجہ سے وہ برمی حکومت کے عتاب کا نشانہ بنتے رہے۔ چونکہ ارکان کے ضلع اکیاب کے بعض حصوں میں ان کی اکثریت ہے اس لیے ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۴ء تک ان میں آزادی کی تحریک بھی چلتی رہی ہے، جس کا مقصد مسلم اکثریت کے علاقوں کو پاکستان

میں ملا نا تھا۔[1] اگرچہ یہ تحریک جلد ختم ہوگئی لیکن برمی حکومت کے مظالم برابر جاری ہیں جس کی وجہ سے روہنگیا مسلمان ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۱ء تک کئی بار بنگلہ دیش میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ کبھی خود برمی حکومت ان کو نکال باہر کرتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۸ء کے درمیان تین لاکھ روہنگیا مسلمانوں کو برما سے نکال کر بنگلہ دیش میں دھکیل دیا گیا۔ اگرچہ بعد میں بنگلہ دیش کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت ان کو برمانے واپس لے لیا اور ان کی بحالی اور آبادکاری کے کام کی نگرانی اقوام متحدہ کے کمشنر برائے مہاجرین (UNHCR) کے سپرد کی گئی لیکن روہنگیا جمعیت العلماء کے صدر مولانا نورالاسلام نے اراکان کا دورہ کرنے کے بعد بتایا کہ مسلمان خوف و دہشت کے حالات میں زندگی گزار رہے ہیں اور ان پر طرح طرح کی پابندیاں عائد ہیں اور برمی فوجی، کیمپوں میں داخل ہوکر عورتوں کو بے عزت کرتے ہیں۔[2]

---

(۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، لاہور۔ مقالہ برما۔

(۲) امپیکٹ، لندن۔ ۲۷۔ اپریل تا ۱۰۔ مئی ۱۹۷۹ء اور ۹۔ ۲۲۔ جنوری ۱۹۸۱ء

نیپال

نیپال کا رقبہ ۵۴ ہزار مربع میل (ایک لاکھ ۴۱ ہزار مربع کلومیٹر اور آبادی (۱۹۸۰ء) ایک کروڑ ۴۳ لاکھ ہے۔ ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندو ۸۸ فیصد، بودھ ۹ فیصد اور مسلمان ۳ فیصد ہیں۔ ۱۹۶۱ء اور ۱۹۷۱ء کے درمیان مسلمانوں کی آبادی میں ۲۵ فیصد اضافہ ہوا جب کہ یانی آبادی میں اضافہ کی شرح ۲۲ اعشاریہ ۸ فیصد رہی۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے ابتدائی اعداد و شمار کے مطابق مسلمانوں کی آبادی نو لاکھ ہوگئی ہے۔ اس غیر معمولی اضافے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ پچھلی مردم شماریاں صحیح نہیں ہوئی تھیں۔ اس اضافہ کی دوسری وجہ وہ مسلمان مہاجر بھی ہو سکتے ہیں جو ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کے قیام کے بعد نیپال میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ لیکن ایک نیپالی مصنف ٹی۔اے۔ انصاری کا کہنا ہے ۱۹۸۱ء کے اعداد و شمار بھی صحیح نہیں اور ان کے اور نیپال مسلمانوں کے اندازے کے مطابق نیپالی مسلمانوں کی تعداد تیرہ لاکھ یعنی کل آبادی کا دس فیصد ہے۔ (۱)

۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق مسلمانوں کی کل تعداد ۳ لاکھ ۵۱ ہزار تھی۔ ان میں تین لاکھ اکتالیس ہزار ترائی کے علاقے میں تھے جو اُتر پردیش اور بہار سے ملا ہوا ہے۔ ½۸ ہزار پہاڑی علاقوں میں خصوصاً مغربی حصہ میں تھے اور وادی کھٹمنڈو میں صرف ایک ہزار دو سو مسلمان تھے۔ لیکن ٹی۔اے انصاری نے ۱۹۷۱ء میں کھٹمنڈو میں مسلمانوں کی تعداد تین ہزار اور ۱۹۸۱ء میں چار ہزار لکھی ہے اور یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ تعداد اصل تعداد سے چالیس فیصد کم ہے۔

---

(۱) مذکورہ بالا اعداد و شمار حسب ذیل مضامین پر مبنی ہیں:

(۱) سامد انصاری (کھٹمنڈو یونیورسٹی): جرنل (مسلمان اقلیتوں کا انسٹی ٹیوٹ، جدہ) جلد ۲۔۳۔ (۱۹۸۰ء۔۱۹۸۱ء) "مضمون نیپال میں مسلمان"

(۲) مارک گبوریو (Marc Gaboriecau) جرنل (جدہ) جلد ۳ شمارہ نمبر ۲ (۱۹۸۱ء) "مضمون نیپال کی بادشاہت میں مسلمان اقلیتیں"

(۳) ٹی۔اے انصاری: ماہنامہ یونیورسل میسیج، کراچی۔ دسمبر ۱۹۸۱ء

مسلمان نیپال کے ۷۵ اضلاع میں سے پچاس میں پائے جاتے ہیں۔ جو لوگ پہاڑی علاقوں میں ہیں ان کی بڑی تعداد ان حریت پسندوں کی اولاد ہے جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکام ہونے کے بعد نیپال میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ حامد انصاری نے ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق نیپال کے تمام اضلاع کی آبادی اور ان میں مسلمانوں کی تعداد دی ہے۔

نیپالی آئین کی رو سے نیپال ایک ہندو ریاست ہے۔ چند سال پہلے تک مسلمانوں کو ملچھ سمجھا جاتا تھا اور مسلمان طلبہ نیپالی مدرسوں میں داخلہ نہیں لے سکتے تھے۔ لیکن ۱۹۴۰ء کے بعد سے مدارس اور کالجوں میں داخلہ کی اجازت مل گئی ہے اور جب سے ابتدائی تعلیم مفت قرار دی گئی ہے مسلمان بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے۔ تقریباً ہر گاؤں میں ایک مدرسہ ہے جہاں مسلمان بچوں کو اردو اور دین کی تعلیم دی جاتی ہے۔ نیپالی مسلمانوں میں بہت کم حافظ، قاری اور عالم ہیں۔ یہ فرائض ہندوستانی علماء انجام دیتے ہیں۔(۱) کھٹمنڈو یونیورسٹی میں علم سیاسیات کے پروفیسر ایس۔ ایم حبیب اللہ جو نیپال مسلم کلچر سنٹر کے صدر بھی ہیں، ترائی کے مدرسوں کو اس طرح منظم کر رہے ہیں کہ ان کے نصابوں میں یکسانیت پیدا ہو جائے اور اسلامی مضامین کے ساتھ انگریزی، قومی زبان اور ریاضی کے مضامین بھی شامل درس ہو جائیں۔ اب ترائی میں پندرہ مدرسے ایسے ہو گئے ہیں جہاں عالم اور فاضل تک تعلیم دی جاتی ہے۔(۲)

۱۹۸۱ء کے آخر میں ضلع دھانوکا کے قصبہ جنگ پور میں مدینہ یونیورسٹی کی مالی مدد سے جامعہ سلفیہ کے نام سے ایک دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی ہے جس سے دینی تعلیم کا معیار بلند کرنے میں مدد ملے گی۔

نیپال میں اگرچہ مذہبی آزادی ہے لیکن اسلامی شخصی قانون نافذ نہیں۔ شادی اسلامی طریقہ پر کی جا سکتی ہے لیکن طلاق نہیں دی جا سکتی۔ گائے کے گوشت پر پابندی ہے اور ہندو تبدیل مذہب نہیں کر سکتا۔ ہر سال پچاس مسلمان حج پر جاتے ہیں۔

مسلمانوں کی اکثریت دیہات میں آباد ہے اور زراعت پیشہ ہے۔ کھٹمنڈو کے مسلمان

---

(۱) جرنل (جدہ) جلد ۲۔ ۳ شمارہ ۲۔ (۱۹۸۰ء۔ ۱۹۸۱ء)

(۲) ہفت روزہ "مسلم ورلڈ" کراچی۔ ۱۴۔ فروری ۱۹۸۱ء

زیادہ تر تجارت پیشہ ہیں اور ترائی کے مسلمانوں کی نسبت خوشحال ہیں۔ یہاں ہر گھر میں ایک حاجی ملے گا۔ ۱۹۶۷ء میں گریجویٹ مسلمانوں کی تعداد صرف ۵۲ تھی لیکن اب خواندگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مسلمانوں میں انجینئر اور ڈاکٹر بھی ہیں اور ۱۹۸۰ء میں کھٹمنڈو یونیورسٹی میں پانچ لیکچرار مسلمان تھے۔

نیپال میں مسجدوں کی تعداد معلوم نہیں ہوسکی۔ کھٹمنڈو میں تین مسجدیں ہیں۔ ایک کشمیری مسجد اور دوسری نیپالی جامع مسجد کہلاتی ہے۔ دونوں کے ساتھ ایک ایک مدرسہ ہے لیکن نیپالی جامع مسجد کے ساتھ ایک مسافر خانہ بھی ہے۔ جسے ہندوستانی تکیہ کہا جاتا ہے۔ تیسری مسجد عراقی بازار مسجد کہلاتی ہے اور مارکیٹ کے علاقہ میں ہے۔[۱]

نیپال میں مسلمانوں کی کئی تنظیمیں ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں ملک کی پانچ بڑی سماجی اور مذہبی تنظیموں نے اسلامک کوآپریشن کمیٹی (اسلامی مجلس تعاون) کے نام سے ایک تنظیم بنالی ہے۔[۲]

---

(۱) دیکھئے ایم۔ حبیب اللہ (کھٹمنڈو یونیورسٹی) کا حامد انصاری کے مضمون پر تبصرہ جو مسلمان اقلیتوں کے انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ ''جرنل'' جلد ۳ شمارہ نمبر ۲ (۱۹۸۱ء) میں صفحہ ۳۰۱۔۳۰۳ پر شائع ہوا ہے۔

(۲) ہفت روزہ ''مسلم ورلڈ'' کراچی۔ ۹۔ مئی ۱۹۸۱ء

ہندوستان

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی سابق برطانوی نو آبادی تین سیاسی حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ پندرہ لاکھ مربع میل میں سے ۳ لاکھ ۵۶ ہزار مربع میل میں پاکستان کی نئی مملکت قائم ہوگئی، گیارہ لاکھ ۸۷ ہزار مربع میل کا علاقہ ہندوستان میں رہ گیا اور ۸۴ ہزار مربع میل پر مشتمل جموں اور کشمیر کی ریاست پاکستان اور ہندوستان کے درمیان متنازعہ بن گئی۔ ۱۹۴۱ء میں برطانوی ہند کی آبادی ۳۱ کروڑ ۸۷ لاکھ تھی، جس میں مسلمانوں کی تعداد ۹ کروڑ چوالیس لاکھ تھی۔ تقسیم کے بعد مسلمانوں کی تقریباً دو تہائی مقدار پاکستان میں آ گئی۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق پاکستان میں مسلمانوں کی تعداد (بشمول مشرقی پاکستان) ۶ کروڑ ۹۴ لاکھ تھی، جبکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد ۳ کروڑ ۵۴ لاکھ تھی۔ کشمیر کے مسلمان اس کے علاوہ تھے جن کی تعداد ۱۹۴۱ء میں اکتیس لاکھ تھی اور وہ کل آبادی کا ۷۷ فیصد سے کچھ زیادہ تھے۔

برطانوی ہند کی تقسیم کے بعد جہاں پاکستان کے مسلمانوں کے لیے ترقی کے لامحدود امکانات پیدا ہوگئے، وہاں ہندوستان کی مسلمان اقلیت گوناگوں مشکلات اور مسائل میں مبتلا ہوگئی۔ وہ تمام بڑے سہارے جو ہندوستانی مسلمانوں کی قوت اور خوشحالی کا ذریعہ تھے، تقسیم کے بعد سب ختم ہوگئے۔ برطانوی ہند کی مسلمان ریاستیں حیدرآباد، بھوپال، جوناگڑھ، رامپور اور ٹونک ہندوستان کے نئے انتظامی ڈھانچے کے بعد ختم کردی گئیں۔ یہ ریاستیں مسلمانوں کے لیے اعلیٰ ملازمتوں کا بہت بڑا ذریعہ تھیں۔ علاوہ ازیں ان کے خزانوں سے سارے ہندوستان کے علمی، مذہبی، ادبی سماجی اور تعلیمی اداروں کو مالی امداد ملتی تھی اور ہزاروں علماء، ادیبوں، شاعروں اور ہنرمندوں کو وظیفے ملتے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے نام سے حیدرآباد (دکن) میں جو یونیورسٹی قائم تھی اس نے سب سے پہلے اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا تھا اور اس کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کے تحت سینکڑوں

کتابوں کا انگریزی، فرانسیسی، عربی اور فارسی سے اردو میں ترجمہ کرایا گیا تھا، جامعہ عثمانیہ کا یہ کردار ۱۹۴۸ء میں حیدر آباد پر ہندوستان کے قبضہ کے بعد ختم ہو گیا۔ مختصر یہ کہ ہندوستان کی مسلمان ریاستوں کے ختم ہو جانے سے مسلمانوں کی معاشی اور ثقافتی زندگی پر بڑی گہری ضرب لگی۔

ریاستوں کے بعد مسلمانوں کی قوت کا دوسرا عنصر بڑے بڑے جاگیردار اور زمیندار تھے۔ اگرچہ مسلمان جاگیردار ہر صوبہ میں پائے جاتے تھے لیکن صوبہ متحدہ یعنی اتر پردیش میں ان کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ مسلمانوں کی سیاسی زندگی پر ان جاگیرداروں اور زمینداروں کا بہت اثر تھا اور سماجی سرگرمیوں میں ان کی دولت کے علاوہ ان کے اثرات سے بڑی مدد ملتی تھی۔ یہ اسی طبقے کی موجودگی کا نتیجہ تھا کہ صوبہ اتر پردیش میں مسلمان اگرچہ سولہ فیصد سے زیادہ نہیں تھے لیکن صوبے کی سیاسی اور سماجی زندگی پر مسلمانوں کے اثرات اس تناسب سے کہیں زیادہ تھے۔ صوبہ کی پولیس کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ ہندی مسلمانوں کی سیاسی، علمی اور ادبی نہضت میں اس صوبے کے مسلمانوں کے کس قدر اثرات تھے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسلامی ہند کو جتنی مؤثر اور وافر قیادت اس صوبے نے فراہم کی کسی دوسرے صوبے نے فراہم نہیں کی اور یہ بھی اس صورت میں جب کہ وہ صوبے جو اب پاکستان میں شامل ہیں وہ بھی موجود تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، دیوبند اور ندوۃ العلماء جیسے بلند پایہ تعلیمی ادارے اسی صوبے میں ہیں۔ اردو زبان صحافت اور علم وادب کا گڑھ بھی یہی صوبہ رہا ہے۔ دار المصنفین، اعظم گڑھ جو برصغیر میں مسلمانوں کا پہلا بلند پایہ تحقیقی ادارہ ہے اسی صوبہ میں ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جاگیرداریاں ختم کر دی گئیں اور زمینداریاں محدود کر دی گئیں۔ اگرچہ یہ کام عام اصلاحات سے تعلق رکھتا تھا اور مسلم دشمنی اس کا مقصد نہیں تھا لیکن چونکہ مسلمان ملک کی صنعت، حرفت کے میدان میں موجود نہیں تھے اور ان کی معاشی خوشحالی اور سماجی ترقی میں ریاستوں اور جاگیروں کا بڑا حصہ تھا اس لیے ریاستوں کی طرح جاگیروں کے ختم ہونے اور زمینداروں کے محدود ہونے سے، مسلمانانِ ہند کی معاشی زندگی بری طرح مؤثر ہوئی اور ان میں بے روزگاری عام ہو گئی اور ثقافتی ترقی کی راہیں محدود ہو گئیں، مسلمان تجارت اور کاروبار میں بھی بہت کم تھے۔ صرف دلی، آگرہ، کانپور، لکھنؤ، حیدر آباد، بمبئی، کلکتہ اور سورت جیسے چند بڑے شہروں میں ایک چھوٹا سا تجارتی طبقہ ان میں موجود تھا۔ ان تاجروں کو چونکہ ہندوؤں سے مسلسل مقابلہ رہتا تھا اس لیے تقسیم کے

بعد ان کی بھی ایک خاصی تعداد بہتر معاشی اور کاروباری امکانات کی امید میں پاکستان ہجرت کر گئی اور اس طرح ہندوستانی مسلمانوں کی مختصر سی کاروباری زندگی میں بھی ایک خلا پیدا ہو گیا۔

مشرقی پنجاب کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب تقریباً ایک تہائی تھا۔ یہاں بھی یوپی کی طرح مسلمان زمینداروں کی اور جاگیرداروں کی تعداد بہت تھی اور یہاں کے مسلمان مغربی پنجاب کے مقابلے میں زیادہ خوشحال تھے اور تعلیم میں بھی آگے تھے۔ پنجاب میں فسادات کے نتیجے میں جب دونوں صوبوں میں لازمی تبادلہ آبادی ہوا تو مشرقی پنجاب مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق مشرقی پنجاب سے کل اکاون لاکھ ۴۶ ہزار مسلمان ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ اگرچہ اس تبادلۂ آبادی کے نتیجے میں پاکستان کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ یہاں مسلمانوں کی خالص آبادی ہو گئی لیکن اسلامی ہند، مسلمانوں کی ایک خوشحال اور فعال جماعت سے محروم ہو گیا۔ صوبہ دہلی میں بھی مسلمانوں کا تناسب ایک تہائی سے زیادہ تھا اور پرانی دلی میں تو وہ کل آبادی کا نصف تھے۔ یہ مسلمان تعلیم اور کاروبار میں بھی بہت آگے تھے۔ لیکن تقسیم کے موقع پر، دہلی میں جو فسادات ہوئے، ان سے دہلی کے مسلمانوں کی قومی زندگی کی بنیادیں ہل گئیں۔ ان کا ذہین ترین طبقہ بعد میں ہجرت کر کے پاکستان چلا گیا اور مسلمان جامع مسجد اور فتحپوری سے متصل محدود علاقہ میں بند ہو کر رہ گئے۔

پاکستان بننے کے بعد مسلمانوں کی دو تہائی آبادی سے ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق ختم ہو گیا۔ اب وہ ملک کی آبادی کا دسواں حصہ رہ گئے تھے، جبکہ تقسیم سے قبل مسلمانوں کا تناسب پورے ملک کی آبادی میں تقریباً ایک چوتھائی تھا۔ آبادی کی اس کمی نے سیاسی سودہ بازی میں مسلمانوں کی طاقت کو کمزور کر دیا اور معاشی میدان میں مسلمانوں کی تجارتی منڈی بھی مختصر ہو گئی۔ اردو کتابوں کی تقریباً نصف کھپت پاکستانی علاقوں میں ہوتی تھی۔ اب یہ منڈی ہندوستانی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئی۔

مذکورہ بالا مشکلات کے ساتھ جو تقسیم ہند کا لازمی نتیجہ تھیں، ہندوستان کے مسلمانوں کو حکومت اور ہندو عوام، دونوں کی طرف سے روایتی تعصب کا بھی سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ حکومت اگرچہ سیکولرازم کی دعویدار ہے لیکن مسلمانوں کے ساتھ گزشتہ ۳۵ سالوں میں حکومت اور ہندو عوام کا جو طرز عمل رہا ہے وہ اس دعوے کی پوری طرح نہیں تو جزوی طور پر ضرور نفی کرتا ہے۔ یہ صحیح

ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں پوری طرح مذہبی آزادی حاصل ہے وہ اسلامی شخصی قوانین پر بھی عمل کر سکتے ہیں لیکن سیاسی سماجی اور معاشی سطح پر ان کے ساتھ جو امتیازی سلوک کیا جارہا ہے اس نے مسلمانوں کے لیے نہ صرف ترقی کی راہیں مسدود کر دی ہیں بلکہ ان کے لیے عزت کی زندگی گزارنا ناممکن کر دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے سابق صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم نے مسلمانوں کے ایک وفد کے سامنے کہا تھا کہ "یہاں صدر بن جانا ایک مسلمان کے لیے آسان ہے لیکن چپراسی کی جگہ پانا بہت مشکل ہے۔"(۱)

۱۹۸۰ء میں ایک سو چھ بھارتی سفیروں میں صرف چھ مسلمان تھے۔ ۲۳ ہائی کمشنروں میں ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔ اسی طرح ۵۴ قونصلوں اور جنرل قونصلوں میں اور ۱۲۴ اعزازی قونصلوں میں ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔(۲)

عام سرکاری ملازمتوں میں بھی مسلمانوں کا یہی حال ہے۔ تفصیل کے لیے روزنامہ جسارت مورخہ ۷ نومبر ۱۹۸۱ء ملاحظہ کیجیے جس میں بھارتی نمائندے کی مدد سے بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کے مختلف سرکاری محکموں میں کتنے مسلمان ملازم ہیں۔

قانون ساز اسمبلیوں میں اگرچہ مخلوط طریق انتخاب کی وجہ سے مسلمانوں کے حقیقی نمائندے منتخب نہیں ہو سکتے لیکن پھر بھی مسلمانوں کو ان میں عرصہ دراز تک آبادی کے لحاظ سے نمائندگی نہیں مل سکی۔ ۱۹۸۱ء میں پہلی مرتبہ لوک سبھا (مرکزی پارلیمنٹ) میں مسلمان نمائندوں کی تعداد ۲۷ سے بڑھ کر ۴۸ ہوئی۔

۱۹۸۱ء کے آخر میں بھارت کے ایک مسلمان مزدور رہنما یوسف بیگ نے نمائندہ جسارت کو ایک انٹرویو میں بتایا کہ: مسلمان بحیثیت ایک طبقہ کے معاشی طور پر کافی پریشان حال ہے۔ سرکاری ملازمتوں اور صنعتی ملازمتوں میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ان کی تعداد بہت کم ہے جس کی وجہ سے بے روزگاری مسلمانوں میں بہت زیادہ ہے۔ اب تو سماجی اور معاشی لحاظ سے مسلمانوں میں ہریجنوں کی طرح پسماندگی آتی جارہی ہے۔ (جسارت ۱۱۔ دسمبر ۱۹۸۱ء)

---

(۱) جسارت، کراچی۔ ۷۔ نومبر ۱۹۸۱ء

(۲) دی جرنل مسلم ورلڈ لیگ (مکہ) فروری ۱۹۸۲ء بحوالہ مطبوعات وزارت خارجہ، بھارت۔

مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کی ان مثالوں سے زیادہ ہندوؤں کے متعصبانہ طرزِ عمل کا مونہہ بولتا ثبوت وہ فسادات ہیں جو ۱۹۴۷ء سے آج تک ہندوستان کا معمول رہے ہیں۔ شروع شروع میں یہ خیال کیا جاسکتا تھا کہ تقسیم ہند کے ردِّ عمل کے طور پر یہ فسادات ہندوؤں کے جذبات کا اظہار تھے۔ لیکن اب جب کہ تقسیم کو ۳۵ سال گزر چکے ہیں ان کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ان فسادات نے مسلمانوں کو یکسوئی کے ساتھ اپنی گری ہوئی حالت سنبھالنے اور اپنے وطن کی تعمیر میں خلوص دل سے حصہ لینا مشکل بنادیا ہے۔

۷۔ نومبر ۱۹۸۱ء کے جسارت میں بھارتی پارلیمنٹ کے کیمونسٹ ممبر اسحاق سنبھلی، پندرہ روزہ امپیکٹ انٹرنیشنل (لندن) مورخہ ۲۷۔ ستمبر ۱۹۷۹ء اور مسٹر گاباسابق ممبر بھارتی پارلیمنٹ کی کتاب پیسو وائسز (Passive voices) کے حوالہ سے ایک رپورٹ شائع کی گئی ہے جس میں ہر سال کے اعداد و شمار دے کر بتایا گیا ہے کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸۰ء تک بھارت میں ساڑھے چودہ ہزار سے زیادہ ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۹ء تک کے فسادات میں سرکاری اطلاعات کے مطابق دو سو اکسٹھ مسلمان مارے گئے اور دو ہزار چار سو زخمی ہوئے۔ لیکن ایک امریکی صحافی رچرڈ لمبرٹ Lombert نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کی اموات سرکاری اعداد و شمار سے ڈھائی تا دس گنا زیادہ ہوتی ہیں۔

ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کی تعداد اور شدت، دونوں میں وقت کے ساتھ ساتھ کمی ہونے کی بجائے اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ۱۹۶۹ء کے وسط میں احمد آباد کے مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا جس میں ایک ہزار مسلمان مرد، عورتیں اور بچے مارے گئے اور دس ہزار زخمی ہوئے۔ مسجدیں ڈھائی گئیں، لوٹ مار کی گئی، گھروں کو آگ لگائی گئی اور عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔ [1] اگست ۱۹۸۰ء میں مراد آباد کے مسلم محلوں پر حملے کے دوران دو ہزار مسلمان شہید ہوئے جن میں ایک سو ستر مسلمان صرف پولیس فائرنگ سے ہلاک ہوئے۔ مراد آباد کے فساد کے بعد مسلم دشمن فسادات نے سات صدیوں میں تیس شہروں اور قصبوں کو اپنی زد میں لے لیا۔ [2]

---

(۱) ہفت روزہ ''یقین'' کراچی۔ ۲۲، دسمبر ۱۹۶۹ء

(۲) امپیکٹ، لندن۔ ۱۲۔ ۲۵۔ ستمبر ۱۹۸۰ء اور جسارت ۷۔ نومبر ۱۹۸۱ء۔

تازہ ترین مثال آسام کی ہے جہاں انتخاب کے موقع پر فروری ۱۹۸۳ء میں صرف ضلع نوگانگ میں سولہ گاؤں کے مسلمان ختم کر دیئے گئے۔ آسام کے اس قتل عام میں چار ہزار سے زیادہ افراد قتل ہوئے اور بستیاں کی بستیاں مسلمانوں سے خالی ہو گئیں۔ اگرچہ یہ فسادات بنگالیوں کے خلاف ہوئے تھے لیکن ان میں سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں ہی کا ہوا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں مشرقی پنجاب اور جموں اور کٹھوا کے اضلاع مسلمانوں سے خالی کرا لیے گئے تھے اب آسام کے مشرقی اضلاع مسلمانوں سے خالی کرائے جا رہے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اندلس کی تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔

مسلمانوں کی تعداد

تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کی پہلی مردم شماری ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔ اس کے بعد ہر دس سال بعد پابندی سے مردم شماری ہو رہی ہے۔ ذیل میں ہر مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی آبادی اور اس میں مسلمانوں کی تعداد دی جا رہی ہے۔

سال	کل آبادی	مسلمانوں کی تعداد	تناسب فیصد
۱۹۵۱	۳۶ کروڑ ۱۱ لاکھ	۳ کروڑ ۵۴ لاکھ	۹ء۹
۱۹۶۱	۴۳ کروڑ ۹۲ لاکھ	۴ کروڑ ۶۹ لاکھ	۱۰ء۷
۱۹۷۱	۵۴ کروڑ ۸۰ لاکھ	۶ کروڑ ۱۴ لاکھ	۱۱ء۲
۱۹۸۱	۶۷ کروڑ ۲۰ لاکھ	۸ کروڑ دس لاکھ	۱۲ء۱

۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں مقبوضہ کشمیر کی آبادی شامل نہیں، لیکن بعد کی مردم شماریوں میں مقبوضہ کشمیر کی آبادی شامل ہے۔ مسلمانوں کی آبادی کے تناسب میں اضافہ اس وجہ سے نظر آتا ہے کہ مسلمانوں میں شرح پیدائش ہندوؤں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ مسلمانوں کی آبادی میں یہ اضافہ بھی ہندوؤں میں تشویش کا باعث ہے۔

۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق صوبوں (ریاستوں) اور علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی حسب ذیل ہے۔

ریاست	مسلمانوں کی آبادی	فیصد تناسب
اتر پردیش	ایک کروڑ ۷۳ لاکھ	۱۵½
مغربی بنگال	نوے لاکھ	۲۰½
بہار	۶۷ لاکھ	۱۳½
کیرالا	۴۱ لاکھ	۱۹½
آسام	۳۶ لاکھ	۲۴
آندھرا پردیش	۳۵ لاکھ	۸
مہاراشٹر	۳۲ لاکھ	۸½
میسور	۳۱ لاکھ	۱۰½
جموں وکشمیر	۳۰½ لاکھ	۶۶
گجرات	۲۲½ لاکھ	۸½
تامل ناڈ	۲۰ لاکھ	۵
مدھیہ پردیش	۱۸ لاکھ	۴
راجستھان	۱۸ لاکھ	۷
ہریانہ	۴ لاکھ ۵ ہزار	۴
اڑیسہ	۳ لاکھ ۲۶ ہزار	۱½
دہلی	۲ لاکھ ۶۲ ہزار	۶½
پنجاب	ایک لاکھ ۱۴ ہزار	اعشاریہ ۸
تریپورہ	ایک لاکھ ۱۴ ہزار	۶½
منی پور	۷۱ ہزار	۶½
ہماچل پردیش	پچاس ہزار	۱½
پانڈیچری	۲۹ ہزار	۶
میگھالیہ	۲۶ ہزار	۲½
جزائر لکادیپ	۲۰ ہزار	۹۴

انڈمان نکوبار	۱۱½ ہزار	۱۰
چندی گڈھ	۳ ہزار ۷ سو	۱½
ناگالینڈ	۳ ہزار	اعشاریہ ۵۸
اردناپل پردیش	۸ سو ۴۲	اعشاریہ ۱۸
دادرنگرحویلی	۷ سو ۴۰	۱

آبادی کے لحاظ سے سب سے زیادہ مسلمان اتر پردیش میں ہیں، اس کے بعد بالترتیب بنگال، بہار اور دوسرے صوبے آتے ہیں۔ لیکن تناسب کے لحاظ سے جزائر لکادیپ اول ہے، پھر جموں و کشمیر۔ ان دونوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ان کے بعد آسام اور مغربی بنگال آتے ہیں۔ (۱)

ہندوستان کے نو اضلاع میں مسلمانوں کی تعداد پچاس فیصد سے زیادہ، تیس اضلاع میں بیس اور پچاس فیصد کے درمیان اور ۸۳ اضلاع میں دس سے بیس فیصد تک ہے۔ (۲)

اتر پردیش

اس صوبے میں مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد روہیل کھنڈ اور میرٹھ کے ڈویژنوں میں ہے۔ ۱۹۷۱ء میں روہیل کھنڈ میں مسلمانوں کا تناسب ۲۸ فیصد اور میرٹھ ڈویژن میں ۲۵ فیصد تھا۔ اتر پردیش میں کل ۸۶ ضلعے میں ان میں ضلع رامپور میں ۱۹۷۱ء میں مسلمانوں کا تناسب پچاس فیصد مراد آباد میں ۳۸½، بجنور میں ۳۷، سہارنپور میں ۳۳½، مظفر نگر میں ۲۹، میرٹھ میں ۲۳، اور لکھنؤ میں ۲۳ فیصد تھا۔ کم از کم بارہ شہر اور قصبے ایسے تھے جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور ان کا تناسب ان شہروں میں ۵۵ فیصد سے ۸۱ فیصد تک تھا۔ تقسیم کے بعد ضلعوں کی آبادی کے تناسب میں تو کوئی بڑا فرق نہیں پڑا لیکن اب شہروں میں مسلمانوں کی آبادی کم ہوتی جارہی ہے۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔ (۳)

---

(۱) ۱۹۷۱ء میں صوبوں کی آبادی اور ان میں مسلمانوں کا تناسب ۱۹۷۱ء کی مردم شماری پر مبنی ایک مضمون سے لیا گیا جو رابطہ عالم اسلامی کے ماہنامہ دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ) کی فروری ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔

(۲) جرنل (جدہ یونیورسٹی کے مسلم اقلیتوں کے انسٹی ٹیوٹ کا مجلہ) اشاعت سرما ۱۹۸۰ء و گرما ۱۹۸۱ء کا مشترکہ شمارہ۔ ملاحظہ کیجیے سعید مجید الحسن کا مضمون۔

(۳) ۱۹۷۱ء میں شہروں میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب، جسارت ۷۔ نومبر ۱۹۸۱ء اور دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل فروری ۱۹۸۲ء سے لیا گیا ہے۔

شہر	۱۹۴۱ء میں مسلمان آبادی	۱۹۷۱ء میں مسلمان آبادی
رامپور	۸۱ فیصد	۷۲ فیصد
مرادآباد	۶۱ فیصد	۵۱ فیصد

شہر	۱۹۴۱ء میں مسلمان آبادی	۱۹۷۱ء میں مسلمان آبادی
سہارنپور	۵۵ فیصد	۳۷ فیصد
شاہ جہاں پور	۵۸ فیصد	۴۶ فیصد
میرٹھ	۴۴ فیصد	۳۶½ فیصد
بریلی	۴۴ فیصد	۳۵½ فیصد
علی گڈھ	۴۵ فیصد	۳۳ فیصد
لکھنؤ	۳۸ فیصد	۲۹½ فیصد
آگرہ	۳۲ فیصد	۱۶ فیصد
الہ آباد	۳۱ فیصد	۲۴ فیصد
کانپور	۳۰ فیصد	۲۰ فیصد
بنارس	۳۰ فیصد	۲۶ فیصد

برصغیر پاکستان و ہند میں صوبہ اتر پردیش مسلمانوں کی تہذیب وتمدن کا سب سے بڑا مرکز تھا اور اب بھی ہے۔ یہاں کا چپہ چپہ اسلامی دور کی یادگاروں سے بھرا پڑا ہے۔ فن تعمیر کا شاہکار تاج محل اس صوبے میں ہے۔ آگرہ، فتحپور سیکری، جونپور اور لکھنؤ کی تاریخی عمارتیں اسلامی ہند کے فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں۔ اسی صوبہ کے شہر دیوبند میں دینی تعلیم کا دارالعلوم اور علی گڈھ میں پہلی مسلم یونیورسٹی قائم ہوئی۔ اسلامی ہند کو جس کثرت سے رہنما، عالم، ادیب اور شاعر اس صوبے نے دیئے کسی دوسرے صوبے نے نہیں دیئے۔ اردو زبان کو حقیقی نشوونما اور ترقی اسی صوبہ میں ملی اور یہاں کی اردو سند کی حیثیت رکھتی ہے۔

اتر پردیش میں اعلیٰ دینی تعلیم اور جدید تعلیم کے جو ادارے موجود ہیں ان میں سے چند جو بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ مدرسہ عالیہ نظامیہ، فرنگی محل (لکھنؤ): سب سے قدیم دینی درسگاہ ہے جس کی بنیاد

اٹھارہویں صدی کے آغاز میں پڑی۔

۲۔ دارالعلوم دیوبند (سہارنپور): برصغیر پاکستان و ہند میں دینی تعلیم کا سب سے بڑا ادارہ ہے جس کی بنیاد ۱۸۶۶ء/۱۲۸۳ھ میں پڑی تھی۔

۳۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ): یہ جدید طرز کی دینی درسگاہ ہے۔ جو ۱۸۹۰ء/۱۳۱۶ھ میں قائم کی گئی تھی۔

۴۔ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر (اعظم گڈھ) مشرقی اتر پردیش کی ایک منفرد دینی درسگاہ ہے جہاں کے فارغ التحصیل اصلاحی کہلاتے ہیں۔

۵۔ مسلم یونیورسٹی (علی گڈھ) یہ جدید تعلیم کا ہندوستان میں مسلمانوں کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے۔ ۱۸۷۸ء میں سرسید احمد خاں نے قائم کیا تھا۔

علمی اور تحقیقی اداروں میں ادارہ علوم اسلامیہ (علی گڈھ) جسے ہندوستان کے سابق صدر ڈاکٹر ذاکر حسین نے ۱۹۵۴ء میں قائم کیا تھا، دارالمصنفین (اعظم گڈھ) جو ۱۹۱۴ء سے قائم ہے، انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز (رامپور) جو ۱۹۶۲ء میں قائم ہوا اور انجمن ترقی اردو (علی گڈھ) جو ۱۹۰۳ء سے قائم ہے، اتر پردیش کے مسلمانوں کے بلند پایہ علمی و ادبی ادارے ہیں۔

اتر پردیش میں مسلمانوں کے کئی اہم کتب خانے ہیں۔ ان میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دارالمصنفین، اعظم گڈھ کے کتب خانے بہت بڑے اور اہم ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے ۱۹۸۱ء میں دو سو ہائی سکول تھے۔ ان میں ایک سو انیس صرف اتر پردیش میں تھے۔ ان مدرسوں سے ۱۹۸۱ء میں ۹ ہزار سات سو ۴۶ طلبہ نے میٹرک کا امتحان دیا جن میں سے پانچ ہزار ۴ سو انیس کامیاب ہوئے۔[1]

مغربی بنگال

اتر پردیش کے بعد مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد ریاست بنگال میں ہے۔ ۱۹۴۱ء میں یہاں مسلمانوں کا تناسب ۱۹ فیصد تھا۔ ۱۹۶۱ء میں بیس فیصد ہوا اور اب ۱۹۷۱ء کے مطابق مسلمانوں کی تعداد نوے لاکھ ۶۴ ہزار ہے، یعنی کل آبادی کا ۲۰٪ فیصد۔ مغربی بنگال میں کل ۱۶ اضلاع

(۱) جرنل (مسلمان اقلیتوں کا انسٹی ٹیوٹ) جدہ۔ جلد ۳۔ شمارہ نمبر ۲ (۱۹۸۱ء) مضمون از احمد راشد شروانی۔

ہیں۔ان میں مرشد آباد میں مسلمانوں کا تناسب ۱۹۴۱ء میں ۵۶½ فیصد تھا۔ ضلع ۲۴ پرگنہ میں ۳۲½ فیصد، بیر بھوم میں ۲۷½ فیصد، جلپائی گوڑی میں ۲۳ فیصد اور ضلع کلکتہ میں ۲۳ فیصد مسلمان تھے۔دیناج پور، مالدہ اور ندیا کے اضلاع چونکہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہو گئے تھے اس لیے ان کی آبادی نہیں معلوم ہو سکی۔غالباً اب ان اضلاع میں مسلمانوں کا تناسب ایک تہائی سے کم نہ ہوگا۔

اسلامی دور میں لکھنوتی، جس کو گور بھی کہتے ہیں صوبہ بنگال کا صدر مقام تھا۔اب اس شہر کے کھنڈرات ضلع مالدہ میں پائے جاتے ہیں اور ابتدائی اسلامی دور کے فن تعمیر کے بہترین نمونے یہاں دیکھے جاسکتے ہیں۔عظیم تر بنگال میں اسلام کی اشاعت اسی شہر سے ہوئی۔برطانوی تسلط سے کچھ پہلے شہر مرشد آباد صوبہ کا صدر مقام بن گیا اور جلد ہی مسلمانوں کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔انگریزی اقتدار کے بعد کلکتہ پورے بنگال کا اور ہندوستان کا دارالحکومت قرار دیا گیا اور یہاں فورٹ ولیم کالج کے تحت اردو نثر کی ابتدائی نشوونما ہوئی۔اب کلکتہ ہندو بنگالی تہذیب، ثقافت، بنگالی علم و ادب اور صحافت کا سب سے بڑا مرکز ہے۔مسلمان بنگالیوں کے ادب اور صحافت کا بھی مغربی بنگال میں سب سے بڑا مرکز کلکتہ ہی ہے۔اس کے ساتھ ہی کلکتہ اردو صحافت اور مطبوعات کا مرکز بھی ہے۔یہاں کا مدرسہ عالیہ جو ۱۷۸۰ء میں قائم ہوا تھا، مسلمانوں کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے، جہاں جدید تعلیم دی جاتی ہے۔کلکتہ میں مسلمانوں کا ایک تحقیقی ادارہ بھی ہے جس کا نام مسلم انسٹی ٹیوٹ ہے۔

۱۹۴۱ء میں عظیم تر کلکتہ کی پچاس لاکھ آبادی میں دس لاکھ مسلمان تھے۔۱۹۷۱ء میں کلکتہ کی ستر لاکھ آبادی میں مسلمانوں کا تناسب چودہ اعشاریہ انیس رہ گیا۔کلکتہ کی نواحی بستی گارڈن ریچ میں مسلمانوں کا تناسب ساٹھ فیصد، ہگلی میں تیرہ فیصد اور ہاوڑہ میں دس فیصد ہے۔مغربی بنگال کے شہر آسنسول میں مسلمان ۲۴ فیصد ہیں۔

مغربی بنگال کے شہروں میں قصبوں اور دیہات میں علمائے دیوبند کے قائم کردہ چھوٹے چھوٹے دینی مدرسے کثرت سے ہیں۔

بہار

بہار مسلمانوں کی آبادی کا تیسرا بڑا صوبہ ہے۔۱۹۷۱ء میں یہاں مسلمانوں کی تعداد ۷۶

لاکھ تھی، جو کل آبادی کا ۱۳½٪ فیصد ہے۔ ۱۹۴۱ء میں یہ تناسب تیرہ فیصد تھا اور ۱۹۶۱ء میں ۱۲½٪ فیصد۔ بہار میں کل سترہ ضلعے ہیں۔ ان میں مسلمانوں کی سب سے زیادہ آبادی ضلع پورنیا میں ہے جہاں کا تناسب ۱۹۴۱ء میں بھی چالیس فیصد کے قریب تھا اور اب بھی اتنا ہی ہے۔ شہروں میں ۱۹۴۱ء میں بہار شریف میں مسلمانوں کا تناسب ۳۷ فیصد، کٹہر (پورنیا)، میں تیس فیصد اور صدر مقام پٹنہ میں ۲۴ فیصد تناسب تھا۔ ۱۹۷۱ء میں پٹنہ میں مسلمانوں کا تناسب پندرہ فیصد رہ گیا۔

۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق دوسرے شہروں میں مسلمانوں کا تناسب یہ ہے۔

بھاگلپور تیس فیصد، دربھنگہ ۲۵ فیصد، رانچی ۲۲ فیصد، گیا بیس فیصد، مظفر پور بیس فیصد، مونگیر ۱۵ فیصد اور جمشید پور ۱۴ فیصد۔

پٹنہ جو اسلامی دور میں عظیم آباد کہلاتا تھا، بہار کے مسلمانوں کا علمی اور ثقافتی مرکز ہے۔ یہاں سے اردو کے متعدد اخبار اور رسالے نکلتے ہیں۔ شہر کے نواح میں بانکی پور کی خدا بخش لائبریری عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کا ہندوستان میں ایک بڑا مرکز ہے۔ آزادی کے بعد بہار کی حکومت نے انسٹی ٹیوٹ آف پوسٹ گریجویٹ اسٹڈیز کے نام سے پٹنہ میں ایک ادارہ قائم ہے جس کا مقصد عربی اور فارسی کی کتابوں پر تحقیق کرنا ہے۔

سہسرام صدبہ میں مسلمانوں کا سب سے بڑا تاریخی مرکز ہے۔ یہاں مشہور حکمران شیر شاہ اعظم کا خوبصورت مقبرہ ہے۔

کرالا

صوبہ کرالا میں ۱۹۷۱ء میں مسلمانوں کی تعداد ۴۱ لاکھ ۶۲ ہزار تھی، جو کل آبادی کا ۱۹½٪ فیصد ہوتی ہے۔ ۱۹۲۱ء میں یہ تناسب ۱۸ فیصد تھا۔ کرالا میں کل دس اضلاع ہیں۔ ان میں ضلع مالا بار میں مسلمانوں کا تناسب سب سے زیادہ ہے۔ ۱۹۴۱ء میں اس ضلع میں ۳۳ فیصد مسلمان تھے۔ شہر کالی کٹ میں ۱۹۴۱ء میں ۳۶ فیصد مسلمان تھے لیکن ۱۹۷۱ء میں ان کا تناسب ۳۳ فیصد رہ گیا۔ مالابار کے قصبہ مالپ پورم میں ۱۹۷۱ء میں مسلمانوں کا تناسب ۶۴ فیصد تھا۔

کرالا کے ساحلی علاقہ کا تاریخ اسلام کے ابتدائی دور ہی سے مسلمانوں سے تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ عربوں نے یہاں کالی کٹ اور کولم کی بندرگاہوں میں بستیاں قائم کر لی تھیں جو مقامی باشندوں

میں اشاعت اسلام کا باعث ہوئیں۔ ضلع مالا بار کے مسلمان موپلا کہلاتے ہیں اوران میں عربی خون پایا جاتا ہے۔ کرالا کے مسلمانوں کی زبان ملیالم ہے۔ اس زبان میں ان کے اخبار اور رسالے نکلتے ہیں اوراس میں معقول دینی لٹریچر بھی پایا جاتا ہے۔

آسام

۱۹۴۱ء میں آسام کی ایک کروڑ نو لاکھ آبادی میں ۳۴ لاکھ ۴۷ ہزار مسلمان تھے یعنی کل آبادی کا ایک تہائی۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں ضلع سلہٹ کا بڑا حصہ جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی مشرقی پاکستان میں ملا دیا گیا۔ اس طرح صوبہ آسام میں مسلمانوں کا تناسب کم ہوگیا۔ ۱۹۷۱ء میں صوبہ کی ایک کروڑ ۴۶ لاکھ آبادی میں ۳۵ لاکھ ۹۲ ہزار مسلمان تھے یعنی ۲۴ فیصد۔

اس وقت آسام میں کل دس اضلاع ہیں۔ ان میں ذیل کے چار میں مسلمانوں کا تناسب ۲۹ سے ۴۲½ فیصد تک ہے۔

ضلع	۱۹۴۱ء میں مسلمانوں کا فیصد تناسب	۱۹۷۱ء میں مسلمانوں کا فیصد تناسب
۱۔ گوالپارہ	۴۶	۴۲½
۲۔ کچھار	۳۶	۳۹½
۳۔ نوگانگ	۳۵	۳۹½
۴۔ کامروپ	۳۰	۲۹

ضلع درنگ میں ۱۹۴۱ء میں مسلمانوں کا تناسب صرف سولہ فیصد تھا اور باقی اضلاع میں اس سے بھی کم۔ آسام کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت خصوصاً مذکورہ بالا چار اضلاع کی آبادی بنگالی بولنے والی ہے۔ آسامی بولنے والے مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ صوبہ میں بڑھتی ہوئی بنگالی آبادی کی وجہ سے آسامیوں اور بنگالیوں میں مستقل کشمکش رہتی ہے اور اس کشمکش نے فروری ۱۹۸۳ء کے انتخابات کے موقع پر بنگالیوں کے قتل عام کی شکل اختیار کر لی اور چونکہ بنگالی آبادی کی اکثریت مسلمان ہے اور بے سہارا بھی، اس لیے اس قتل عام میں جس میں چار ہزار افراد مارے گئے اکثریت مسلمانوں ہی کی تھی۔ قتل و غارت کا زیادہ زور ضلع نوگانگ میں رہا۔

مہاراشٹر

یہ صوبہ مرہٹی زبان بولنے والے مرہٹہ باشندوں کا وطن ہے۔ کچھ حصوں میں گجراتی اور اردو بھی بولی جاتی ہے۔ بڑے شہروں میں اردو عام ہے۔ ۱۹۷۱ء میں یہاں مسلمانوں کی تعداد ۴۲ لاکھ ۳۳ ہزار تھی جو کل آبادی کا آٹھ اعشاریہ چار تھے۔ ۱۹۶۱ء میں یہ تناسب ۷½ فیصد تھا۔

صوبہ میں ۲۶ ضلعے ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت کسی ضلع میں بھی نہیں۔ یہاں کا ساحلی علاقہ بھی مالابار کی طرح عہد قدیم میں عرب تاجروں کی آمد و رفت کا مرکز رہا ہے اس لیے ساحلی علاقہ کوکن میں مسلمانوں کا تناسب اندرون صوبہ کی نسبت زیادہ ہے۔ دارالحکومت بمبئی میں ۱۹۷۱ء میں ۵۶½ لاکھ آبادی میں چودہ اعشاریہ بارہ مسلمان تھے۔[1] ۱۹۴۱ء میں یہ تناسب سترہ فیصد تھا۔ اورنگ آباد میں ۱۹۷۱ء میں مسلمانوں کا تناسب ۳۵ فیصد، ناندیڑ میں ۳۶ فیصد، پونا اور ناگپور میں نونو فیصد تھا۔ احمد نگر، دولت آباد اور اورنگ آباد اسلامی دَور کے اہم تاریخی شہر ہیں۔ ساحلی علاقہ میں جنجیرہ مسلمانوں کا اہم مرکز ہے۔ شہر بمبئی کی آبادی کا بڑا حصہ اگرچہ مرہٹی اور گجراتی بولنے والی آبادی پر مشتمل ہے لیکن شہر کی مشترکہ زبان اردو ہے اور یہ شہر اردو علم و ادب اور صحافت کا بڑا مرکز ہے۔ اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی اور اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی مسلمانوں کے دو اہم تحقیقی ادارے ہیں۔ آخر الذکر ادارے سے نوائے ادب کے نام سے ایک سہ ماہی ادبی رسالہ شائع ہوتا ہے۔

آندھرا پردیش

یہ صوبہ سابق ریاست حیدر آباد اور سابق صوبہ مدراس کے تلگو بولنے والے حصوں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق صوبہ کی پانچ کروڑ دس لاکھ آبادی میں چوالیس لاکھ مسلمان ہیں یعنی ۸½ فیصد۔ ۱۹۶۱ء میں یہ تناسب ۷½ فیصد اور ۱۹۷۱ء میں ۸ فیصد تھا۔ شہر حیدر آباد صدر مقام ہے۔ ۱۹۴۱ء میں شہر حیدر آباد کی نصف آبادی مسلمان تھی۔ ۱۹۷۱ء میں یہ تناسب ۳۵ فیصد رہ گیا۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے ابتدائی اعداد و شمار کے مطابق شہر کی ۲۵ لاکھ آبادی میں

(۱) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ) فروری ۱۹۸۲ء

نو لاکھ (۳۶ فیصد) مسلمان ہیں۔ قصبہ کڈپہ میں ۱۹۴۱ء میں ۳۸ ہزار آبادی میں تیرہ ہزار مسلمان تھے۔ کرنول میں مسلمانوں کا تناسب ۳۴ فیصد ہے۔ آندھرا کا ایک اور اسلامی مرکز قصبہ بنگن پلی ہے جس کی سات ہزار آبادی میں ۱۹۴۱ء میں ساڑھے چار ہزار مسلمان تھے۔

حیدر آباد صدیوں تک دکن میں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے اور یہاں اسلامی دور کے آثار قدیمہ کی کثرت ہے۔ شہر حیدر آباد اردو زبان کے اولین مرکزوں میں سے تھا اور ۱۹۴۷ء سے قبل اردو زبان علم و ادب اور تحقیق کا برصغیر میں سب سے بڑا مرکز تھا۔[1] اردو زبان کی پہلی یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ اس شہر میں قائم ہوئی۔ ۱۹۴۸ء میں سقوط حیدر آباد کے بعد جامعہ عثمانیہ ہندوؤں کے بدترین تعصب کا نشانہ بنی۔ ایک خفیہ سازش کے تحت سررشتہ تالیف و ترجمہ کی کتابوں کو نذر آتش کر دیا گیا اور جو جلنے سے بچ گئیں انہیں ردی میں فروخت کر دیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ سے انگریزی کا سہ ماہی تحقیقی مجلہ "اسلامک کلچر" اب بھی نکل رہا ہے۔ اب اگرچہ اسلامی علوم اور اردو ادب کی نسبت سے حیدر آباد کی سابقہ حیثیت برقرار نہیں رہی لیکن اثرات اب بھی باقی ہیں۔ جامعہ عثمانیہ اب بھی قائم ہے لیکن اب وہاں اردو ذریعہ تعلیم نہیں۔ حیدر آباد کے بعض اہم علمی ادارے یہ ہیں:

۱۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ ۱۸۸۸ء میں قائم کیا گیا تھا اور برصغیر کا واحد ادارہ ہے جس نے اپنی عربی مطبوعات کی وجہ سے عالمی شہرت حاصل کی اور نادر اور نایاب عربی کتابوں کو کثرت سے شائع کیا۔

۲۔ ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، حیدر آباد۔

۳۔ مجلس تحقیقات اردو، حیدر آباد۔

۴۔ ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد۔ ۱۹۳۱ء میں قائم ہوا تھا۔ یہاں کے کتب خانہ میں پانچ ہزار قلمی نسخے اور ۲۵ ہزار مطبوعہ کتابیں ہیں۔ ۱۹۴۱ء سے اردو انسائیکلو پیڈیا پر کام جاری ہے۔

حیدر آباد کا کتب خانہ آصفیہ اسلامی دنیا کے عظیم کتب خانوں میں سے ہے جس میں کئی ہزار عربی اور فارسی مخطوطات موجود ہیں۔ اگرچہ حیدر آباد میں مسلمانوں کا اقتدار ختم ہو گیا ہے

---

(۱) حیدر آباد کی تاریخ کے لیے دیکھیے ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ حصہ دوم کا باب نمبر ۱۳ اور باب نمبر ۲۰ کے حواشی۔

لیکن حیدر آباد، اب بھی دہلی، لکھنؤ اور بمبئی کے ساتھ اردو صحافت اور مطبوعات کے چار سب سے بڑے مرکزوں میں سے ہے۔

میسور

۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق صوبہ میسور میں اکتیس لاکھ تیرہ ہزار مسلمان (۱۰½ فیصد) ہیں۔ سرنگا پٹم، گلبرگہ، بیجاپور، دھاروار، بیدر اور سرا اس صوبے میں مسلمانوں کے اہم تاریخی مقامات ہیں۔[۱] ریاست کی زبان کنٹری ہے لیکن مسلمان آبادی عام طور پر اردو بولتی ہے۔ ۱۹۴۱ء میں بیجاپور میں مسلمانوں کا تناسب تیس فیصد تھا۔ ۱۹۷۱ء میں گلبرگہ کی ۴۲ فیصد، بیجاپور کی ۳۳ فیصد اور بلاری کی تیس فیصد آبادی مسلمان تھی۔

جموں و کشمیر

تفصیل کے لیے دیکھیے، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، حصہ دوم، باب نمبر ۱۱

گجرات

۱۹۷۱ء میں گجرات میں مسلمانوں کی تعداد ۲۲ لاکھ پچاس ہزار تھی جو کل آبادی کا ½ ۸ فیصد تھے۔ زبان گجراتی بولی جاتی ہے اور احمد آباد صدر مقام ہے۔ مسلمان دینی تعلیم اردو میں حاصل کرتے ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں یہاں کے بعض شہروں اور قصبوں میں مسلمانوں کا تناسب حسب ذیل تھا۔

احمد آباد ½ ۱۹ فیصد، سورت بیس فیصد، جونا گڈھ ۴۰ فیصد، ویراول ۴۳ فیصد، منگرول پچاس فیصد

۱۳۹۶ء/۷۹۸ھ سے ۱۵۷۲ء/۹۸۰ھ تک گجرات میں مسلمانوں کی ایک خود مختار حکومت قائم تھی، جس کے تحت علم و ادب اور فنون کو تیزی سے ترقی ہوئی۔ احمد آباد کا شہر آباد ہوا اور اس میں شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں۔[۲] پھر تیموری دور میں صنعت و حرفت اور تجارت نے بڑی ترقی کی۔ جونا گڈھ کی ریاست جہاں کے نواب نے ۱۹۴۷ء میں پاکستان سے ریاست کا الحاق

---

(۱) میسور کی اسلامی تاریخ کے لیے ملاحظہ کیجیے ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ حصہ دوم باب نمبر ۲۸

(۲) ملاحظہ کیجیے ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، حصہ دوم، باب نمبر ۱۳۔

کیا تھا، گجرات ہی میں ہے۔ ۱۹۴۱ء میں اس ریاست میں مسلمانوں کا تناسب ۴۴ فیصد تھا۔

گجرات کے مسلمان تجارت پیشہ ہیں۔ ان کی ایک بڑی تعداد میمن، خوجہ اور بوہرہ ہے۔

گجرات میں ڈھابیل کے مقام پر دینی تعلیم کا ایک ممتاز ادارہ ہے۔ جس میں تقسیم سے قبل مولانا شبیر احمد عثمانی درس دیتے تھے۔ گجرات میں احمد آباد، سورت، گودھرا اور بڑودہ کے مسلمان اکثر ہندوؤں کے تشدد کا نشانہ بنتے رہتے ہیں۔

تامل ناڈو

یہ صوبہ سابق مدراس کے تامل زبان بولنے والے علاقوں پر مشتمل ہے۔ ۱۹۷۱ء میں مسلمانوں کی تعداد اکیس لاکھ تھی، جو پوری آبادی کا پانچ فیصد ہوتی ہے۔ ۱۹۴۱ء میں دارالحکومت مدراس میں مسلمانوں کا تناسب بارہ فیصد تھا۔ ۱۹۷۱ء میں کل ۲۴ لاکھ ستر ہزار آبادی میں صرف ۸½ فیصد مسلمان تھے۔ صوبہ تامل ناڈو میں ارکاٹ مسلمانوں کا اہم تاریخ مرکز تھا۔ لیکن ۱۹۴۱ء میں وہاں کی ۱۶½ ہزار آبادی میں مسلمان صرف دو ہزار تھے۔ ایک دوسرے شہر مدورا میں ۱۹۷۱ء کے مطابق مسلمانوں کا تناسب ۷½ فیصد ہے۔

مدراس کے مسلمان تجارت پیشہ ہیں، اور ان کے رفاہی کاموں میں دل کھول کر حصہ لیتے ہیں۔ چمڑے کے کاروبار پر مسلمانوں کی اجارہ داری ہے۔ تامل ناڈو میں اردو مسلمانوں کی عام زبان ہے اگرچہ وہ تامل اور انگریزی بھی عام طور پر بولتے اور سمجھتے ہیں۔

مدھیہ پردیش

۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق مدھیہ پردیش میں اٹھارہ لاکھ پندرہ ہزار مسلمان ہیں، جو کل آبادی کا چار اعشاریہ ۳ ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز بھوپال ہے جو ۱۹۴۷ء تک ایک مسلمان ریاست کی تھی۔ ۱۹۴۱ء میں ریاست بھوپال کی ایک لاکھ ۳۹ ہزار آبادی میں ۶۷ ہزار (یعنی نصف) مسلمان تھے اور شہر بھوپال کی ۷۵ ہزار آبادی میں ۴۷ ہزار (۶۲ فیصد) مسلمان تھے۔ بھوپال اب صوبہ کا دارالحکومت بن گیا ہے اور ۱۹۷۱ء میں وہاں مسلمانوں کا تناسب ۲۳½ فیصد رہ گیا ہے۔ حیدرآباد کی طرح یہاں بھی مسلمان پرانے شہر میں محدود ہو کر رہ گئے ہیں اور نئے محلے مسلمانوں سے خالی ہیں۔ برہانپور کے تاریخی شہر میں مسلمانوں کا تناسب

۴۵ فیصد اور جبلپور میں بارہ فیصد ہے، (۱۹۷۱ء) بھوپال میں نوابوں کے کئی شاندار محل اور ایک خوبصورت اور وسیع جامع مسجد ہے جو دہلی کی جامع مسجد کے نمونے پر ہے۔ بھوپال کا کتب خانہ حمیدیہ، ہندوستان کے اچھے کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اور اس میں عربی، فارسی اور اردو کتابوں کی کثرت ہے۔

سلطنت دہلی کے زوال کے بعد مالوہ اور خاندیس کی مسلم ریاستیں اسی صوبے میں قائم ہوئی تھیں۔[1] مالوہ کا صدر مقام اور تاریخی شہر مانڈو اور اسیر گڈھ کا مشہور قلعہ بھی اسی صوبے میں ہے۔

راجستھان

۱۹۷۱ء میں اس صوبے میں مسلمانوں کی تعداد سترہ لاکھ ۷۸ ہزار تھی جو کل آبادی کا تقریباً سات فیصد ہوتی ہے۔ ۱۹۴۱ء میں راجستھان کے بڑے شہروں میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب حسب ذیل تھا:

جے پور (صدر مقام) ۳۰ فیصد، اجمیر ۳۳ فیصد، بیکانیر ۱۸ فیصد، الور ۲۸ فیصد، ٹونک ۷۵ فیصد اور بھرتپور ۳۵ فیصد۔

۱۹۷۱ء میں جے پور میں مسلمانوں کا تناسب اٹھارہ اعشاریہ ۷ فیصد اور اندور میں بارہ اعشاریہ چار تھا۔ باقی شہروں کا تناسب معلوم نہ ہوسکا۔

ممتاز بزرگ اور ولی اللہ شیخ معین الدین کے مزار کی وجہ سے شہر اجمیر کو ملک گیر تقدس کی حیثیت حاصل ہے اور درگاہ کی زیارت کے لیے ہندو اور مسلمان سب آتے ہیں۔ راجستھان میں مسلمانوں کا دوسرا بڑا مرکز ٹونک ہے جو تقسیم سے پہلے ایک مسلم ریاست تھی۔

دہلی

دہلی، ہندوستان کا دارالحکومت ہے اور مرکزی حکومت کے تحت ایک صوبہ بھی ہے۔ ۱۹۶۱ء میں صوبہ دہلی کی ۲۶ لاکھ آبادی میں ایک لاکھ پچپن ہزار مسلمان تھے اور ۱۹۷۱ء میں ان کی تعداد دو لاکھ ۶۳ ہزار ہوگئی جو کل آبادی کا 6½ فیصد ہوتے ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل پرانی دہلی میں

---

(۱) دیکھیے ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ حصہ دوم باب نمبر ۱۳۔

مسلمان کل آبادی کا تقریباً نصف تھے اور صوبہ کے دیہی علاقوں میں بھی ان کی آبادی ایک تہائی کے لگ بھگ تھی۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں مسلمان بستیاں اجڑ گئیں اور مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد ہجرت کر کے پاکستان چلی گئی اور اب مسلمان آبادی جامع مسجد سے ملحق ایک مختصر علاقہ میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ دہلی صدیوں تک اسلامی ہند کا دارالسلطنت رہا اور یہاں کے چپہ چپہ پر اسلامی دَور کے آثار موجود ہیں جن میں جامع مسجد، لال قلعہ، قطب مینار اور ہمایوں کا مقبرہ سرفہرست ہیں۔ جیسی عظیم ہستیاں یہاں کی خاک سے پیدا ہوئیں اسلامی ہند کے کسی دوسرے شہر میں پیدا نہیں ہوئیں۔ صدیوں تک یہ شہر اسلامی علوم وفنون، ادب اور تہذیب وتمدن کا مرکز رہا۔ اور آج بھی جبکہ یہاں کے مسلمان اُجڑ چکے ہیں، یہ شہر اسلامی علوم، صحافت اور نشر واشاعت کتب کے سب سے بڑے مرکزوں میں سے ایک ہے۔

دہلی میں مسلمانوں کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے۔ علی گڈھ کے بعد یہ مسلمانوں کی دوسری یونیورسٹی ہے جہاں جدید تعلیم دی جاتی ہے۔ یہاں مکتبہ جامعہ کے نام سے کتابوں کی نشر واشاعت کا ایک ادارہ بھی ہے جو برصغیر پاکستان وہند میں اردو کتابوں کی اشاعت کے سب سے بڑے اداروں میں سے ایک ہے۔ مکتبہ کی طرف سے جامعہ کے نام سے ایک معیاری ماہنامہ، بچوں کے لیے ''پیام تعلیم'' کے نام سے ایک ماہنامہ اور کتابوں کی اشاعت سے متعلق ایک جریدہ کتاب نما بھی شائع ہوتا ہے۔ جامعہ ملیہ کا کتب خانہ اپنے ذخیرۂ کتب کی وجہ سے برصغیر کے ممتاز کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔

جامعہ ملیہ میں وہاں کے شیخ الجامعہ اور ہندوستان کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے نام پر ''ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز'' کے نام سے ایک تحقیقی ادارہ بھی قائم کیا گیا ہے جہاں سے ''اسلام اینڈ ماڈرن ایج'' کے نام سے ایک سہ ماہی تحقیقی رسالہ بھی شائع ہوتا ہے۔

تحقیقی اداروں میں سب سے ممتاز ''ندوۃ المصنفین'' ہے۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں اس کے کتب خانہ اور کتابوں کو آگ لگا دی گئی تھی۔ لیکن اب یہ ادارہ بھرپور قوت سے کام کر رہا ہے اور شمالی ہند میں دارالمصنفین اعظم گڈھ کے بعد اسلامی موضوعات پر کتابوں کی اشاعت کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔

دہلی میں مسلمانوں کا تیسرا بڑا علمی ادارہ معارف اسلامیہ تغلق آباد ہے۔ یہ ہمدرد نیشنل

فاؤنڈیشن کے حکیم عبدالحمید نے ۱۹۶۰ء میں تعلیم وتحقیق کے فروغ کے لیے قائم کیا ہے۔ اس کے کتب خانہ میں ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں اور عربی فارسی کے چھ ہزار قلمی نسخے ہیں۔

جماعت اسلامی ہند کا مرکزی مکتبہ بھی اسلامی موضوعات پر کتابوں کی اشاعت کا دہلی میں ایک اہم مرکز ہے۔ جماعت کی طرف سے اردو ماہنامہ ''زندگی نو'' کے علاوہ ایڈیئنس (radiance) کے نام سے انگریزی کا ایک پندرہ روزہ جریدہ بھی شائع کیا جاتا ہے۔ دہلی میں اردو کے کئی روزنامے بھی شائع ہوتے ہیں لیکن ان کا معیار پست ہے۔

سری لنکا

سری لنکا کا رقبہ ۲۵ ہزار مربع میل اور آبادی (۱۹۸۱ء) ایک کروڑ ۴۹ لاکھ ہے۔ کولمبو دارالحکومت ہے۔ نسلی اعتبار سے سری لنکا کے ۷۲ فیصد باشندے مقامی سنہالی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ بیس فیصد باشندے تامل ہیں جو جنوبی ہند سے آ کر آباد ہوئے اور سات فیصد مور یعنی عربی النسل مسلمان ہیں۔ مذہبی لحاظ سے ۶۹ فیصد بودھ، ½7 فیصد مسلمان اور ½7 فیصد عیسائی ہیں اور سولہ فیصد ہندو ہیں۔[۱] ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ۱۹۶۳ء میں عیسائیوں کی تعداد ۸ لاکھ ۸۴ ہزار تھی جب کہ مسلمانوں کی تعداد ۷ لاکھ ۲۴ ہزار تھی، لیکن ۱۹۸۱ء کی مردم شماری میں مسلمانوں کی تعداد گیارہ لاکھ ۴۳ ہزار ہوگئی جب کہ عیسائی آبادی گیارہ لاکھ گیارہ ہزار ہے۔ گویا اب مسلمان ملک کی تیسری بڑی اقلیت ہو گئے ہیں۔ ستر ہزار کے قریب مسلمان ہندوستانی اور میلے ہیں، باقی سب قدیم مسلمان ہیں جن کو پرتگالیوں نے مور کا نام دیا تھا۔

سری لنکا سے مسلمانوں کا تعلق پہلی صدی ہجری میں قائم ہو گیا تھا۔ ہندوستان کے مغربی ساحل کی طرح عربوں نے سری لنکا کے ساحل پر بھی بستیاں قائم کر لی تھیں۔ یہ عرب ظہور اسلام سے پہلے سے تجارت کے سلسلہ میں آباد ہو گئے تھے۔ سندھ پر محمد بن قاسم کے حملے کی سب سے بڑی وجہ سری لنکا میں آباد مسلمان ہی تھے جن کے جہاز کو سندھ کے ساحل پر راجہ داہر کے آدمیوں نے لوٹ لیا تھا۔

عرب سری لنکا کو سراندیپ اور سیلان کہتے تھے۔ یہی لفظ انگریزی میں سیلون بن گیا۔ چونکہ یہ جزیرہ قیمتی پتھروں کی وجہ سے مشہور تھا اس لیے عرب اس کو یاقوت کا جزیرہ بھی کہتے تھے۔[۲]

۱۵۰۵ء میں پرتگالی پہلی مرتبہ سری لنکا آئے تو انہوں نے مسلمانوں کو مور کا نام دیا،

(۱) سٹیٹسمین ایر بک ۸۳۔ ۱۹۸۲ء

(۲) اردو دائرہ المعارف اسلامیہ، لاہور جلد گیارہ مقالہ ''سیلان'' اس موضوع پر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے انگریزی ایڈیشن میں زیادہ تفصیل ہے۔ نیز ملاحظہ کیجیے سید سلیمان ندوی کی ''عرب و ہند کے تعلقات''

حالانکہ مسلمان اس نام سے ناآشنا تھے۔ یہ مسلمان تجارت پیشہ تھے اور اس میدان میں پرتگالیوں کے حریف تھے۔ ۱۶۵۸ء میں ولندیزوں نے پرتگالیوں کو جو مغربی اور جنوبی ساحل پر قابض ہوگئے تھے بے دخل کر دیا۔ ۱۷۹۶ء میں انگریزوں نے ولندیزوں کو بے دخل کر دیا اور بتدریج پورا جزیرہ فتح کرلیا۔ ۴۔فروری ۱۹۴۸ء تک جب کہ سری لنکا کو آزادی ملی انگریز سری لنکا پر قابض رہے۔ان کے زمانے میں بھی مسلمانوں کو مور کہا جاتا رہا۔

سری لنکا کے مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے۔حج پر جانے والوں کی تعداد پچاس اور ڈھائی سو کے درمیان رہتی ہے۔تعداد میں یہ کمی زرمبادلہ کی کمی کی وجہ سے ہے۔ملک میں اسلامی شخصی قانون نافذ ہے اور قاضیوں کی عدالتیں قائم ہیں۔موتمر عالم اسلامی کراچی کی اطلاع کے مطابق مسجدوں کی تعداد تقریباً دو ہزار ہے۔کولمبو میں جامع مسجد ہے۔قصبہ بیرو والا میں جو کولمبو کے جنوب میں ۳۴ میل کے فاصلے پر مغربی ساحل پر واقع ہے مسلمانوں کی اکثریت ہے اور یہاں کی مسجد ملک کی مشہور زیارت گاہ ہے۔

مسلمان تامل اور سنہالی زبانیں بولتے ہیں۔اکثریت کی زبان تامل ہے۔قرآن مجید کے تامل ترجمے ہندوستان سے درآمد ہوتے ہیں۔قرآن مقامی طور پر چھپتا ہے اور باہر سے بھی درآمد ہوتا ہے۔سنہالی زبان میں بھی قرآن کا ترجمہ ہوگیا ہے۔یہ ترجمہ مورس (moors) اسلامک کلچر ہوم کے زیر اہتمام بیس سال میں مکمل ہوا ہے۔[1] انگریزی، تامل اور سنہالی میں اسلام پر کتابوں کی بہت کمی ہے۔مولانا مودودی کے رسالہ دینیات کا ۱۹۷۳ء میں سنہالی زبان میں ترجمہ ہوگیا ہے۔

قرآن پڑھانے کے لیے قرآنی مدرسے قائم ہیں جن کو پلی کودم (palli koodam) کہا جاتا ہے۔حکومت کی طرف سے مسلمانوں کے لیے مدرسے قائم کیے جاتے ہیں جن میں مذہبی تعلیم لازمی ہے۔ایسے سرکاری مدرسوں کی تعداد ۱۹۷۶ء میں پانچ سو تھی۔

سیلون اسلامک انسٹرکشن سوسائٹی نے احدیہ مدرسے قائم رکھے ہیں جہاں اتوار کو بچوں کو دینی تعلیم دی جاتی ہے۔علماء کی تعلیم کے لیے دس دارالعلوم ہیں۔اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے طلبہ کو جامعہ ازہر اور مدینہ کی اسلامی یونیورسٹی میں بھیجا جاتا ہے۔عورتوں کے لیے بھی ایک عربی کالج ہے

---

(۱) دنیا کی مسلمان اقلیتیں (انگریزی) شائع کردہ موتمر عالم اسلامی، کراچی ۱۹۷۶ء

جہاں خواتین کو ''مولوی'' بنایا جاتا ہے۔ اس مدرسہ کی خواتین مسلمانوں کے سرکاری مدرسوں میں مدرس ہوتی ہیں۔ (۱)

مسلمانوں نے جدید تعلیم کے کئی کالج بھی قائم کیے تھے، لیکن سری لنکا میں سوشلسٹ حکومت کے قیام کے بعد ظاہرہ کالج کے علاوہ باقی تمام مدرسے قومی ملکیت میں لے لیے گئے ہیں۔ نالیمیہ (naleemiya) انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز ملک کا ایک رسالہ ''چنتا نائے (chinthanai) یعنی اسلامی فکر کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ (۲)

سری لنکا کی سیاسی زندگی میں بھی مسلمان موثر کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان کو پارلیمنٹ میں اور کابینہ میں نمائندگی حاصل ہے۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی اور پرانی سیاسی جماعت ''مسلم لیگ'' ہے۔ ڈاکٹر ٹی۔ بی۔ جایا مرحوم مسلم لیگ کے ممتاز رہنما تھے اور کئی سال اس کے صدر رہے۔ وہ پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے اور ظاہرہ کالج کے پرنسپل بھی۔ وہ پاکستان بننے کے بعد یہاں سری لنکا کے پہلے سفیر مقرر کیے گئے تھے۔

کچھ عرصہ سے سری لنکا میں جماعت اسلامی بھی قائم ہوگئی ہے۔ مورس اسلامک کلچر ہاؤس، کل سیلون مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، اسلامک سکرٹریٹ، جمعیۃ العلماء، ینگ مسلم ایسوسی ایشن اور ینگ ویمنز ایسوسی ایشن مسلمانوں کی دوسری جماعتیں اور ادارے ہیں۔

---

(۱) دنیا کی مسلمان اقلیتیں (انگریزی) کراچی ۱۹۷۷ء

(۲) ہفت روزہ ''مسلم ورلڈ'' کراچی ۲۸۔ نومبر ۱۹۸۱ء

افریقہ

کینیا

کینیا کا رقبہ دو لاکھ ۲۴ ہزار مربع میل (۵ لاکھ ۸۲ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) ایک کروڑ ۵۸ لاکھ ہے۔ نیروبی دارالحکومت ہے۔

چند ہزار عربوں اور ایشیائی باشندوں کے علاوہ ملک کی ساری آبادی سیاہ فام افریقی نسل سے ہے۔ موجودہ صدی میں برطانوی دور میں عیسائیت کو بہت تیزی سے فروغ ملا ہے اور عیسائی تبلیغی اداروں کا دعویٰ ہے کہ کینیا کی پچاس سے ساٹھ فیصد تک آبادی عیسائی ہو چکی ہے، لیکن اسٹیٹسمین ایئر بک ۱۹۸۲ء۔ ۱۹۸۳ء میں عیسائیوں کی تعداد صرف ۲۵ لاکھ بتائی گئی ہے جو آبادی کا صرف سولہ فیصد ہوتی ہے۔ عیسائی تبلیغی ادارے مسلمانوں کا تناسب تین اور آٹھ فیصد کے درمیان بتاتے ہیں لیکن مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ملک کی ایک تہائی آبادی مسلمان، ایک تہائی عیسائی اور باقی مظاہر پرست ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت یا تو ساحلی علاقے میں آباد ہے یا شمالی مشرقی صوبہ میں جہاں کی ایک تہائی آبادی صومالی نسل کے باشندوں پر مشتمل ہے۔

۱۹۵۸ء میں بندرگاہ ممباسہ کی ایک لاکھ ۳۴ ہزار آبادی میں ۵۶ ہزار عیسائی اور پچاس ہزار (یعنی چالیس فیصد) مسلمان تھے۔ شہری افریقی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب ۲۲½ فیصد تھا اور ایشیائی آبادی میں ۴۲ فیصد۔ ۱۹۶۸ء میں کئی ہزار ایشیائی باشندے جن کے پاس برطانوی پاسپورٹ تھے ملک سے نکال دیئے گئے، ان میں ایشیائی مسلمان بھی شامل تھے۔ ممباسہ میں مسجدوں کی تعداد ۴۹ ہے۔ ان میں مندھری مسجد سب سے پرانی ہے اور ۱۵۷۰ء کی تعمیر ہے۔[1]

دارالحکومت نیروبی مسلمانوں کا دوسرا بڑا مرکز ہے۔ ۱۹۶۲ء میں نیروبی کی آبادی دو لاکھ

(۱) کینیا کے اسلامی دور کی تاریخ کیلئے دیکھئے، ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، حصہ دوم، باب نمبر ۱۹ اور باب نمبر ۳۵۔

٦٦ ہزار تھی جن میں ½ ٢١ ہزار یوروپی اور ½ ٨٦ ہزار ایشیائی تھے۔ [1]

اگرچہ ایشیائی باشندوں کی ایک تعداد ١٩٦٨ء میں ملک چھوڑ کر چلی گئی لیکن وہ نیروبی میں اب بھی اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں جامع مسجد نیروبی اور جامع شیخ جندانی شاندار مسجدیں ہیں۔ جامع مسجد نیروبی سے ملحق سعودی عرب کا دارالافتاء قائم ہے جو اسلامی معاملات میں مسلمانوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ [2] نیروبی اور ممباسہ میں احمدیوں کی مسجدیں بھی ہیں۔

کینیا میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ اسلامی شخصی قوانین نافذ ہیں اور قاضیوں کی عدالتیں قائم ہیں لیکن ١٩٨٢ء کے اوائل میں ایک بل تیار کیا گیا تھا جس کے تحت مسلمانوں کے شخصی قوانین میں مداخلت کی جاسکتی تھی۔ [3] ہر سال چھ سو سے آٹھ سو تک مسلمان حج کو جاتے ہیں۔ سرکاری مدرسوں میں بھی اسلامی تعلیم کا انتظام ہے جس کی وجہ سے نوے فیصد بچے بنیادی اسلامی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ دینی مدرسے بھی موجود ہیں۔ لیکن اعلیٰ تعلیم میں مسلمان پیچھے ہیں جس کی وجہ سے سیاسی اور معاشی زندگی میں ان کو اہمیت حاصل نہیں۔

کینیا میں ہر قبیلہ کی الگ زبان ہے۔ لیکن سواحلی زبان جس میں ٢٥ فیصد الفاظ عربی کے ہیں، مشترکہ زبان ہے۔ ملک میں انگریزی اور سواحلی دونوں کو سرکاری حیثیت حاصل ہے۔ ١٩٥٣ء میں احمدیوں نے قرآن کا سواحلی زبان میں ترجمہ کیا تھا، لیکن اب کینیا کے ممتاز شافعی عالم قاضی عبداللہ صالح فارسی مرحوم نے سواحلی زبان میں مستند ترجمہ کیا ہے۔ دوسری مقامی زبانوں میں بھی قرآن کے ترجمے شائع ہو رہے ہیں۔

کینیا میں مسلمانوں کی حسب ذیل جماعتیں سرگرم ہیں: (١) مشرقی افریقہ کی مسلم ویلفیر سوسائٹی (٢) مشرقی افریقہ کی مسلم کانگریس (EAMC) (٣) سپریم کونسل آف کینیا مسلمز، یہ سب سے بڑی تنظیم ہے اور ملک کی تمام تنظیمیں اس سے ملحق ہیں اور اس کو سرکاری سرپرستی حاصل ہے۔ ١٩٦٣ء سے اسلامک فاؤنڈیشن بھی قائم ہے جس کا لسٹر (انگلستان) کی اسلامک فاؤنڈیشن سے تعلق ہے۔

---

(١) اسٹیٹسمین ایر بک ٧٠-١٩٦٩ء-١٩٧١ء

(٢) روزنامہ ''جسارت'' کراچی۔ ١٥۔ مئی ١٩٨٢ء

(٣) دی کریسنٹ (انگریزی) کینڈا۔ ١٦۔ ٢٨۔ فروری ١٩٨٢ء

یوگنڈا

یوگنڈا کا رقبہ ۹۱ ہزار مربع میل (۲ لاکھ ۳۶ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۷۹ء) ایک کروڑ ۳۲ لاکھ ہے۔ دارالحکومت کمپالا ہے۔ یوگنڈا ۶۸ سال برطانیہ کی محکومی میں رہنے کے بعد ۹۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو آزاد ہوا۔ ۱۹۷۱ء میں یوگنڈا کی فوج کے ایک مسلمان افسر عیدی امین نے حکومت پر قبضہ کرلیا۔ عیدی امین کی حکومت مارچ ۱۹۷۹ء تک قائم رہی، پھر تنزانیہ نے مغربی ملکوں کی درپردہ حمایت سے یوگنڈا پر حملہ کر کے عیدی امین کو بے دخل کر دیا۔

یوگنڈا میں عربوں کی کوششوں سے انیسویں صدی میں اسلام پھیلنا شروع ہوا اور اس صدی کے وسط میں یہاں کی سب سے بڑی بادشاہت یوگنڈا (Buganda) کے حکمران نے اسلام قبول کرلیا، لیکن اسے لوگوں نے تخت سے ہٹا دیا۔ ۱۸۹۴ء میں برطانیہ نے یوگنڈا پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد مسیحی مبلغ بڑی تعداد میں یوگنڈا پہنچ گئے اور عیسائیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ برطانوی حکومت نے ان کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کی تاکہ اسلام کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی جائیں۔ یوگنڈا کے ایک دانشور ڈاکٹر عمر حسن کسولے (Kasule) نے سرکاری کاغذات کے حوالے سے یوگنڈا کے برطانوی گورنر جانسن کی ایک ہدایت نقل کی ہے جس میں ۱۹۰۰ء میں گورنر نے لکھا تھا کہ ''یہ بات برطانوی حکومت کے مفاد میں نہیں ہے کہ لوگ اتنی زیادہ تعداد میں مسلمان ہوں کہ ہمیں سنبھالنا مشکل ہو جائے کیونکہ مسلمان مسیحی حکومت کے ہمیشہ خلاف رہتے ہیں''۔[1]

برطانوی حکومت کی ان تمام کوششوں کے باوجود ڈاکٹر عمر حسن کسولے کی تحریر کے مطابق وسطی صوبہ یوگنڈے میں عیسائیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی آبادی ۱۹۱۱ء اور ۱۹۵۰ء کے

(۱) ماہنامہ یونیورسل میسیج، کراچی۔ فروری ۱۹۸۱ء۔ ڈاکٹر عمر حسن کسولے کا مضمون۔

درمیان تین گناہ زیادہ بڑھی اور ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۵ء کے درمیان مسلمانوں کی آبادی میں پندرہ فیصد اضافہ ہوا جبکہ عیسائی آبادی میں صرف نو فیصد اضافہ ہوا۔[۱]

افریقہ کے بیشتر ملکوں کی طرح یوگنڈا میں مسلمانوں کی صحیح تعداد معلوم کرنے کا کوئی مستند ذریعہ نہیں ہے۔ مسیحی ذرائع مسلمانوں کی تعداد صرف پانچ فیصد بتاتے ہیں اور عیسائیوں کا تناسب پچاس فیصد تک بتاتے ہیں۔ لیکن یوگنڈا کے مسلمانوں کا بیان اس سے قطعی مختلف ہے۔ موتمر عالم اسلامی، کراچی کے سکرٹری جنرل ڈاکٹر انعام اللہ خاں جب جولائی ۱۹۵۵ء میں یوگنڈا گئے تھے تو شہزادہ بدروے نے جو یوگنڈا کے پہلے مسلمان بادشاہ کے بھانجے ہیں، ان کو بتایا تھا کہ یوگنڈا میں مسلمانوں کی تعداد ۲۵ فیصد ہے۔ اس کے بعد جب انعام اللہ خان دوبارہ ۱۹۷۱ء میں یوگنڈا گئے تو صدر عیدی امین نے ان کو بتایا کہ یوگنڈا میں مسلمانوں کی تعداد کم از کم ۳۵ سے ۴۰ فیصد تک ہے۔[۲]

موتمر عالم اسلامی کے کتابچہ کے مطابق مسلمان کمپالا، یومبو، مساکا، (Masaka) جنجا، بوسوگا، بوکیدی اور ان کے نواحی علاقوں میں زیادہ آباد ہیں، مسجدوں کی تعداد دو ہزار سے زیادہ ہے۔ ہر سال تقریباً دو ہزار افراد حج کرتے ہیں اور ملک میں اسلامی شخصی قانون نافذ ہے۔ قرآن مجید آسانی سے دستیاب ہے۔ شیخ عبدالرزاق کی سربراہی میں علماء کی ایک جماعت یوگنڈا زبان میں جو ملک کی سب سے بڑی زبان ہے قرآن کا ترجمہ کر رہی ہے۔ ۱۹۷۷ء میں اسلامی تعلیم کے دو بڑے مرکز تھے۔ ایک اسلامک انسٹی ٹیوٹ اور دوسرا بوگمبے اسلامک انسٹی ٹیوٹ۔ ان کے علاوہ مسلمانوں کے دو ہائی اسکو بھی تھے جن میں دینی تعلیم کا انتظام تھا۔ کمپالا میں یونیورسٹی ہے لیکن اس میں مسلمان طلبہ بہت کم ہیں۔[۳]

صدر عیدی امین کے زمانے میں سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب ۲۵ فیصد اور فوج میں پچاس فیصد تھا۔[۴] اب معلوم نہیں کیا صورت ہے۔ صدر عیدی امین کی حکومت ختم

---

(۱) ماہنامہ یونیورسل میسج، کراچی۔ فروری ۱۹۸۱ء۔ ڈاکٹر عمر حسن کسولے کا مضمون۔

(۲) ماہنامہ "دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل" مکہ۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء

(۳) مسلمان اقلیتیں (انگریزی) موتمر عالم اسلامی، کراچی۔

(۴) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل، مکہ۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء

ہوتے ہی مسلمان پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ نئی حکومت کی جابرانہ پالیسی کی وجہ سے ایک لاکھ افراد سوڈان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے، جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ جولائی ۱۹۸۰ء اور جولائی ۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر عمر حسن کسولے کی قیادت میں یوگنڈا میں مسلمان نوجوانوں کے کامیاب اجتماع ہوئے، جن میں دوسرے اسلامی ملکوں کے نمائندوں نے بھی حصہ لیا تھا۔ [1] ان اجتماعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ صدر عیدی امین کے بعد مسلمانوں پر سختی کا جو دور آیا تھا وہ اب گزر گیا ہے۔

یوگنڈا میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم ''یوگنڈا مسلم سپریم کونسل'' ہے جو تعلیمی اور رفاہی خدمات انجام دیتی ہے۔ شیخ قاسم مولسبا جو یوگنڈا کے چیف قاضی ہیں کونسل کے سربراہ ہیں۔ نائب قاضی شیخ علی کیومبی (Kivambi) کونسل کے جنرل سکرٹری ہیں اور شیخ عبدالرزاق موتودو (Motovo) کونسل کے رکن ہیں۔ [2]

---

(۱) اجتماعات کی تفصیل کے لیے دیکھیے ماہنامہ ''یونیورسل میسج'' کراچی۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء اور نومبر ۱۹۸۱ء

(۲) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل، مکہ۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء

رُوانڈا اور بُرونڈی

رُوانڈا

تنزانیہ اور زائرے کے درمیان ایک چھوٹا سا ملک ہے جس کا رقبہ دس ہزار مربع میل (۲۶ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) ۵۱ لاکھ ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں جرمنی قابض ہوگیا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد بلجیم کو تولیت ملی۔ یکم جولائی ۱۹۶۲ء کو آزادی حاصل کی۔ مسیحی ذرائع کے مطابق ۵۴ فیصد آبادی عیسائی ہے اور مسلمانوں کا تناسب صرف ایک فیصد ہے۔ کیگالی صدر مقام ہے۔

بُرونڈی

بُرونڈی کا ملک روانڈا کے جنوب میں واقع ہے۔ رقبہ تقریباً گیارہ ہزار مربع میل (۲۷ ہزار ۸ سو مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۷۹ء) ۴۴ لاکھ ہے۔ روانڈا کی طرح جرمن انیسویں صدی کے آخر میں برونڈی پر بھی قابض ہو گئے تھے۔ جنگ عظیم اول کے بعد بلجیم کو تولیت ملی۔ ۱۹۶۲ء میں آزادی حاصل کی۔ بوجمبورا صدر مقام ہے۔ مسیحی ذرائع کے مطابق ۵۴ فیصد آبادی عیسائی ہے۔ مسلمانوں کی تعداد معلوم نہیں ہوسکی۔ لیکن مسلمان موجود ہیں۔

تنزانیہ

تنزانیہ کا رقبہ ۳ لاکھ ۶۳ ہزار مربع میل (نو لاکھ ۴۱ ہزار کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۷۹ء) ایک کروڑ ۷۶ لاکھ ہے۔ یہ ایک وفاق ہے جو ٹانگانیکا اور زنجبار پر مشتمل ہے۔ ۹۔ دسمبر ۱۹۶۱ء کو ٹانگانیکا برطانوی غلامی سے آزاد ہوا اور ۹۔ دسمبر ۱۹۶۲ء کو زنجبار کو بھی آزادی مل گئی۔ ۲۶۔ اپریل ۱۹۶۴ء کو دونوں ملکوں نے مل کر وفاق بنالیا جس کا نام ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو تنزانیہ رکھا گیا۔

تنزانیہ میں ایک سو سے زیادہ قبیلے ہیں اور ہر قبیلے کی زبان الگ ہے۔ سواحلی مشترکہ زبان ہے جو عربوں اور افریقی باشندوں کے میل جول سے پیدا ہوئی۔ افریقی باشندوں کے علاوہ عرب، ایرانی اور ایشیائی باشندے بھی کئی ہزار ہیں جن کا تعلق برصغیر پاکستان و ہند سے ہے۔ ۱۹۴۸ء میں ٹانگانیکا میں چودہ ہزار ایرانی النسل باشندے تھے جن کو شیرازی کہا جاتا ہے۔ ۱۹۶۵ء میں ٹانگانیکا میں ۸۶ ہزار ایشیائی، ۲۶ ہزار عرب اور سترہ ہزار یورپی باشندے تھے۔ ایشیائی باشندوں میں ۵۵ فیصد مسلمان اور ۳۶ فیصد ہندو تھے۔ ۱۹۵۸ء میں زنجبار میں دو لاکھ اسی ہزار عرب اور فریقی اور اٹھارہ ہزار ایشیائی تھے۔ عربوں میں ۱۹۴۸ء میں چھ ہزار عرب خارجیوں کے اباضی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ زنجبار کا سابق حکمران خاندان اسی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا۔[1] دوسرے عرب اور افریقی مسلمان فقہ شافعی کے پیرو ہیں۔ ہندوستانی اور پاکستانی مسلمان یا تو اسماعیلی خوجہ ہیں یا حنفی مسلمان۔

مغربی اور مسیحی ذرائع اب تک تنزانیہ میں مسلمانوں کی تعداد کم دکھا کر پیش کرتے تھے۔ مغربی تصانیف میں شروع میں مسلمانوں کا تناسب بیس فیصد بتایا جاتا تھا۔ پھر تازہ اعداد و شمار میں یہ تناسب تیس فیصد کردیا گیا۔[2]

---

(۱) تنزانیہ کی قدیم تاریخ کے لیے دیکھیے ملت اسلامیہ۔ کی مختصر تاریخ حصہ دوم کا باب نمبر ۹ اور باب نمبر ۳۵

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے اسٹیٹسمین ایئر بک اور ورلڈ المینیک (Almanac) کے مختلف ایڈیشن اور ٹرمنگھم کی کتاب ''مشرقی افریقہ میں اسلام (انگریزی)۔

عیسائیوں کا تناسب بھی تیس فیصدی بتایا جاتا تھا۔ اس کے برخلاف مسلمانوں کا دعویٰ تھا کہ ان کی تعداد ستر فیصد سے کم نہیں اور تنزانیہ میں فی الحقیقت مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اب جو نئی معلومات حاصل ہوئی ہے اس سے مسلمانوں کے دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔

مسلمانوں کی تعداد

رابطہ عالم اسلامی کے ماہنامہ دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ) کی فروری۔ مارچ ۱۹۸۳ء کی اشاعت میں تنزانیہ کے مسلمانوں کے بارے میں ایک پر از معلومات مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کے مطابق ۱۹۶۷ء کی مردم شماری میں مسلمانوں کا تناسب ساٹھ سے ستر فیصد تک تخمینہ کیا گیا تھا۔ اب ۱۹۷۹ء میں پھر مردم شماری ہوئی ہے، اگرچہ اس کے نتائج میں مذہب کا ذکر نہیں ہے لیکن وزارت اطلاعات وثقافت نے ۱۹۸۰ء میں ایک بیان جاری کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ تنزانیہ میں مسلمانوں کا تناسب ستر فیصد ہے۔ اس بیان کی مشہور حوالہ کی کتاب یورو با ایربک ۱۹۸۲ء سے بھی تائید ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تنزانیہ میں مسلمان ساٹھ فیصد سے زیادہ ہیں۔

جرنل کے مضمون میں بتایا گیا ہے کہ ملک میں ایشیائی، عرب اور یوروپی باشندوں کی تعداد دس فیصد ہے۔ باقی آبادی افریقی ہے۔ زنجبار سمیت پانچوں جزیروں میں مسلمانوں کا تناسب سو فیصد ہے۔ صوبہ کے بیس صوبوں میں سے تیرہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ تمام صوبائی اور ضلعی صدر مقاموں میں بھی مسلمانوں کی اکثریت ہے، ساحلی علاقوں میں بھی مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ دارالسلام، دارالحکومت ہے۔ ۱۸۶۲ء میں آباد ہوا تھا۔ ۱۹۵۷ء میں ایک لاکھ ۲۸ ہزار آبادی میں ایک لاکھ یعنی تقریباً اسی فیصد مسلمان تھے۔[1] اب ملک کے وسط میں ڈوڈوما کو صدر مقام بنایا جا رہا ہے۔ اس کی بھی تین چوتھائی آبادی مسلمان ہے۔ دُور دراز شہر یوجی جی میں بھی جو زائرے کی سرحد پر جھیل ٹانگانیکا کے کنارے واقع ہے ۱۹۶۱ء میں تقریباً ساری آبادی مسلمان تھی۔ اس وقت یہاں سولہ مسجدیں اور ایک جامع مسجد تھی اور بارہ قرآنی مدرسے تھے۔

مسلمانوں کی اکثریت کے باوجود حکومت پر عیسائی اقلیت قابض ہے۔ صدر اور وزیراعظم جولیس نیریرے بھی عیسائی ہیں اور سوشلسٹ نظریات کے علمبردار ہیں۔ عیسائیوں کے غلبہ کی وجہ

---

(۱) انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (انگریزی) مقالہ ''دارالسلام''

مسلمانوں کی تعلیمی پستی ہے۔ برطانوی دور میں چونکہ بیش تر مدرسے مسیحی تبلیغی جماعتوں نے قائم کیے تھے اس لیے مسلمانوں نے ارتداد کے ڈر سے ان میں تعلیم حاصل نہ کی۔ عیسائیوں نے بغیر کسی رکاوٹ کے تعلیم حاصل کی اور چونکہ آزادی کے وقت وہی تعلیم یافتہ طبقہ تھا اس لیے آسانی سے اقتدار پر قابض ہوگیا۔ تعلیم میں مسلمانوں کی پستی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ابتدائی مدرسوں میں مسلمان طلبہ کا تناسب اسی فیصد تک ہے، لیکن ثانوی مدرسوں میں یہ تناسب گر کر پندرہ اور بیس فیصد اور یونیورسٹی صرف پانچ فیصد رہ جاتا ہے۔[۱]

حکومت میں جو مسلمان کابینہ کے ممبر رہے ہیں ان میں عبداللہ سعیدی فندی کیرا (Fundi Kira) امیر جمال، رشیدی کواوا اور بیبی تی تی محمد کے نام قابل ذکر ہیں۔ لیکن یہ سب سوشلسٹ خیال کے ہیں۔

دینی تعلیم کے قرآنی مدرسے جن کو چواؤ (Chuo) کہا جاتا ہے[۲] سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن ان کا معیار پست ہے اور تعداد میں ناکافی ہیں۔

ایسٹ افریکن مسلم سوسائٹی کے نام سے مسلمانوں نے ایک تنظیم قائم کی تھی لیکن ۱۹۶۹ء میں حکومت نے اس کو توڑ دیا اور اس کی جگہ نیشنل مسلم کونسل (bakwata) قائم کی جس کو سرکاری سرپرستی حاصل ہے۔ مسلمان طلبہ نے ۱۹۷۰ء میں مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے نام سے ایک تنظیم قائم کی ہے۔ دارالسلام یونیورسٹی میں بھی مسلمان طلبہ کی ایک تنظیم ہے جس کا نام (msaud) ہے۔ اس نے کمیونزم کے زہریلے اثرات سے طلبہ کو بچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ تنظیم الاسلام کے نام سے ایک انگریزی سہ ماہی رسالہ بھی شائع کرتی ہے۔[۳]

---

(۱) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ) فروری، مارچ ۱۹۸۳ء

(۲) ایضاً۔

(۳) ایضاً۔

مالاوی

آزادی سے پہلے مالاوی کا نام نیاسالینڈ تھا۔ برطانیہ نے انیسویں صدی کے آخر میں اس علاقے پر قبضہ کیا تھا۔ ۱۵۔ مئی ۱۸۹۱ء کو برطانوی وسطی افریقہ کا علاقہ محروسہ نام دیا گیا۔ ۱۹۰۷ء میں نیاسالینڈ نام کر دیا گیا۔ جھیل مالاوی جو پہلے نیاسا کہلاتی تھی اور جس کے کنارے یہ ملک واقع ہے افریقہ کی سب سے بڑی تیسری جھیل ہے۔ یکم فروری ۱۹۶۳ء کو حکومت خود اختیاری ملی اور ۶۔ جولائی ۱۹۶۴ء کو برطانوی دولت مشترکہ کا آزاد رکن ہو گیا اور مالاوی نام اختیار کیا۔ ۶۔ جولائی ۱۹۶۶ء کو جمہوریہ بن گیا، صدر مقام لی لونگ وے ہے۔

رقبہ ۴۵ ہزار مربع میل اور آبادی (۱۹۸۰ء) ۵۸ لاکھ ہے۔ ۱۹۶۶ء میں چالیس لاکھ بیس ہزار افریقی باشندے، گیارہ ہزار ایشیائی اور سات ہزار یورپی تھے۔ ڈیلی نیوز، نیویارک کی ورلڈ المینیک بابت ۱۹۸۰ء میں عیسائی آبادی کا تناسب پچاس فیصد اور مسلمانوں کا تیس فیصد بتایا گیا ہے۔ اسٹیٹسمین ایربک ۱۹۸۲ء میں مسلمانوں کی تعداد پانچ تا دس لاکھ بتائی گئی ہے اور عیسائی بیس لاکھ، جو کل آبادی کا ۳۳ فیصد ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کا اندازہ ہے کہ وہ ایک تہائی سے کم نہیں۔

ماہنامہ یونیورسل میسیج، کراچی میں یہاں کے مسلمانوں کے بارے میں حسب ذیل معلومات فراہم کی گئی ہے۔ (۱)

مسلمان زیادہ تر یاؤ (yao) اور چیوا (chewa) قبائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مغربی اقوام کے آنے سے پہلے مسلمانوں کی حالت اچھی تھی، عربوں کا اثر تھا۔ یاؤ حکمران اور تجارت پیشہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ عربی اور سواحلی زبان میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ انیسویں صدی میں

(۱) یونیورسل میسج کا یہ مضمون غالباً جریدہ امپیکٹ ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء سے لیا گیا ہے جس میں محمد سمیع اللہ نے "مالاوی میں اسلام" کے عنوان سے مضمون لکھا تھا۔

برطانیہ کی آمد تک یہی صورت رہی۔ برطانوی دَور میں تعلیم انگریزی میں دی جانے لگی اور ان لوگوں تک محدود کردی گئی جنھوں نے عیسائیت قبول کرلی تھی۔ پھر عیسائی تبلیغی اداروں نے اراضی خریدنا شروع کردیں اور اس طرح مسلمان کاشت کار عیسائیوں کی ملازمت پر مجبور ہوئے۔ جب زیمبیا، رہوڈیشیا اور جنوبی افریقہ میں مزدری کی مانگ ہوئی تو یہاں کے نوجوان ہزاروں کی تعداد میں وہاں چلے گئے۔ اس طرح مالاوی میں مردوں کی کمی ہوگئی۔ غیر مسلموں نے جو خوشحال تھے مسلمان لڑکیوں سے شادیاں کرنی شروع کردیں اور ان میں جو عیسائی تھے انھوں نے اپنی بیوی بچوں کو اور دوسرے لوگوں کو عیسائی بنالیا۔ یہ سلسلہ سالہا سال تک چلتا رہا اور مسلمانوں کے سینکڑوں دیہات عیسائی ہوگئے۔ مسلمان ہونا افلاس کی علامت بن گیا اور مسلمان عورتوں میں عیسائیوں سے شادی کرنا فیشن بن گیا۔

۱۹۲۸ء میں ہندوستان سے مسلمان تاجر بڑی تعداد میں آئے۔ اپنے علاقوں میں انھوں نے مسجدیں اور مدرسے تعمیر کیے۔ لیکن انھوں نے تجارت پر زیادہ توجہ دی اور اسلامی اخوت کے جذبہ سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے خود کو مقامی آبادی سے الگ رکھا اور مالاوی مسلمانوں سے میل جول پیدا نہیں کیا۔ یہ خود کو میمن، گجراتی، سورتی اور کھتری کہلاتے تھے۔

۱۹۶۴ء میں جب آزادی ملی تو تعلیمی نظام میں تبدیلیاں آئیں۔ مسلمان اب سرکاری مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ مسیحی مدرسوں میں بھی ارتداد کا خوف ختم ہوگیا۔ جنوبی افریقہ سے انگریزی میں اسلامی لٹریچر آنے لگا۔ اسلامی ملکوں سے بھی علماء آئے جن کی وجہ سے یہاں کے مسلمانوں میں بیداری پیدا ہونے لگی۔ ہندوستان اور پاکستان سے آنے والی تبلیغی جماعتوں کی آمد سے صورت حال بہتر ہوگئی۔ جو مقامی لوگ اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے اسلامی ملکوں میں گئے تھے ان کی واپسی بھی شروع ہوگئی۔ لیکن اس کے باوجود مالاوی میں اسلامی سرگرمیاں اب بھی محدود ہیں۔

اعداد وشمار دستیاب نہیں، لیکن اعلیٰ ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب زیادہ سے زیادہ ایک فی صد ہے۔ مسجدوں کی تعداد کا تخمینہ پانچ سو سے زیادہ ہے۔ ان میں تقریباً ایک سو اسی مسجدیں یا تو ہندوستانی مسلمانوں کی بنائی ہوئی ہیں یا انھوں نے ان کی تعمیر میں مدد کی ہے۔

مسلمانوں کی اکثریت نہ قرآن پڑھ سکتی ہے اور نہ نماز۔ سند یافتہ علماء کی تعداد ایک سو سے

زیادہ نہیں۔ مدرسوں کی بے حد کمی ہے۔ مالاوی میں پانچ ہزار گاؤں ہیں ان میں سے صرف ایک سو میں مدرسے ہیں۔ ابراہیم۔ اے۔ جی پنجوانی جیسے مخلص کارکنوں کی وجہ سے قومی سطح پر اتحاد قائم ہوگیا ہے۔ لیکن ضلع اور گاؤں کی سطح پر اب بھی تفرقے ہیں۔ لوگ قادری طریقے سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ۱۹۳۰ء کے بعد تنزانیہ سے شاذلی طریقے کے لوگ آئے اور انھوں نے کتاب وسنت پر زور دیا جس کی روایت پرستوں نے مخالفت کی۔

مسلمانوں میں ختنہ کا رواج ہے، جانوروں کو ذبح کیا جاتا ہے۔ شراب اور سور کے گوشت سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ اور بعض علاقوں میں عقیقہ بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن عدت پر عمل، زکوٰۃ دینا اور پانچ وقت کی نماز کم ادا کی جاتی ہے۔ رمضان کے روزے، تراویح اور جمعہ اور عیدین کی نمازیں عام ہیں۔ عورتوں کا لباس اسلامی نہیں۔ شادی روایتی طریقہ پر ہوتی ہے اور باقاعدہ نکاح کم ہوتا ہے۔ مالاوی میں حج پر اور دینی مطبوعات پر کوئی پابندی نہیں۔ صرف تنظیم کی کمی ہے۔[1]

---

(۱) یونیورسل میسیج، کراچی فروری ۱۹۸۲ء

موزمبیق

موزمبیق کا رقبہ تین لاکھ مربع میل (سات لاکھ ۸۴ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۱ء) ایک کروڑ ۲۷ لاکھ ہے۔ افریقہ کے مشرقی ساحل پر واقع صومالیہ، کینیا اور تنزانیہ کی طرح موزمبیق سے بھی مسلمانوں کا تعلق سلطنت زنج کے زمانے میں ہو گیا تھا اور مسلمانوں کی بستیاں قائم ہو گئی تھیں جن میں صوفالا سب سے اہم تھی۔ ۱۵۰۵ء میں پرتگالی صوفالا پہنچے اور یہاں حسب دستور مسلمانوں کا قتل عام کیا اور ان کو غلام بنایا۔ لیکن پرتگالیوں کا اقتدار چار سو سال تک صرف ساحل تک محدود رہا۔ یہاں کے باشندوں کی سخت مدافعت نے خاص طور پر شمال کے مسلمانوں نے ان کو اندرون ملک میں بڑھنے نہیں دیا۔ پورے ملک پر پرتگالی اقتدار موجودہ صدی کے دوسرے عشرے میں جدید ہتھیاروں کی بدولت قائم ہوا۔

پرتگالی دور موزمبیق کے باشندوں کے لیے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص بڑا تباہ کن ثابت ہوا۔ انھوں نے مقامی لوگوں کو غلام بنایا، کھیتوں میں بیگار کرنے پر مجبور کیا، اسلامی تعلیم اور عربی زبان پر پابندی لگائی۔ پرتگالی ہر اس مسلمان رہنما کو ختم کر دیتے تھے جو پرتگالی مظالم کے خلاف آواز اٹھاتا تھا۔ بعض اوقات لوگوں کو ہوائی جہاز سے نیچے پھینک دیا جاتا تھا۔[1] ۱۹۴۰ء اور اس کے بعد پرتگالی مظالم کے خلاف لوگوں نے خود کو منظم کرنا شروع کیا اور کئی خفیہ تنظیمیں قائم کی گئیں لیکن ان سب کو کچل دیا گیا۔ ۱۹۶۰ء میں شمالی موزمبیق کے مسلمانوں اور غیر مسلموں نے متحد ہو کر موزمبیق افریقن نیشنل یونین (Manu) بنائی جس کے رہنما اے، کبریتی دیوانی (Klbriti) تھے، لیکن جب یونین کے پرتگالی مظالم کے خلاف مظاہرے شروع کیے تو ان کو سختی سے کچل دیا گیا، صرف ایک مظاہرے میں پانچ سو مرد، عورتیں اور بچے گولیوں کا نشانہ بنائے

---

(۱) یقین انٹرنیشنل (انگریزی) کراچی۔ ۲۲ فروری ۱۹۶۹ء

گئے۔ کبریتی اور دوسرے رہنماؤں کو گرفتار کرلیا گیا اور وہ فروری ۱۹۶۹ء تک قید رہے۔ تیس ہزار لوگ نیاسالینڈ اور دوسرے ملکوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ (۱)

جبر و تشدد کی اس کاروائی کے بعد نیشنل یونین کے رہنماؤں نے مسلح جدوجہد کا فیصلہ کیا اور ۲۸۔اگست ۱۹۶۴ء کو عبدالرحمن اسانے (Assane) اور لوکاسی فرنانڈیز (Lucas Fernandes) نائب سیکرٹری مانو (Mamu) کی قیادت میں سطح مرتفع ماکوندیس (Macondes) سے بغاوت کا آغاز ہوا۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا چلا گیا تو تحریک آزادی کی قیادت اشتراکی عناصر کے ہاتھوں جماعت تک پڑھے ہوئے ایک شخص سمورا مائیکل کی قیادت میں فرے لیمو (Ferlimo) جسے ۲۵۔جون ۱۹۷۵ء کو صدر جمہوریہ موزنتخب کیا گیا ایک کٹر کمیونسٹ ہے۔ دسمبر ۱۹۷۵ء میں اس نے اعلان کیا کہ وہ اس وقت کا انتظار کر رہا ہے جب مذہب عہد ماضی کا ایک حادثہ بن کر رہ جائے گا۔ (۲)

رابطۂ عالم اسلامی کے انگریزی ماہنامہ دی ورلڈ مسلم لیگ جرنل کی جنوری ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں موزمبیق کی صورت حال پر ایک مضمون شائع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد یہاں کے مسلمان ابتلا اور آزمائش کے نئے دَور میں داخل ہو گئے ہیں۔ پرتگالی دَور میں ان کو عیسائی بننے پر مجبور کیا گیا اور اب ان کو بے دین بنایا جا رہا ہے۔ تعلیمی نظام قومی تحویل میں لے لیا گیا ہے اور الحاد کی تعلیم نصاب کا جزو ہے۔ اگرچہ آئین میں مذہبی آزادی کی ضمانت ہے، لیکن بیشتر اشتراکی ملک کی طرح موزمبیق میں بھی عملاً مذہب کو خصوصاً اسلام کو کچلا جا رہا ہے۔ اٹھارہ سال تک کے بچوں کو نماز پڑھنے سے سختی سے روکا جاتا ہے۔ قرآن کی درآمد ممنوع ہے۔ دیہی علاقوں میں مسجدوں کو بند کر دیا گیا ہے اور ان کو مدرسوں اور شفاخانوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جو مسلمان اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے باہر جانا چاہتے ہیں ان کو پاسپورٹ نہیں دیا جاتا۔ اسلامی کتابوں کی اشاعت پر پابندی ہے اور ملک میں اسلامی مطبوعات نایاب ہیں۔ کوئی شخص مُردے کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کرنے پر اصرار نہیں کرسکتا اور مذہبی بنیاد پر شراب بیچنے سے انکار نہیں کرسکتا۔ موزمبیق کے مسلمان رہنما یوسفی محمد (Issufee Moamed) نے مجاز

(۱) یقین انٹرنیشنل، کراچی۔ ۲۲ فروری ۱۹۶۹ء۔

(۲) دی ورلڈ مسلم لیگ جرنل، مکہ۔ جنوری ۱۹۸۱ء

آزادی سے الگ ہونے کے بعد حال ہی میں ان مسلمان فوجیوں پر ہونے والے خوفناک مظالم کی تفصیلات بتائی ہیں جن کو سور کا گوشت کھانے سے انکار پر مارا گیا۔[1]

مسیحی اور مغربی ذرائع کے مطابق موزمبیق میں عیسائیوں کا تناسب پندرہ فیصد ہے اور مسلمانوں کا ½۱۲ فیصد ہے لیکن وہاں کے مسلمانوں کے مطابق مسلمانوں کی تعداد کی آبادی کا ۳۵ سے ۴۰ فیصد تک ہے۔ یوروپا ایر بک ۱۹۸۲ء میں مسلمانوں کی تعداد بیس لاکھ اور عیسائیوں کی تعداد بھی بیس لاکھ بتائی گئی ہے۔

---

(۱) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل، مکہ۔ جنوری ۱۹۸۱ء

مالاگاسی

مالاگاسی کا جزیرہ موزمبیق کے مشرق میں واقع ہے۔ رقبہ دو لاکھ ۲۶ ہزار مربع میل (۵ لاکھ ۹۴ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) ۸۷ لاکھ ہے۔ پہلے اس کو مڈغاسکر کہتے تھے۔ یہاں کے باشندوں کی اکثریت میلے اور انڈونیشی نسل سے تعلق رکھتی ہے جو دو ہزار سال قبل یہاں آباد ہو گئے تھے۔ افریقی اور عرب نسل کے لوگ بھی موجود ہیں۔ مالاگاسی یہاں کی عام زبان ہے۔

۱۸۸۵ء میں جزیرے پر فرانس نے قبضہ کیا اور ۲۶۔ جون ۱۹۶۰ء کو آزادی حاصل کی۔

جزیرے کو مڈغاسکر کا نام پرتگالیوں نے دیا تھا جو ۱۵۰۰ء میں یہاں پہنچے تھے۔ یہ لفظ دراصل مقدیشو (صومالیہ) کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ پرتگالی یہ سمجھتے تھے کہ عرب جس جگہ کو مقدیشو کہتے ہیں وہ یہی جزیرہ ہے۔

فرانس کے قبضہ کے بعد عیسائیت خوب پھیلی۔ مسیحی ذرائع کے مطابق عیسائیوں کی تعداد ۳۸ فیصد ہے جب کہ مسلمان صرف نو دس فیصد ہیں۔ جزیرے کے وسطی پہاڑی علاقے میں عیسائیوں کی اکثریت ہے۔ گرجوں کی تعداد دس ہزار ہے۔[1] مسیحی مبلغوں نے مدرسے قائم کیے اور مالاگاسی زبان کے لیے رسم الخط بنایا۔ مسلمانوں کے تخمینے کے مطابق مسلمانوں کا تناسب اٹھارہ فیصد ہے۔ دارالحکومت تناناریو میں ایک مرکزی مسلم ایسوسی ایشن قائم ہے لیکن بے عمل ہے۔[2] اسٹیٹسمین ایر بک کے مطابق جزیرے میں ۷۵ مسجدیں ہیں۔

---

(۱) یقین، کراچی ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء

(۲) ایضاً۔

جنوبی افریقہ

جنوبی افریقہ دنیا کا وہ واحد ملک ہے جس پر ابھی تک ½۱۷ فیصدی سفید فام باشندے ½۸۲ فیصد کالی اکثریت پر حکومت کر رہے ہیں۔ ملک پر بدترین قسم کی نسل پرست حکومت قابض ہے جس نے رنگ و نسل کے امتیاز کو انتہائی کریہہ شکل دے رکھی ہے اور ملک کی آبادی کو گورے، رنگدار ایشیائی اور کالے باشندوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایشیائی باشندے عام طور پر ہندوستان اور پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں کچھ تعداد ملائے نسل کے باشندوں کی بھی ہے۔

جنوبی افریقہ کا رقبہ ۴ لاکھ ۷۱ ہزار مربع میل (بارہ لاکھ ۲۱ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۲ء) دو کروڑ ۵۶ لاکھ ہے۔ تین دار الحکومت ہیں۔ کیپ ٹاؤن، قانون سازی کا، پرٹیوریا، انتظامی معاملات کا اور بلوم فاونٹین، عدالتی امور کا صدر مقام ہے۔

جنوبی افریقہ میں عیسائیوں کی تعداد ۷۵ فیصد ہے۔ گوری آبادی سب عیسائی ہے اور کالی آبادی کی اکثریت عیسائی کہی جاتی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں ہندوؤں کی تعداد چار لاکھ ۳۲ ہزار تھی اور مسلمانوں کی تعداد دو لاکھ ستر ہزار ہے جو جنوبی افریقہ کے چاروں صوبوں میں حسب ذیل تعداد میں تقسیم ہیں۔ (۱)

مسلمانوں کی آبادی

	گورے	رنگدار	ایشیائی	کل تعداد
کیپ	۴۱۲	۱۱۷۵۷۳	۹۸۰۸	۱۲۷۷۹۳

(۱) مزید تفصیل کے لیے دیکھیے جدہ یونیورسٹی کے مسلمان اقلیتوں کے انسٹی ٹیوٹ کے مجلہ جرنل جلد ۳ شمارہ نمبر ۲ (موسم سرما ۱۹۸۱ء) میں ڈبلیو۔ جے (Argyle) کا جنوبی افریقہ کے مسلمانوں پر پر از معلومات مضمون۔ پروفیسر موصوف نٹال یونیورسٹی، ڈربن میں افریقی مطالعہ کے شعبہ کے چیرمین ہیں۔

نٹال	۱۳۲	۳۸۹۱	۷۲۹۷۴	۷۶۹۹۵
ٹرانسوال	۳۹۰	۱۲۵۵۱	۴۲۶۷۷	۵۵۶۱۸
اورنیج فری اسٹیٹ	۸	۳۱	-	۳۹
دیگر	۳	۴۱	۵۳۰	۵۷۴
	۹۴۵	۱۳۴۰۸۷	۵۳۰	۵۷۴
	۹۴۵	۱۳۴۰۸۷	۱۲۵۹۸۷	۲۶۱۰۱۹

دیگر کے تحت وہ آبادی ہے جو ان علاقوں میں آباد ہے جو کالی آبادی کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں تا کہ بال آخر ان کو آزادی دے دی جائے۔ مسلمانوں کی مذکورہ بالا تعداد کے علاوہ آٹھ ہزار ۸ سو ۹۶ مسلمان کالی بانٹونسل کے بھی ہیں۔ ان کو شامل کرنے کے بعد مسلمانوں کی کل تعداد تقریباً دولاکھ ستر ہزار ہو جاتی ہے۔[1]

صوبہ راس امید کے مسلمان زیادہ تر ملیئے نسل سے ہیں۔ ان کو ولندیزی حکمران پندرہویں صدی میں انڈونیشیا سے لائے تھے۔ اس کے برخلاف نٹال اور ٹرانسوال کے مسلمان ہندوستان اور پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں اور انیسویں صدی میں مزدور اور تاجر کی حیثیت سے آئے تھے۔ یہ مسلمان اقتصادی لحاظ سے مالدار اور خوشحال ہیں اور انھوں نے مسلمانوں کی تمام آبادیوں میں شاندار مسجدیں اور مدرسے قائم کر رکھے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں بھی مسلمان پروفیسر موجود ہیں لیکن اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں نہیں ہیں۔

جنوبی افریقہ میں مکمل مذہبی آزادی ہے۔ اسلامی شخصی قانون نافذ نہیں لیکن مسلمان اس پر رضا کارانہ طور پر عمل کرتے ہیں۔ قرآن اور اس کے ترجمے آسانی سے مل جاتے ہیں۔ اسلامک پروپیگیشن سوسائٹی ڈربن کی طرف سے بھی قرآن کی طباعت کا انتظام ہے۔ لیکن قرآن کا ابھی تک مقامی زبانوں میں ترجمہ نہیں ہوا۔ دینی کتب انگریزی میں دستیاب ہیں اور بچوں کے لیے بعض اچھی درسی کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ دینی مدرسوں اور ان مسلم اسکولوں میں، جن کو سرکاری امداد ملتی ہے بنیادی اسلامی تعلیم دی جاتی ہے۔

(۱) اسٹیٹسمین ایر بک ۱۹۸۲ء۔ ۱۹۸۳ء اور جرنل (جدہ) جلد ۳ شمارہ نمبر ۲ (۱۹۸۱ء)

جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کے کئی ادارے اور تنظیمیں قائم ہیں۔ چند اہم نام یہ ہیں۔
اسلامک کونسل آف ساؤتھ افریقہ۔ مسلم یوتھ موومنٹ۔ ساؤتھ افریکن اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (SASA) اور اسلامک پروپیگیشن سنٹر (ڈربن)۔ ایک مجلس علماء بھی ہے جس کی طرف سے پورٹ الیزبتھ سے دی مجلس (The Majlish) کے نام سے انگریزی میں ایک اخبار نکلتا ہے۔

بوٹسوانا، زمباوے اور زیمبیا

بوٹسوانا

پہلے بچوانا لینڈ کہلاتا تھا۔ ۱۸۸۶ء میں برطانوی مملکت محروسہ قرار دیا گیا۔ ۳۰۔ ستمبر ۱۹۶۶ء کو آزاد ہوا اور نام بدل کر بوٹسوانا کر دیا گیا۔ صدر مقام گابورونے (Qaborone) ہے۔ رقبہ دو لاکھ ۱۹ ہزار مربع میل اور آبادی (۱۹۷۸ء) سات لاکھ بیس ہزار ہے۔ خواندگی کی شرح بیس فیصد ہے۔ انگریزی سرکاری زبان ہے۔ عیسائی آبادی پندرہ فیصد ہے۔ موتمر عالم اسلامی کے مطابق مسلمانوں کی تعداد پانچ سو ہے جن میں بارہ فیصد مقامی باشندے ہیں اور باقی پاکستان اور ہندوستان کے مہاجر ہیں جو ایک سو سال سے زیادہ عرصے سے یہاں موجود ہیں اور ان کی ۷۵ فیصد تعداد نے بوٹسوانا کی شہریت اختیار کر لی ہے۔

بوٹسوانا میں صرف ایک مسجد ہے جو ۱۹۶۵ء میں بنی تھی۔ یہ مسجد لوباٹسے (Lobatse) میں ہے۔ صدر مقام میں کوئی مسجد نہیں ہے لیکن ۱۹۶۵ء میں ایک مسجد اور اسلامی مرکز زیر تعمیر تھا۔ کتابیں ہندوستان اور پاکستان سے درآمد کی جاتی ہیں۔ شخصی قانون نافذ نہیں لیکن مسلمانوں کو مذہبی آزادی ہے۔ ہر سال دس افراد حج کو جاتے ہیں۔ دو مدرسے بھی ہیں جن میں مسلمانوں کے تقریباً نصف بچے بنیادی اسلامی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مسلمان تجارت کرتے ہیں۔ بوٹسوانا مسلم ایسوسی ایشن ان کی تنظیم ہے۔

زمباوے

موزمبیق کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ رقبہ ڈیڑھ لاکھ مربع میل (۳لاکھ ۹۰ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) ۷۵ لاکھ۔ صدر مقام سالسبری ہے۔ پہلے جنوبی رہوڈیشیا کہلاتا تھا

پھر اس کا نام رہوڈیشیا ہوا اور آزادی کے بعد زمبابوے نام دیا گیا۔

عرب تاجر سولہویں صدی سے مالاوی اور صوفالا کے راستے زمبابوے پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ ۱۸۹۰ء میں برطانوی جنوبی افریقی کمپنی نے یہ علاقہ فتح کر لیا۔ یکم اکتوبر ۱۹۲۳ء کو برطانیہ نے براہ راست انتظام سنبھال لیا۔ ملک پہاڑی ہے جس کی وجہ سے آب و ہوا معتدل ہے اور یورپی باشندوں کے لیے موزوں۔ چنانچہ انگلستان اور یورپی ملکوں سے کثرت سے لوگ آ کر یہاں آباد ہوئے اور بڑے بڑے مزرعوں کے مالک بن گئے۔ ۱۹۶۱ء تک یورپی باشندوں کی تعداد دو لاکھ اکیس ہزار تک پہنچ گئی۔ اس دوران ایشیائی باشندے بھی آباد ہوتے رہے۔ ۱۹۶۱ء میں ان کی تعداد سترہ ہزار آٹھ سو اور ۱۹۶۹ء میں ۲۴ ہزار تھی۔ ۱۹۶۱ء میں اندرونی خود مختاری ملی لیکن اقتدار سفید فام باشندوں کے ہاتھ میں آیا جنھوں نے ۱۹۶۵ء میں رہوڈیشیا کی آزادی کا یک طرفہ اعلان کر دیا۔ افریقی باشندوں سے ۱۹۷۹ء تک سیاسی کشمکش جاری رہی۔ بالآخر اپریل ۱۹۷۹ء میں یونائیٹڈ افریقی قومی کونسل نے انتخابات میں اکثریت حاصل کر لی۔

زمبابوے میں مسلمانوں کی تعداد پانچ تا دس فیصد تک بیان کی جاتی ہے۔[1] افریقی مسلمان بہت پس ماندہ ہیں۔ یہاں کی دینی سرگرمیاں زیادہ تر ایشیائی باشندوں تک محدود ہیں جن کی نصف سے زیادہ تعداد مسلمان ہے۔ ان مسلمانوں نے زمبابوے کے تجارت مرکزوں میں مسجدیں اور مدرسے قائم کر کے اپنی اور مقامی باشندوں کی دینی ضرورتیں پوری کیں اور اس خطے میں اسلام کی اشاعت اور تبلیغ بھی ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

زیمبیا

زیمبیا کا نام آزادی سے پہلے شمالی رہوڈیشیا تھا۔ اس علاقہ پر ۱۸۸۹ء میں انگریزوں نے قبضہ کیا اور ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو اس نے آزادی حاصل کی۔ لوسا کا دارالحکومت ہے زیمبیا کا رقبہ دو لاکھ نوے ہزار مربع (۷½ لاکھ مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) ۵۸ لاکھ ہے۔ ورلڈ المینک ۱۹۸۰ء کے مطابق ۱۵ فیصد آبادی عیسائی ہے جبکہ اسٹیٹسمین ایر بک ۱۹۸۲ء۔ ۱۹۸۳ء کے مطابق

---

(۱) یقین (انگریزی) ۲۲۔ دسمبر ۱۹۶۸ء۔

عیسائیوں کی تعداد پانچ لاکھ جو دس فیصد سے بھی کم ہوتے ہیں۔ باقی آبادی مظاہر پرست ہے۔

عرب اور سواحلی تاجر ۱۸۴۰ء کے بعد اس علاقے میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد اسلام پھیلنا شروع ہوا لیکن اس کے بعد ہی انگریزوں کا تسلط قائم ہوگیا۔ مشرقی افریقہ کے دوسرے ملکوں کی طرح انگریزوں نے اسلام کی اشاعت کو اپنے سامراجی مفاد کی راہ میں رکاوٹ سمجھا اور ابتدائی دور ہی میں اس کا اثر ختم کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج زیمبیا کے اصل باشندے اسلام سے ناواقف ہیں۔ اور یہاں کی مسلمان آبادی زیادہ تر ایشیائی آباد کاروں پر مشتمل ہے جن کی اکثریت ہندوستان یا پاکستان سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک ہزار صومالی مسلمان ہیں اور باقی مسلمان افریقہ کے مختلف ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ خاص زیمبیا کے باشندوں میں مسلمان بہت کم ہیں۔

محمود بریلوی نے اپنی انگریزی تصنیف ''افریقہ میں اسلام'' مطبوعہ لاہور ۱۹۶۴ء میں زیمبیا (شمالی رہوڈیشیا) میں مسلمانوں کی تعداد پچاس ہزار لکھی تھی۔ لیکن انھوں نے اس سلسلے میں کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ اے۔ اے مہدی جو زیمبیا یونیورسٹی، لوساکا سے وابستہ ہیں اس تعداد کو صحیح تصور نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ زیمبیا کے غیر سرکاری حلقوں کے مطابق مسلمانوں کی آبادی کسی طرح تیس ہزار سے زیادہ نہیں۔ مقامی لوگ اسلام کی بین الاقوامی حیثیت سے قطعی ناواقف ہیں اور اسلام کو ہندوستانی مذہب سمجھتے ہیں اور مقامی ٹیکسی ڈرائیور لوساکا کی جامع مسجد کو ہندوستانی چرچ کہتے ہیں۔ مہدی صاحب نے جو جائزہ لیا ہے اس کے مطابق پورے ملک میں ۶۷ مسجدیں ہیں۔ ان میں گیارہ دارالحکومت لوساکا میں ہیں اور چھنڈولا (Ndola) میں ہیں جو دوسرا بڑا شہر ہے۔ (۱)

زائرے

زائرے کا پرانا نام بلجیم کانگو ہے۔ اس ملک پر ۱۸۸۴ء میں بلجیم نے قبضہ کیا تھا۔ ۳۰ جون ۱۹۶۰ء کو آزادی حاصل کی اور ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو نام بدل کر زائرے کر دیا گیا۔ رقبہ نو

(۱) جرنل (جدہ یونیورسٹی) جلد ۳ شمارہ نمبر ۲، ۱۹۸۱ء مضمون ''زیمبیا میں مسلمان بچوں کی سیکولر تعلیم'' از اے۔ اے

لاکھ مربع میل (۲۳ لاکھ مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۷۹ء) دو کروڑ ۹۲ لاکھ ہے۔ رقبہ کے لحاظ سے زائرے براعظم افریقہ میں سوڈان اور الجزائر کے بعد سب سے بڑا ملک ہے اور آبادی کے لحاظ سے نائیجیریا اور مصر کے بعد سب سے بڑا ملک ہے۔ دارالحکومت کنشاسا آبادی کے لحاظ سے قاہرہ اور اسکندریہ کے بعد افریقہ کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ مسیحی ماخذ کے مطابق زائرے کی ساٹھ فیصد آبادی عیسائی ہے جبکہ مسلمانوں کا تناسب صرف ایک فیصد بتایا جاتا ہے۔[1] لیکن مسلمانوں کے مطابق زائرے میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب پندرہ اور بیس فیصدی کے درمیان ہے۔

ذیل میں زائرے کے ایک مسلمان رہنما پروفیسر حسن ثابت مافاتو کا ایک انٹرویو پیش کیا جا رہا ہے جو انھوں نے رابطۂ عالم اسلامی، مکہ کے ہفت روزہ ''اخبار العالم الاسلامی'' مورخہ ۱۹۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو دیا تھا اور روزنامہ جنگ، کراچی میں جس کا ترجمہ شائع ہوا تھا۔ پروفیسر حسن ثابت، رابطۂ عالم اسلامی کے رکن ہیں۔ اور انھوں نے یہ انٹرویو رابطہ کے اجلاس میں شرکت کے بعد دیا تھا۔ وہ کہتے ہیں:

''میں نے رابطہ کے سامنے زائرے کے ۴۵ لاکھ مسلمانوں کے مسائل رکھے ہیں۔ زائرے کی پوری آبادی ڈھائی کروڑ کے لگ بھگ ہے اور مسلمان اس آبادی کا اٹھارہ یا بیس فیصد بنتے ہیں۔ اگرچہ مسلمان زائرے میں اقلیت میں ہیں لیکن وہاں کا دستور انھیں مساوی حقوق عطا کرتا ہے۔ ملک کے صدر اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ یہ مساوی حقوق عملاً بھی مسلمانوں کو ملیں۔ چنانچہ جب رابطہ کے اجلاس میں شرکت کے لیے تیار ہونے لگا تو صدر کی ہدایات پر مجھے عام پاسپورٹ کی بجائے سفارتی پاسپورٹ مہیا کیا گیا جس کی وجہ سے مجھے تمام ممالک میں سفارتی مراعات حاصل ہو گئیں۔

''زائرے کے مسلمان اس وقت عیسائی مشنریوں کے گھیرے میں گھرے ہوئے ہیں اور انھیں اس گھیرے کو توڑنے کے لیے مسلمانانِ عالم کی مدد کی ضرورت ہے۔ عیسائی مشنری براعظم افریقہ کے اس علاقے کو اپنے لیے بہت ہی اہم سمجھتے ہیں اور بڑے زور شور سے اپنی کارروائیوں میں مشغول ہیں۔ میں جب ۱۹۷۵ء میں مکہ مکرمہ رسالہ ''المسجد'' کانفرنس میں شریک ہوا تھا تو

(۱) اسٹیٹسمین ایر بک ۱۹۸۳۔ ۱۹۸۴ء میں زائرے میں ۱۹۷۵ء میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ پندرہ ہزار دی گئی ہے جبکہ ورلڈ المینک ۱۹۸۰ء میں ایک فیصدی۔ جو تین لاکھ ہوتی ہے۔

دَوروں پر اور مبلغین کی تربیت پر تیس لاکھ سعودی ریال خرچ کر چکا ہے۔ افریقہ میں قرآن کے تیس لاکھ نسخے تقسیم کیے گئے ہیں۔ گزشتہ سات سال میں رابطۂ افریقہ کے مسلمان اداروں کو نوے لاکھ ریال کی مدد دے چکا ہے۔ (۱)

(۱) ہفت روزہ ''مسلم ورلڈ'' کراچی۔ ۱۳۔فروری ۱۹۸۲ء۔

دَوروں پر اور مبلغین کی تربیت پر تیس لاکھ سعودی ریال خرچ کر چکا ہے۔ افریقہ میں قرآن کے تیس لاکھ نسخے تقسیم کیے گئے ہیں۔ گزشتہ سات سال میں رابطۂ افریقہ کے مسلمان اداروں کو نوے لاکھ ریال کی مدد دے چکا ہے۔[1]

---

www.KitaboSunnat.com

(۱) ہفت روزہ ''مسلم ورلڈ'' کراچی۔ ۱۳۔ فروری ۱۹۸۲ء۔

کانگو۔گابون۔وسطی افریقی جمہوریہ

کانگو

یہ ملک زائرے کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ پہلے فرانسیسی استوائی افریقہ کا ایک حصہ تھا۔ ۱۵۔اگست ۱۹۶۰ء کو آزاد ہوا۔ رقبہ ایک لاکھ ۳۲ ہزار مربع میل ہے اور آبادی (۱۹۷۰ء) ½۱۴ لاکھ ہے۔ برازاویل، جو دریائے کانگو کے کنارے کنشاسا کے سامنے واقع ہے دارالحکومت ہے۔ پچاس فیصد آبادی عیسائی بتائی جاتی ہے۔ مسلمان بہت کم ہیں۔

گابون

جمہوریہ کانگو کے مغرب میں واقع ہے۔ کانگو کی طرح یہ بھی فرانسیسی استوائی افریقہ کا ایک حصہ تھا۔ ۱۷۔اگست ۱۹۶۰ء کو آزاد ہوا۔ لبرِیول دارالحکومت ہے۔ رقبہ ایک لاکھ ۲ ہزار مربع میل (دو لاکھ ۶۷ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۷۹ء) ساڑھے چھ لاکھ ہے۔ مسیحی ذرائع کے مطابق ۳۵ فیصد آبادی عیسائی ہے۔ مسلمانوں کی تعداد دو ہزار ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کے بعض نقشوں میں کانگو اور گابون کو مسلم اکثریت کا ملک بتایا گیا ہے لیکن یہ غلط ہے۔ مسلمان بہت کم ہیں لیکن اسلام چند سالوں سے پھیلنا شروع ہو گیا ہے[۱] اور جمہوریہ گابون کے صدر عمر بانگو مسلمان ہیں۔ وہ پہلے عیسائی تھے پھر مسلمان ہو گئے۔ وہ دسمبر ۱۹۶۷ء سے صدر چلے آرہے ہیں۔ فروری ۱۹۷۴ء میں جب لاہور میں رابطہ عالم اسلامی کے تحت اسلامی ملکوں کے سربراہوں کی کانفرنس ہوئی تھی تو اس میں صدر عمر بانگو کے نمائندے کی حیثیت سے گابون کے مشیر مذہبی امور ڈاکٹر سمبا نے بھی شرکت کی تھی۔ ڈاکٹر سمبا نے اس موقع پر مولانا مودودی سے بھی ملاقات کی اور بتایا کہ:

---

(۱) اسٹیٹسمین ایر بک ۱۹۸۲ء۔ ۱۹۸۳ء میں مسلمانوں کی تعداد دو ہزار بتائی گئی ہے۔

''گابون میں مولانا مودودی کی تحریریں بڑی تیزی سے مقبول ہو رہی ہیں اور عیسائی مشنریوں کی کوششوں کے باوجود اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ خود مولانا کی تمام عربی کتابیں پڑھ چکے ہیں اور گابون کے صدر عمر بانگو جو پہلے عیسائی تھے مولانا کا لٹریچر پڑھ کر مشرف بہ اسلام ہوئے اور اپنے ملک میں اسلام کی تبلیغ کا ذریعہ بن گئے۔ ڈاکٹر سمبا نے مولانا مودودی کو صدر عمر بانگو کا پیغام بھی لا کر دیا۔''[1]

وسطیٰ افریقی جمہوریہ

وسطیٰ افریقہ کا یہ ملک بھی گابون اور کانگو کی طرح فرانسیسی استوائی افریقہ کا ایک حصہ تھا جس پر انیسویں صدی کے آخر میں فرانس نے قبضہ کرنے کے بعد اوبنگی شاری کا نام دیا۔ اوبنگی اور شاری۔ یہاں کے وہ دریا ہیں۔ یہ ملک زائرے کے شمال میں اور سوڈان کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ ۱۳۔ اگست ۱۹۶۰ء کو آزاد ہوا، ور نام جمہوریہ وسطیٰ افریقہ رکھا گیا۔ بانگوئی دارالحکومت ہے۔ وسطیٰ افریقی جمہوریہ کا رقبہ دو لاکھ ۴۱ ہزار مربع میل (۶ لاکھ ۲۴ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۱ء) ۲۴ لاکھ ہے۔ مسیحی ذرائع کے مطابق ۳۵ سے ۶۵ فیصد آبادی عیسائی اور آٹھ فیصد آبادی مسلمان ہے۔

---

(۱) ہفت روزہ ''ایشیا'' لاہور۔ ۳۔ مارچ ۱۹۷۶ء

کیمرون

کیمرون کا ملک وسطی افریقی سلطنت کے مغرب میں اور نائیجیریا کے مشرق میں واقع ہے۔ ۱۸۸۴ء میں اس پر جرمنوں نے قبضہ کیا جو ۱۹۱۶ء تک قائم رہا۔ اس کے بعد کیمرون پر فرانس قابض ہوگیا۔ یکم جنوری ۱۹۶۰ء کو آزاد ہوا۔ ۱۹۶۱ء میں نائیجیریا کا صوبہ جنوبی کیمرون فرانسیسی کیمرون میں شامل ہوگیا اور نئی مملکت کا نام متحدہ جمہوریہ کیمرون رکھا گیا۔ یوانڈے ملک کا دارالحکومت ہے۔

جمہوریہ کیمرون کا رقبہ ایک لاکھ ۸۳ ہزار مربع میل اور آبادی (۱۹۸۱ء) ۸۵ لاکھ ہے۔ مسیحی ذرائع کے مطابق ۳۵ فیصد آبادی عیسائی اور بارہ سے بیس فیصد تک مسلمان ہے۔[1] لیکن یہ اندازہ صحیح نہیں ہے۔ ملک کا شمالی حصہ جو سطح مرتفع آدماوا پر مشتمل ہے اور پورے ملک کے ایک تہائی رقبے پر مشتمل ہے صدیوں سے مسلمانوں کا مرکز رہا ہے اور اس کی عظیم اکثریت مسلمان ہے۔ اس سے ملحق نائیجیریا کے صوبہ آدماوا اور صوبہ سردونا (سابق شمالی کیمرون) کی ستر فیصد آبادی مسلمان ہے۔ کیمرون کے جنوبی نصف حصہ میں جس کی آبادی شمالی نصف کے مقابلے میں گنجان ہے، مسلمان بہت کم ہیں اور ان کی آبادی صرف شہروں تک محدود ہے۔ شمال کے تقریباً تمام قبائلی سردار مسلمان ہیں۔ احمد اہیجو ۱۹۶۰ء سے شمال کے مسلمانوں کی رائے سے مسلسل صدر منتخب ہوتے چلے آرہے ہیں اور یہ بات نہ صرف صدر احمد اہیجو کے اثر و رسوخ کو ظاہر کرتی ہے بلکہ مسلمانوں کے اثر و رسوخ کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

کیمرون کو مذہبی لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ شمالی حصہ جس کی اکثریت مسلمان ہے۔ یہاں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مطابق ۱۹۵۵ء میں چھ لاکھ مسلمان تھے جبکہ

---

(1) اسٹیٹسمین ایئر بک ۱۹۸۲۔ ۱۹۸۳ء میں مسلمانوں کا تناسب بیس فیصد دیا گیا ہے جبکہ ورلڈ المینک ۱۹۸۰ء میں بارہ فیصد ہے۔

کیمرون کی کل آبادی (۱۹۵۵ء) میں ۱۳۱ لاکھ تھی۔ دوسرے الفاظ میں کل آبادی میں صرف شمال کے مسلمانوں کا تناسب بیس فیصد تھا۔ وسطی علاقے میں مظاہر پرستوں کی اکثریت ہے لیکن مسلمان بھی بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ جنوبی کیمرون میں عیسائیوں کی اکثریت ہے۔ اس حصہ میں انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مطابق ۱۹۵۵ء سے قبل ۲۵ ہزار مسلمان تھے جو شہروں میں آباد تھے اور قصاب، جفت ساز اور چھوٹے تاجروں کی حیثیت سے رہتے تھے۔ برطانوی کیمرون کا جو جنوبی حصہ ۱۹۶۱ء میں نائیجریا سے الگ کر کے کیمرون میں ملایا گیا اس میں مسلمانوں کی آبادی ۲۵ ہزار تھی۔

بنین، بالائی وولٹا اور ٹوگو

بنین

بنین کا ملک نائیجیریا اور ٹوگو کے درمیان واقع ہے۔ آزادی سے پہلے اس کو ڈیہومے کہا جاتا تھا۔ فرانس نے اس علاقہ پر ۱۸۹۲ء میں قبضہ کیا تھا۔ یکم اگست ۱۹۶۰ء کو آزادی ملی اور ۱۹۷۵ء میں نام بدل کر جمہوریہ بنین کر دیا گیا۔ پورٹونووو، دارالحکومت ہے۔

بنین کا رقبہ ۴۳ ہزار مربع میل (ایک لاکھ ۱۲ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۱ء) ۳۵ لاکھ ہے۔ مسیحی تخمینے کے مطابق پندرہ فیصد آبادی عیسائی اور تیرہ فیصد مسلمان ہے۔ مسلمانوں کے بعض تخمینوں میں مسلمانوں کی اکثریت بتائی گئی[1] ہے لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ بنین میں نہ تو مسلمانوں کی اکثریت ہے اور نہ ان کی تعداد اتنی کم ہے جتنی مسیحی مبلغوں کے تخمینوں میں بتائی گئی ہے۔ بنین کے شمالی علاقوں میں اسلام بارہویں صدی میں پھیلنا شروع ہوگیا تھا اور ان حصوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ انیسویں صدی میں شمالی حصہ پر فولانی قبائل کا قبضہ ہوگیا جو عثمان دان فودیو کی عظیم اصلاحی تحریک کے علمبردار تھے۔ ڈیہومے کی مشرقی سرحد کے ساتھ نائیجیریا کے تمام صوبوں میں صوبہ اویو کے علاوہ مسلمانوں کی اکثریت ہے۔[2] اویو کی بھی تقریباً نصف آبادی مسلمان ہے۔

عیسائی آبادی تعلیمی اعتبار سے ترقی یافتہ ہے اور سیاسی اقتدار بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

---

(۱) بعض تخمینوں میں مسلمانوں کا تناسب ساٹھ فیصد بتایا گیا ہے۔

(۲) صوبہ کولونی میں جس میں نائیجیریا کا صدر مقام لاگوس واقع ہے مسلمانوں کا تناسب ۵۳ فیصد، صوبہ آبیوکوتا می ۵۴ فیصد، صوبہ اویو میں ۴۲ فیصد، صوبہ الورین میں ۷۵ فیصد، صوبہ نائیجریا میں ستر فیصد، اور صوبہ سوکوٹو میں نوے فیصد ہے۔ یہ اعداد و شمار نائیجریا کی ۱۹۶۳ء کی مردم شماری کے مطابق ہیں۔ یہ تمام صوبے بنین سے ملحق ہیں۔

بالائی وولٹا

بالائی وولٹا یا اپر وولٹا کا ملک غانا اور آئی وری کوسٹ کے شمال اور مالی کے جنوب میں واقع ہے۔ عہد قدیم میں سلطنت مالی کا ایک حصہ تھا۔ ۱۸۹۶ء میں فرانس نے قبضہ کیا۔ ۱۹۴۷ء میں اپر وولٹا کے نام سے علیحدہ انتظامی علاقہ بنایا گیا۔ ۵۔ اگست ۱۹۶۰ء کو آزادی حاصل کی۔

بالائی وولٹا کا رقبہ ایک لاکھ ۵ ہزار مربع میل (۲ لاکھ ۷۴ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۱ء) ستر لاکھ ہے۔ دارالحکومت واگادوگو (ouagadougou) ہے۔

مسیحی ذرائع کے مطابق مسلمانوں کا تناسب بیس فیصدی اور عیسائیوں کا تناسب پانچ فیصدی ہے۔ باقی آبادی مظاہر پرست ہے۔ مسلمانوں کے خیال میں اکثریت مسلمان ہے۔ ۱۹۶۶ء کے انقلاب کے بعد سے ایک مسلمان ابوبکر سنگولے لامی زانا (Sangolaugmizana) صدر چلے آرہے ہیں۔ ۸۳۔۱۹۸۲ء کی اسٹیٹسمین ایر بک میں مسلمانوں کا تناسب ۳۶ فیصدی اور عیسائیوں کا گیارہ فیصدی دیا ہوا ہے۔

ٹوگو

ٹوگو کی جمہوریہ بنین اور غانا کے درمیان واقع ہے۔ یہ خطہ افریقہ میں امریکہ کے لیے غلاموں کے حصول کا بہت بڑا مرکز تھا۔ ۱۸۸۴ء میں جرمنوں کے قبضہ میں آیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد فرانس کی تولیت میں آیا۔ ۲۷۔ اپریل ۱۹۶۰ء کو آزاد ہوا۔ لومے صدر مقام ہے۔ رقبہ تقریباً ۲۲ ہزار مربع میل (۵۷ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۱ء) ۲۸ لاکھ ہے۔ مغربی اندازوں کے مطابق ۲۵ فیصد عیسائی اور نو فیصد مسلمان ہیں۔ اسٹیٹسمین ایر بک ۱۹۸۲ء۔ ۱۹۸۳ء کے مطابق عیسائیوں کی تعداد ۵ لاکھ ۲۱ ہزار اور مسلمانوں کی دو لاکھ ۲۶ ہزار ہے۔

غانا

اس ملک کو اگرچہ گھانا لکھا جاتا ہے لیکن عربی کی قدیم تاریخوں اور جغرافیہ کی کتابوں اور نقشوں میں غانا لکھا جاتا رہا ہے۔ تیرھویں صدی میں موجودہ غانا کے شمالی حصوں سے دریائے

نائیجر تک سیاہ فام باشندوں کی ایک بڑی مملکت قائم تھی جسے عرب غانۃ الکفار کہتے تھے۔ یہ مملکت سونے کی پیداوار کی وجہ سے دُور دُور تک جانی جاتی تھی۔ پندرہویں صدی کے بعد یہاں کا ساحلی علاقہ غلاموں کے یورپی تاجروں کی بڑی منڈی بن گیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں غانا پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور انھوں نے اس ملک کا نام گولڈکوسٹ رکھا۔ ایک سو تیرہ سال انگریزوں کی غلامی میں رہنے کے بعد ۶۔ مارچ ۱۹۵۷ء کو یہ ملک آزاد ہوگیا اور نئی مملکت نے اپنے لیے غانا کا تاریخی نام اختیار کیا۔ عکرہ یا اکرا دارالحکومت ہے۔ غانا کا رقبہ ۹۲ ہزار مربع میل (دو لاکھ ۳۸ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) ایک کروڑ تیرہ لاکھ ہے۔ مسیحی تخمینے کے مطابق ۴۳ فیصد آبادی عیسائی اور بارہ فیصد مسلمان ہے۔

ڈاکٹر آرنلڈ نے اس صدی کے ربع میں اپنی کتاب "اشاعت اسلام میں لکھا تھا کہ "اس بات کی علامتیں ہیں کہ اشانتی (وسطی غانا) کے علاقے میں اسلام اکثریت کا مذہب ہو جائے گا کیونکہ وہاں کے بہت سے سردار اسلام قبول کر چکے ہیں۔ ڈیہومے (بنین) اور گولڈکوسٹ (غانا) کے علاقے میں اسلام برابر کامیابی حاصل کر رہا ہے۔ ڈیہومے اور اشانتی سب سے اہم بادشاہتیں ہیں اور ان کے مسلمان ہونے میں صرف وقت کی دیر ہے۔"

ڈاکٹر آرنلڈ کی اس تحریر کو تقریباً پون صدی گذر چکی ہے۔ لیکن نہ تو ڈیہومے مسلمان ہو سکا، نہ اشانتی اور غانا، بلکہ ان علاقوں میں صورت حال اسلام کے لیے ناسازگار ہی نظر آتی ہے۔ غانا جہاں موجودہ صدی کے آغاز میں برائے نام عیسائی تھے اب وہاں ان کا تناسب مسیحی دعووں کے مطابق ۴۳ فیصد تک پہنچ چکا ہے لیکن مسلمانوں کی تعداد صرف بارہ فیصد ہے۔ موتمر عالم اسلامی کراچی کے مطابق مسلمانوں کا تناسب چالیس فیصدی ہے۔ [1] لیکن یہ دعوٰی تحقیق طلب ہے۔

غانا میں مسلمانوں کی اکثریت صرف شمالی صوبہ میں ہے جس کا رقبہ ۲۷ ہزار مربع میل اور آبادی گیارہ لاکھ ۴۳ ہزار ہے۔ اشانتی میں مظاہر پرستی کو اب تک غلبہ حاصل ہے۔ عیسائیوں کی بیشتر تعداد جنوبی صوبے میں ہے جس کا رقبہ ۲۹ ہزار مربع میل اور آبادی ۲۶ لاکھ ہے۔

غانا میں بیشتر ابتدائی اور ثانوی مدد سے عیسائی تبلیغی ادارے چلا رہے ہیں۔ بعض اہم

(۱) دنیا کی مسلمان اقلیتیں (انگریزی) کراچی ۱۹۷۷ء

مدرسوں پر احمدی قادیانیوں کا قبضہ ہے جن کی تبلیغی سرگرمیاں بہت منظم ہیں۔ کوماسی میں دو یا تین مدرسے ایسے ہیں جن کو مسلمان چلا رہے ہیں۔ [1] مسلمانوں کی کئی تنظیمیں ہیں۔ ان میں غانا مسلم کونسل، غانا مسلم مشن، ینگ ویمنز مسلم ایسوسی ایشن، ینگ مینز مسلم ایسوسیایشن (شبان المسلمین) اہم ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں ایک نئی تنظیم اسلامک فاؤنڈیشن کے نام سے قائم ہوئی ہے۔ [2]

غانا کے مسلمان رہنماؤں میں حاجی امورواگالا (Imoru Egala) کا نام بہت اہم ہے۔ وہ مسلم کونسل کے صدر تھے۔ ۱۹۵۲ء میں نکرومہ کی کنونیشن پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے تھے اس کے بعد صدر نکرومہ کے زمانہ میں کئی وزارتوں میں رہے۔ ۱۹۶۶ء کے انقلاب کے وقت جس میں صدر نکرومہ کی حکومت کا تختہ پلٹا گیا وہ وزیر صنعت تھے۔ فوجی انقلاب کے بعد وہ ایک سال حراست میں رہے۔ ۱۹۷۲ء، ۱۹۷۸ء اور ۱۹۷۹ء میں تین اور فوجی انقلاب آئے۔ ۱۹۷۹ء میں جب سیاست پر سے پابندی اٹھالی گئی تو حاجی امورواگالا نے پیپلز نیشنل پارٹی قائم کی جس نے ہونے والے پارلیمانی انتخابات جیت لیے۔ ان کا یکم اپریل ۱۹۸۱ء کو ۶۷ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ [3]

غانا میں مسلمانوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے۔ ملک کے ہر حصہ میں مساجد موجود ہیں۔ دارالحکومت عکرہ میں جہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد ہے ایک شاندار جامع مسجد موجود ہے۔ حاجیوں کی تعداد فوجی انقلابوں کے بعد سے کم ہوتی جارہی ہے، لیکن اس کی وجہ مذہبی پابندی نہیں بلکہ زرمبادلہ کی کمی ہے۔ ۱۹۷۵ء میں تین ہزار پانچ سو افراد نے حج کیا تھا۔ ۱۹۷۹ء میں یہ تعداد تین ہزار چار سو، ۱۹۷۷ء میں دو ہزار نو سو، اور ۱۹۷۸ء میں ایک ہزار دو سو رہ گئی۔ ۱۹۷۹ء میں فوجی حکمران فلائٹ لفٹننٹ راولنگز نے یہ تعداد پانچ تک محدود کر دی۔ [4]

مسلمانوں کے لیے عائلی قوانین نافذ ہیں۔ مسلمان عام طور پر تجارت پیشہ ہیں۔ وزیروں کی حیثیت سے تو مسلمان حکومت میں موجود ہیں لیکن اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

---

(۱) ماہنامہ ''جرنل'' رابطۂ عالم اسلامی، مکہ، اگست ۱۹۸۱ء۔

(۲) ایضاً۔

(۳) ہفت روزہ ''مسلم ورلڈ'' کراچی ۱۱۔ اپریل ۱۹۸۱ء

(۴) امپیکٹ، لندن ۲۴۔ اگست ۱۹۷۹ء

آئیوری کوسٹ

آئیوری کوسٹ (ساحل عاج)، غانا کے مغرب میں اور (بالائی وولٹا) اپر وولٹا اور مالی کے جنوب میں واقع ہے۔ فرانس نے اس علاقہ پر ۱۸۴۲ء میں قبضہ کیا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں آزاد ہوا۔ آئیوری کوسٹ کا رقبہ ایک لاکھ ۲۴ ہزار مربع میل (۳ لاکھ ۲۲ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۱ء) ۸۶ لاکھ ہے۔ آبدجان، دارالحکومت ہے۔

آئیوری کوسٹ، بشمول غانا اور بالائی وولٹا، مغربی افریقہ کے ان علاقوں میں ہے جہاں مسلمانوں کے اثرات بہت دیر سے پہنچے اور جب یہاں ان کے اثرات بڑھنا شروع ہوئے تو فرانس کا اقتدار قائم ہوگیا۔ فرانس کے اقتدار کے ساتھ ساتھ مسیحی مبلغوں کی آمد شروع ہوگئی، لیکن ان مبلغوں کو وسائل کی کثرت کے باوجود زیادہ کامیابی نہیں ہوئی اور عیسائیوں کی تعداد خود مغربی ماخذ کے مطابق مسلمانوں سے نصف ہے۔ عیسائی آبادی دارالحکومت آبدجان اور ساحلی علاقے تک محدود ہے۔

آئیوری کوسٹ میں اسلام دیولا قبیلہ کے باشندوں کے ذریعہ پہنچا۔ اس قبیلے کے تمام لوگ جن کی تعداد ۱۹۵۵ء میں تین لاکھ ساٹھ ہزار تھی مسلمان ہیں۔ تجارت پیشہ ہونے کی وجہ سے دیولا باشندوں کے مرکز شہر اور قصبے تھے۔ ان باشندوں نے پندرہویں اور سولہویں صدی تک گیمبیا سے لے کر لائبیریا، گنی، بالائی دولٹا اور آئیوری کوسٹ تک سینکڑوں بستیاں قائم کر لی تھیں اور رفتہ رفتہ انھوں نے ان بستیوں کو شہری مملکتوں کی شکل دے دی۔ اس وقت آئیوری کوسٹ کے نصف شمالی حصے میں جس قدر شہری آبادی ہے وہ تقریباً سب کی سب مسلمان ہے۔ یہ تمام بستیاں دیولا باشندوں کی قائم کی ہوئی ہیں۔ مغربی مصنفین نے دیولا باشندوں کے بارے میں لکھا ہے کہ آئیوری کوسٹ میں اسلام کی توسیع واشاعت میں ان کا حصہ نمایاں ہے۔ ان کی کامیابی کا راز

رواداری، حسن اخلاق اور اسلام کی پابندی میں تھا۔ وہ جہاں کہیں آباد ہوتے تھے وہاں کی مقامی آبادی کا جزو ہو کر رہتے تھے۔ غیر مسلموں سے ملنے جلنے میں ان کو تکلف نہیں تھا اور وہ مقامی خواتین سے شادیاں بھی کر لیتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اسلامی خصوصیات برقرار رکھتے تھے اور اپنی جداگانہ حیثیت قائم رکھتے تھے۔ چونکہ وہ پرامن تاجر تھے اور علاقے کی خوشحالی کا باعث ہوتے تھے اس لیے آہستہ آہستہ ان کے تجارتی مرکزوں کے گرد بڑی بڑی مسلمان بستیاں قائم ہو جاتی تھیں۔ وہ گاؤں میں سوڈانی طرز کی مسجدیں بنا لیتے تھے اور ان میں قرآنی مدرسے قائم کر دیتے تھے۔ انکے اہل علم کتابیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے اور سفر میں بھی اپنے بچوں کو درس دیتے تھے۔ اس پُرامن طریقے کی وجہ سے ان کا ہر جگہ خیر مقدم کیا جاتا تھا اور خیر سگالی کے یہ جذبات بستی کے غیر مسلموں کو متاثر کرتے تھے اور وہ مسلمان ہو جاتے تھے۔

آئیوری کوسٹ کا نصف شمالی حصہ اور اس میں بھی شمالی مغربی حصہ مسلمان آبادی کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہاں کے شہر خصوصاً اودین، کورہوگو، کونگ، توبہ، سیگوئیلا، مان بوندوکو اور بواکہ کے باشندے یا تو سب کے سب مسلمان ہیں یا ان کی اکثریت مسلمان ہے۔ بواکہ، ملک کا دوسرا بڑا شہر اور صنعتی مرکز ہے۔

انگریز مصنف ٹرمنگھم نے اپنی مشہور کتاب ''مغربی افریقہ میں اسلام'' میں لکھا ہے کہ ۱۹۵۸ء میں آئیوری کوسٹ کی پندرہ فیصد آبادی مسلمان ہے۔ لیکن اب خود مغربی ذرائع کے مطابق آئیوری کوسٹ کی ۲۵ فیصد آبادی مسلمان اور بارہ فیصد عیسائی ہے۔

مغربی افریقہ میں تجدید و اصلاح کی جو تحریکیں چل رہی ہیں ان سے آئیوری کوسٹ کے مسلمان بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ مغربی افریقہ کے دوسرے مسلمانوں کی طرح آئیوری کوسٹ کے مسلمان بھی تصوف کے قادری اور تجانی سلسلوں سے وابستہ ہیں۔ لیکن فرانسیسی دَور میں یہ سلسلے فرانس سے تعاون کی وجہ سے اپنا اثر و رسوخ بہت کچھ کھو چکے ہیں اور ان کی جگہ تین ہم مذہبی تحریکیں آہستہ آہستہ اپنا مقام پیدا کر رہی ہیں۔ ان میں ایک مرید تحریک ہے، دوسری حمالی تحریک ہے اور تیسری وہابی تحریک ہے۔

حمالی تحریک، انیسویں صدی کے آخر میں مالی کے شہر نیورو (Nioro) سے شروع ہوئی اور جلد ہی سابق فرانسیسی مغربی افریقہ کے بڑے حصے میں پھیل گئی۔ آئیوری کوسٹ میں حمالیوں کے

سب سے ممتاز رہنما یعقوب سلا تھے۔ عرب قوم پرستوں سے تعلقات قائم رکھنے اور فرانسیسی سامراج کی مخالفت کی وجہ سے وہ عرصے تک فرانسیسی حکومت کے معتوب رہے۔ وہابی تحریک بھی آئیوری کوسٹ میں کافی مقبول ہوئی۔ اگرچہ اس تحریک کے حامی مذہبی حیثیت سے کامیابی حاصل نہ کر سکے لیکن نظام تعلیم میں اصلاح کے معاملے میں ان کو جدید طبقہ کی حمایت حاصل ہوگئی۔ اس تحریک کے حامی ایسا نظام تعلیم چاہتے ہیں جو جدید ضروریات کو بھی پوری کرے اور اسلامی تعلیمات سے بھی بے تعلق نہ ہو۔

لائبیریا

افریقہ کی یہ ریاست امریکہ کے رفاہی اداروں کی بدولت وجود میں آئی۔ جب امریکہ میں افریقی غلاموں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو غرب الہند اور امریکہ میں ان کی اکثریت ہو جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ اس خطرے کو روکنے کے لیے انیسویں صدی میں غلامی پر پابندی لگا دی گئی اور افریقہ سے ان کی درآمد بند کر دی گئی۔ امریکہ میں ایک انجمن قائم ہوئی کہ غلاموں کو آزاد کر کے افریقہ واپس بھیجا جائے۔ چنانچہ امریکہ میں جو غلام آزاد کر دیئے جاتے تھے ان کو لا کر لائبیریا میں آباد کیا جاتا تھا۔ اس طرح ۱۸۲۲ء میں اس جگہ جہاں اب دارالحکومت مونروویا آباد ہے پہلی بستی قائم ہوئی۔ اس کے بعد ۲۶ جولائی ۱۸۴۷ء کو آزاد جمہوریہ لائبیریا وجود میں آئی جسے برطانیہ اور فرانس نے بھی تسلیم کر لیا۔ لائبیریا، افریقہ کی پہلی جمہوریہ ہے۔

لائبیریا کا ملک تین طرف سے آئیوری کوسٹ، گنی اور سیرالیون سے گھرا ہوا ہے۔ رقبہ ۴۳ ہزار مربع میل (ایک لاکھ بارہ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۷۹ء) اٹھارہ لاکھ ہے۔ آبادی کی تعداد اور مختلف مذاہب کے پیرووں کی تعداد کے بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔ ڈیلی نیوز، نیویارک کی ورلڈ المنیک ۱۹۸۰ء میں مسلمانوں کا تناسب دس سے بیس فیصد تک اور عیسائیوں کا تناسب دس فیصد بتایا گیا ہے، لیکن اقوام متحدہ کی ڈیموگرافک ایئر بک ۱۹۶۱ء کے مطابق مسلمان ۴۵ فیصد ہیں۔ یہی تناسب موتمر عالم اسلامی کے کتابچہ میں بتایا گیا ہے۔

لیکن مسلمانوں کی اس کثیر تعداد کے باوجود ملک کے اصل حکمران عیسائی ہیں اور مسلمانوں کی حالت بہت خستہ ہے۔ حبش کے بعد افریقہ میں شاید لائبیریا واحد ملک ہے جہاں مسلمان بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود اتنے پست ہیں۔ ہفت روزہ یقین، کراچی مورخہ ۲۲/ مئی ۱۹۶۷ء کے مطابق مسلمانوں کا حکومت میں کوئی حصہ نہیں، وہ تعلیم سے محروم ہیں، ایک بھی

مدرسہ مسلمانوں کا نہیں، ملازمتوں میں مسلمان ناپید ہیں۔ جب سوڈان نے حبش میں مسلمانوں پر مظالم کا سوال افروایشیائی اسلامی کانفرنس میں اٹھایا تو کینیا اور لائبیریا نے مخالفت کی۔

موتمر عالم اسلامی، کراچی کے کتابچہ میں بتایا گیا ہے کہ دارالحکومت مونرودیا میں تین مسجدیں ہیں اور اگرچہ سارے ملک میں چھوٹی چھوٹی مسجدیں موجود ہیں لیکن مزید مسجدوں کی ضرورت ہے۔ قرآن اور اس کے انگریزی ترجمے قابل حصول ہیں لیکن آزادی کے ساتھ نہیں۔ دوسری دینی کتابیں بھی آسانی سے نہیں ملتیں۔ مسلمانوں کے شخصی قوانین نافذ ہیں اور ہر سال ڈیڑھ سو افراد حج کو جاتے ہیں۔ دارالحکومت میں دینی تعلیم کے پانچ مدرسے اور چند دیگر مدرسے دوسرے مقامات پر ہیں۔ مسجدوں میں بھی بنیادی اسلامی تعلیم دی جاتی ہے۔ مسلمان اعلیٰ تعلیم میں بہت پیچھے ہیں۔ کاروبار اور دوسرے پیشوں میں بھی مسلمان موجود نہیں، یونیورسٹی کے اساتذہ میں کوئی مسلمان نہیں۔ اعلیٰ ملازمتوں میں بہت کم مسلمان ہیں۔ نیشنل مسلم کونسل آف لائبیریا مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم ہے جس کا رابطہ عالم اسلامی سے تعلق قائم ہے۔

سیرالیون

سیرالیون دو طرف سے لائبیریا اور گنی سے گھرا ہوا ایک خوبصورت ملک ہے جو لائبیریا کی طرح غلاموں کی وجہ سے وجود میں آیا۔ ۱۷۸۷ء میں مقامی سرداروں نے کچھ زمین انگریزوں کو اس لیے دی تھی کہ وہاں ان افریقی باشندوں کو آباد کیا جائے جو لندن میں بے سہارا ہیں۔ لائبیریا کے شہر مونرودیا کی طرح شہر فری ٹاون بھی جو سیرالیون کا دارالحکومت ہے اسی طرح وجود میں آیا۔ بعد میں یہ بستی ان افریقی غلاموں کی آبادکاری کے لیے استعمال ہونے لگی جن کو غلاموں کو لے جانے والے جہازوں سے نجات دلائی جاتی تھی۔ اندرونی علاقے پر انگریزوں نے بعد میں قبضہ کیا اور ۲۱۔ اگست ۱۸۹۶ء کو پورے ملک کو برطانوی محروسہ قرار دے دیا۔ سیرالیون نے ۲۷۔ اپریل ۱۹۶۱ء کو آزادی حاصل کی۔

سیرالیون کا رقبہ ۲۸ ہزار مربع میل (۷۲ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۱ء) ½۳۶ لاکھ ہے۔ ورلڈ المینیک ۱۹۸۰ء کے مطابق سیرالیون کی ۲۵ فیصد آبادی مسلمان ہے اور پانچ فیصد عیسائی۔ عیسائی زیادہ تر ان آزاد غلاموں کی اولاد ہیں جو پچھلی صدی میں یہاں آباد کیے گئے تھے اور (greolen) کہلاتے ہیں۔ اور جن کی تعداد اب ساٹھ ہزار سے زیادہ ہے۔ یہی لوگ حکومت پر قابض ہیں اور ملک کے سب سے زیادہ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

رابطۂ عالم اسلامی، مکہ کے پرچہ دی جرنل میں ایک افریقی مسلمان ڈاکٹر اے رحمن آئی دوئی (Doi) کا ایک مضمون مغربی افریقہ کی مسلمان اقلیتوں کے بارے میں شائع ہوا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ ''اندازہ ہے کہ صدر مقام فری ٹاؤن میں پچاس ہزار مسلمان اور چالیس ہزار عیسائی ہیں۔ بڑی مسجدوں کی تعداد سترہ ہے اور ایک سو چھوٹی مسجدیں ہیں جو دیکھنے میں مسجدیں نہیں لگتیں۔ لیکن کلیساؤں کی تعداد ۶۵ ہے جو پندرہ مختلف مسیحی فرقوں سے متعلق ہیں۔ ان تمام

کلیساؤں کے تحت بڑی تعداد میں مدرسے چل رہے ہیں جن میں عیسائیت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف مسلمانوں کے مدرسے بہت معمولی ہیں اور عملہ اور اساتذہ سند یافتہ نہیں۔ اگر معقول اسکول ہیں تو وہ احمدیوں کے ہیں۔ (۱)

رابطۂ عالم اسلامی کے ماہنامہ جرنل کی ایک تازہ اشاعت میں سیرالیون پر ایک مفید مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ سیرالیون میں مسلمانوں کا تناسب ۸۵ فیصد ہے اور عیسائی صرف چھ فیصد۔ مسلمانوں کی دس پندرہ تنظیمیں ہیں جن میں سیرالیون مسلم کانگریس سب سے اہم ہے۔ اس کا مقصد اسلام کی اشاعت، مغربی افریقہ کے مسلمانوں سے تعلقات کا فروغ اور عربی اور اسلام کی تعلیم کا انتظام کرنا ہے۔ کانگریس نے ۱۹۴۸ء میں پہلی مرتبہ تین طلبہ کو اعلیٰ دینی تعلیم کے لیے جامعہ ازہر (قاہرہ) بھیجا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ جاری رہا اور ۱۹۸۰ء تک ایک سو ستر طلبہ جامعہ ازہر، مدینہ یونیورسٹی اور ریاض یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ مضمون میں بتایا گیا ہے کہ سیرالیون میں احمدیوں کا بہت اثر ہے۔ ملک میں احمدی سات ثانوی مدرسے، دو شفاخانے اور تین سو مسجدیں احمدیوں کی ہیں جبکہ مسلم کانگریس کے تحت ایک ثانوی مدرسہ، نو ابتدائی مدرسے اور چودہ سو مسجدیں ہیں۔ (۲)

---

(۱) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل، مکہ۔ اگست ۱۹۸۱ء

(۲) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ)۔ جنوری ۱۹۸۳ء

بحر ہند اور بحر الکاہل

ماری شس

ماریشس، بحر ہند کے جنوب مغربی حصے میں مدغاسکر کے مغرب میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جس کا کل رقبہ سات سو بیس مربع میل (ایک ہزار آٹھ سو مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۱ء) دس لاکھ ہے۔ پورٹ لوئی، دارالحکومت ہے۔ جزیرے کی ۴۹ فیصد آبادی ہندو، ۳۳ فیصد عیسائی اور ۱۶ فیصد مسلمان ہے۔ اس حساب سے مسلمانوں کی کل تعداد ایک لاکھ ہزار ہوتی ہے۔ انگریزی سرکاری زبان ہے، فرانسیسی کا بھی رواج ہے۔ ہندو باشندے ہندی اور مسلمان اردو بولتے ہیں۔

عرب جہاز راں دسویں صدی سے اس جزیرے سے واقف تھے۔ یورپ والوں کو اس کا علم پہلی مرتبہ سولہویں صدی میں ہوا جب ۱۵۰۷ء میں پرتگالی یہاں پہنچے۔ ۱۵۹۸ء میں ولندیزوں نے اور ۱۷۱۰ء میں فرانسیسیوں نے ماری شس پر قبضہ کیا اور آخر میں ۱۸۱۰ء میں پھر انگریز قابض ہو گئے۔ ۱۲۔ مارچ ۱۹۶۸ء کو ماری شس آزاد ہو گیا۔

گنا یہاں کی خاص پیداوار ہے جسے ولندیزوں نے شروع کیا تھا۔

ماری شس میں مسلمانوں کی پہلی آبادی اب سے ڈھائی سو سال پہلے وجود میں آئی۔ یہ وہ مسلمان سپاہی تھے جو فرانسیسی فوج کے ساتھ آئے تھے۔ ان ہی مسلمانوں نے جزیرہ میں پہلی مسجد کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد انگریزی دور میں بہار اور بنگال سے ٹھیکہ پر مزدور بلائے گئے اور انھوں نے اس جزیرے میں باقاعدہ اسلامی معاشرہ قائم کیا۔ یہ مسلمان اسلامی احکام پر اس سختی سے عمل کرتے تھے کہ شرابیوں اور جواریوں کو سزا تک دی جاتی تھی۔[1]

۱۹۱۰ء میں مسلمانوں نے "اخوت الاسلام" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ ۱۹۲۷ء میں

---

(۱) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ)۔ اگست ۱۹۸۱ء

پورٹ لوئی میں مسلم ہائی اسکول قائم کیا گیا۔ ۱۹۴۵ء میں اسلامک کلچرل ایسوسی ایشن قائم کی گئی جس نے ۱۹۴۹ء میں شہر کیور پائپ (curepipe) میں ایک اسلامک کلچرل کالج قائم کیا۔ ۱۹۵۷ء میں ''مسلم یوتھ فیڈریشن قائم ہوئی۔ ۱۹۵۹ء میں پاکستان کی جماعت اسلامی سے متاثر لوگوں نے ''اسلامک سرکل'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی۔ فرانسیسی زبان میں اسلام سے متعلق مطبوعات شائع کیں اور عربی زبان اور اسلامی تعلیمات سے متعلق درس کا انتظام کیا۔ ۱۹۷۳ء میں یونیورسٹی کے طلبہ کی ایک جماعت نے اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ (sim) کے نام سے ایک نئی تنظیم قائم کی تاکہ اسلام کو بحیثیت تحریک متعارف کرایا جائے۔ ۱۹۷۵ء میں اسلامک موومنٹ کی تحریک پر خواتین نے ویمن اسلامک مومنٹ (wim) قائم کی۔

اس وقت اسلامک مومنٹ (sim) کی بیس شاخیں اور ایک ہزار ہمدرد ہیں۔ اسلامی تعلیمات کو عام کرنے میں طلبہ کی اس تحریک نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ تحریک کی طرف سے ہر ماہ ایک اخبار شائع کیا جاتا ہے جس کا نام پہلے سم نیوز تھا، اب اس کا نام (renaissance islamique) کر دیا گیا ہے۔ سم کی ہر شاخ میں ایک کتب خانہ ہے۔ ایک سمعی بصری شعبہ ہے جو ریڈیو اور ٹی وی کے لیے اسلامی پروگرام تیار کرتا ہے۔ تحریک کا ایک تحقیقاتی شعبہ بھی ہے۔ سم کی کوششوں سے ایک اسلامک دعوی سوسائٹی بھی قائم کی گئی ہے جو ان نومسلموں پر مشتمل ہے جو اسلام کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں۔ سم کا اپنا چھاپہ خانہ بھی ہے۔[1]

ماریشس میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی ہے لیکن اسلامی شخصی قوانین نافذ نہیں۔ ہاں حال ہی میں جزیرہ کی قانون ساز اسمبلی نے اس معاملہ میں مسلمانوں کا مطالبہ مان لیا ہے۔ توقع ہے کہ جلد یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔[2]

ماریشس میں مسجدوں کی تعداد اکانوے ہے۔ پورٹ لوئی میں تین بڑی اور شاندار مسجدیں ہیں۔ یہاں سے کم از کم ڈھائی سو افراد ہر سال حج کو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی اکثریت کاشت کار ہے۔ تاجر بھی کافی تعداد میں ہیں۔ سرکاری ملازمتوں خصوصاً اعلیٰ ملازمتوں میں امتیازی سلوک کی وجہ سے تعداد کم ہے۔ مسلمان عام طور پر وزیر اعظم رام غلام کی پارٹی کے حامی ہیں۔

(۱) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ)۔ اگست ۱۹۸۱ء

(۲) ہفت روزہ ''مسلم ورلڈ'' کراچی۔ یکم اگست ۱۹۸۱ء

آسٹریلیا

آسٹریلیا کا رقبہ ½۲۹ لاکھ مربع میل (۷۶ لاکھ ۸۲ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) ایک کروڑ ۴۶ لاکھ ہے۔ باشندے مختلف مسیحی فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں، کسی ایک فرقہ کو اکثریت حاصل نہیں۔ یہودیوں کی تعداد نیوزی لینڈ سمیت ۷۵ ہزار ہے۔ دو لاکھ کے قریب قدیم باشندے ہیں۔ آسٹریلیا ایک وفاق ہے جو چھ ریاستوں اور دو علاقوں پر مشتمل ہے۔ کینبرا، وفاقی دارالحکومت ہے۔

آسٹریلیا میں سب سے پہلے جو مسلمان پہنچے وہ پٹھان شتربان تھے۔ ان کو ۱۸۶۰ء اور اس کے بعد ریگستانی علاقوں میں بار برداری کا کام کرنے کے لیے پاکستان سے لایا گیا تھا۔ آسٹریلیا کی پہلی مسجد ۱۸۹۰ء میں جنوبی آسٹریلیا کے صدر مقام ایڈیلیڈ میں ان ہی پٹھانوں نے تعمیر کی تھی۔ ان پٹھانوں کی تعداد کبھی چار سو سے زیادہ نہیں ہوئی۔ پھر جوں جوں اونٹوں کی افادیت کم ہوتی گئی ان مسلمان شتربانوں کی تعداد بھی کم ہوتی گئی۔ ان کو کوشش کے باوجود آسٹریلیا کی شہریت نہیں دی گئی جس کی وجہ سے ان کی بڑی تعداد واپس وطن چلی گئی۔ بعض نے سفید عورتوں سے شادی کر لی اور ان کی اولاد بتدریج مرتد ہو گئی۔[1]

آسٹریلیا میں مسلمانوں کی آمد کا اصل دور دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۵۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ شروع میں صرف سفید فام باشندوں کو آباد ہونے کی اجازت تھی۔ چنانچہ اس زمانہ میں یوگوسلاویا، بعض دوسرے یورپی ملکوں اور لبنان سے لوگ نقل وطن کر کے آسٹریلیا پہنچے۔ ان میں مسلمانوں کی بھی خاص تعداد تھی۔ ۱۹۷۳ء میں نوآبادکاروں سے متعلق یہ امتیازی پالیسی ختم کر دی

---

(۱) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ) مارچ ۱۹۸۲ء، ملاحظہ کیجئے اے، کے، ایم فاروقی کا مضمون ''جنوبی آسٹریلیا میں اسلام کی آمد''۔ مضمون نگار ایڈیلیڈ یونیورسٹی میں تاریخ کے معاون پروفیسر ہیں۔ یہ مضمون ''ہمدرد اسلامیکس'' کراچی میں پہلے شائع ہوا تھا۔

گئی جس کے بعد ایشیا سے بھی لوگ آنا شروع ہو گئے۔ ترک بڑی تعداد میں آئے، پھر پاکستان اور ہندوستان کے مسلمان پہنچے۔ ان میں طلبہ بھی بڑی تعداد میں آئے اور ملازمت پیشہ بھی اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں تخمینے مختلف ہیں۔ ترکی کے محکمہ مذہبی امور کے ترجمان پندرہ روزہ ''دیانت گزٹ'' انقرہ ۱۵۔فروری ۱۹۸۰ء کے مطابق مسلمانوں کی تعداد تین لاکھ ہے جن میں چالیس ہزار ترک مزدور ہیں۔ لیکن ایڈیلیڈ یونیورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسر فاروقی نے مسلمانوں کی تعداد ڈھائی لاکھ بیان کی ہے۔ ان میں ایک لاکھ بیس ہزار ریاست نیوساوتھ ویلز میں ہیں اور اسی ہزار وکٹوریہ میں ہیں۔ جنوبی آسٹریلیا میں ۱۹۷۶ء میں ایک ہزار ۳۴ مسلمان تھے۔[1] تازہ اعداد و شمار نہیں معلوم۔[2]

کہا جاتا ہے کہ وکٹوریہ کے صدر مقام میلبورن میں مسلمانوں کی تعداد دوسرے شہروں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ یہ مسلمان البانیا، مصر، پاکستان، ہندوستان، لبنان، ترکی، یوگوسلاویا اور ملیشیا سے تعلق رکھتے ہیں۔

مسلمانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد مغربی آسٹریلیا کے صدر مقام پرتھ میں بھی آباد ہو گئی ہے۔

آسٹریلیا میں مسلمانوں نے پہلی مسجد ۱۸۹۰ء میں ایڈیلیڈ میں تعمیر کی تھی۔ اس کے لیے زمین ایک پٹھان حاجی ملا مہربان نے خرید کر دی تھی۔ اس کے بعد دوسری مسجد ۱۹۰۶ء میں پرتھ میں تعمیر ہوئی اور تیسری مسجد ۱۹۰۷ء میں ملبورن میں تعمیر ہوئی۔ ۱۹۷۰ء تک میلبورن میں پندرہ مسجدیں بن چکی تھیں۔ مسلمان ملکوں کے سفارت خانوں نے وفاقی دارالحکومت کینبرا میں بھی ایک مسجد بنائی ہے۔ تسمانیہ میں مسلم ایسوسی ایشن نے صدر مقام ہوبارٹ میں ایک نئی عمارت عبادت گاہ کے لیے حاصل کر لی ہے جو مسجد اور اسلامی مرکز کے طور پر استعمال ہو گی۔ یہاں جمعہ کی پہلی

---

(۱) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ)۔ مارچ ۱۹۸۲ء۔

(۲) سرکاری مردم شماری کے مطابق ۱۹۷۶ء میں آسٹریلیا میں ۵۳ ہزار ۴ سو یہودی اور ۴۵ ہزار دو سو پانچ مسلمان تھے۔ ۱۹۸۰ء میں مسلمانوں کی تعداد ۷۶ ہزار سات سو ۹۲ ہو گئی جبکہ یہودیوں کی آبادی ۶۲ ہزار ایک سو چھبیس ہے۔

اسلامک ہیرلڈ، کوالالمپور، جلد ۶ شمارہ ۱۰۔۱۱

نماز ۲۔ مئی ۱۹۸۰ء کو پڑھی گئی۔ [1]

آسٹریلیا میں قرآن آسانی سے مل جاتا ہے اور انگریزی ترجمہ بھی دستیاب ہے، لیکن اسلام سے متعلق کتابوں کا حصول مشکل ہے۔ بچوں کی تعلیم کے لیے بھی ابھی تک اطمینان بخش انتظام نہیں ہوا ہے۔

آسٹریلیا میں مسلمانوں کی مرکزی تنظیم "آسٹریلن فیڈریشن آف اسلامک کونسلز" ہے۔ اس فیڈریشن کی ہر ریاست میں شاخیں ہیں۔ اس کے علاوہ طلبہ کی انجمنوں کا بھی ایک وفاق موجود ہے۔

---

(۱) اسلامک ہیرلڈ، جلد ۴، شمارہ ۱۱۔ ۱۲ (۱۹۸۰ء)

نیوزی لینڈ

نیوزی لینڈ کا رقبہ ایک لاکھ تین ہزار مربع میل (دو لاکھ ۶۱ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۱ء) ۳۲ لاکھ ہے۔ دارالحکومت ولنگٹن ہے۔ آسٹریلیا کی طرح یہاں کی آبادی بھی یوروپی ہے۔ ڈھائی لاکھ کے قریب قدیم باشندے ہیں جو ماوری (maori) کہلاتے ہیں۔ ستر فیصد آبادی پروٹسنٹ عیسائی ہے کیتھولک صرف سولہ فیصد ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد موتمر عالم اسلامی، کراچی کے مطابق پانچ ہزار ہے لیکن رابطۂ عالم اسلامی کے ماہنامہ دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ) نومبر ۱۹۸۰ء کے مطابق مسلمانوں کی تعداد تین اور چار ہزار کے درمیان ہے۔[1]

مسلمان البانیا، مصر، قبرص، فیجی، ہندوستان، پاکستان، سری لنکا، شام، ترکی اور یوگوسلادیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈھائی سو مقامی مسلمان ہیں۔[2] اور چار سو مخلوط والدین سے ہیں۔ تین ہزار مسلمانوں کو نیوزی لینڈ کی شہریت مل گئی ہے۔[3]

مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد شہر آکلینڈ میں ہے یعنی ڈیڑھ اور دو ہزار کے درمیان۔ شہر میں مسجد زیر تعمیر ہے جہاں روزانہ درس قرآن دیا جاتا ہے۔

ولنگٹن میں ایک ہزار مسلمان ہیں۔ یہاں ایک اسلامی مرکز ہے جس میں درس قرآن کا انتظام ہے۔

کرائسٹ چرچ میں مسلمانوں کی تعداد صرف تین سو ہے۔

ہر علاقہ میں مسلمانوں کی انجمنیں ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں تمام انجمنوں کی ایک فیڈریشن بنادی

(۱) تین اور چار ہزار کی یہ تعداد زیادہ قابل اعتماد ہے کیونکہ جرنل میں یہ معلومات ڈاکٹر محمد حنیف قاضی نے فراہم کی ہیں جو فیڈریشن آف اسلامک ایسوسی ایشنز (Fianz) کے سیکرٹری ہیں۔

(۲) مسلمان اقلیتیں (انگریزی) کراچی ۱۹۷۷ء

(۳) ایضاً۔

گئی ہے جس کو مختصر طور پر (fianz) کہا جاتا ہے۔

موتمر کی اطلاع کے مطابق ۱۹۷۷ء میں مسلمانوں میں پچاس مرد اور پندرہ عورتیں گریجویٹ تھیں، تیس ڈاکٹر، وکیل اور انجینئر تھے اور کچھ مسلمان یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔

فیجی

فیجی، بحرالکاہل میں نیوزی لینڈ کے شمال میں گیارہ سو میل کے فاصلے پر ایک مجمع الجزائر کا نام ہے جس کا صدر مقام سووا ہے۔ مجموعی رقبہ سات ہزار مربع میل (اٹھارہ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) ۶ لاکھ پندرہ ہزار ہے۔ ۱۸۷۴ء میں فیجی پر برطانیہ کا قبضہ ہوا اور ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو آزادی ملی۔

فیجی میں مسلمانوں کی آمد برطانوی دور میں شروع ہوئی۔ اس دور میں یہاں گنے کی کاشت اور شکر سازی کی صنعت کو فروغ دیا گیا، یہ صنعت اب بھی جزیرہ کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ انگریزوں نے مزدوروں کی کمی دور کرنے کے لیے ٹھیکہ کے تحت ہندوستان سے مزدور بلائے۔ پاکستان اور ہندوستان کے باشندوں کی پہلی جماعت ۱۸۸۰ء میں فیجی پہنچی اور یہ سلسلہ ۱۹۱۱ء تک جاری رہا۔ ۱۹۱۱ء میں یہ نظام ختم کر دیا گیا، جس کے بعد کچھ لوگ واپس چلے گئے لیکن اکثریت نے فیجی میں رہائش اختیار کر لی۔

ہندوستان اور پاکستان سے آدمیوں کی مسلسل درآمد کے نتیجے میں فیجی کی مقامی آبادی اقلیت بن گئی ہے۔ ۱۹۶۶ء کی مردم شماری کے مطابق چار لاکھ ۷۶ ہزار آبادی میں دو لاکھ چالیس ہزار ہندوستانی اور دو لاکھ دو ہزار فیجی کے باشندے تھے۔ باقی آبادی یورپی باشندوں، چینیوں اور دوسرے جزیروں سے آئے ہوئے باشندوں پر مشتمل ہے۔

مقامی آبادی کی اکثریت عیسائی ہے جبکہ ہندوستانی آبادی کی اکثریت ہندو ہے۔ ان میں ½۱۵ فیصد مسلمان ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں مسلمانوں کی تعداد ۵۴ ہزار ۲ سو ۷۴ تھی جو کل آبادی کا سات اعشاریہ سات فیصد تھے۔ عیسائی دو لاکھ ۹۹ ہزار اور ہندو دو لاکھ ۳۴ ہزار تھے۔ فیجی کے مسلمانوں کی ۷۵ فیصد تعداد دیہی علاقوں میں رہتی ہے۔ صوبہ با (ba) میں سب سے زیادہ

مسلمان آباد ہیں یعنی ایک لاکھ ۶۷ ہزار میں بیس ہزار یا تقریباً بارہ فیصد مسلمان ہیں۔ دارالحکومت سووا کی ۶۳ ہزار آبادی میں آٹھ ہزار سات سو مسلمان ہیں یعنی تیرہ فیصد سے کچھ زیادہ۔[1]

ہندو مسلم کشمکش

فیجی کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کی تاریخ برصغیر کی ہندو مسلم کشمکش سے مشابہ رہی ہے، لیکن یہ کشمکش برصغیر کی طرح شدید نہیں ہے۔ یہاں بھی مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ ہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد فیجی مسلم لیگ نے موتمر عالم اسلامی اور رابطۂ عالم اسلامی سے وابستگی اختیار کر لی ہے۔ حال ہی میں جب جنوب مشرقی ایشیا اور بحرالکاہل کی علاقائی اسلامی تنظیم قائم کی گئی تو اس کے قیام میں فیجی کے مسلمانوں نے بھی حصہ لیا۔[2] سیاست میں مسلمان، فیڈریشن پارٹی کے حامی رہے۔ ہیں جس کا نام ۱۹۶۸ء سے نیشنل فیڈریشن پارٹی ہو گیا ہے۔ اس پارٹی کے تحت ایک مسلمان صدیق کویا پہلی مرتبہ مجلس قانون ساز میں منتخب ہوئے۔

موتمر عالم اسلامی کی اطلاع کے مطابق ۱۹۷۰ء میں فیجی میں مسجدوں کی تعداد بیس تھی لیکن کم از کم پانچ مسجدوں کی اور ضرورت تھی۔ فیجی میں اسلامی شخصی قوانین نافذ ہیں۔ قرآن کے انگریزی اور اردو ترجمے بھی دستیاب ہیں لیکن اسلامی کتب کی چھپائی کا کوئی انتظام نہیں۔ اسلامی تعلیم کا انتظام بھی اطمینان بخش نہیں۔[3] سووا یونیورسٹی سے ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۹ء کے درمیان فیجی کے ۷۳ مسلمان طلبہ نے اسناد حاصل کیں۔ ۱۹۷۶ء میں ۵۷ ڈاکٹروں میں صرف تین مسلمان تھے اور اکتالیس ہندو تھے۔ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں بھی مسلمان تناسب سے کم ہیں۔ قومی زندگی کی ان کمزوریوں کو تسلیم کرتے ہوئے سووا یونیورسٹی کے پروفیسر احمد علی کا کہنا ہے کہ ''فیجی کے مسلمانوں کا قومی تشخص محفوظ ہے۔ ان کو عبادت کی آزادی ہے اور زندگی کے کسی پہلو

---

(۱) فیجی کے مسلمانوں سے متعلق بیشتر معلومات کی بنیاد حسب ذیل دو مضامین پر ہے۔ ان میں ایک مضمون فیجی مسلم لیگ کے صدر ایس۔ ایم۔ کے شیرائی کا ہے جو ہفت روزہ مسلم ورلڈ، کراچی مورخہ ۱۲۔ دسمبر اور ۱۹۔ دسمبر ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مضمون جنوبی بحرالکاہل کی یونیورسٹی واقع سووا میں انسٹی ٹیوٹ آف سوشل اینڈ ایڈمنسٹریٹوسٹڈیز کے ڈائریکٹر احمد علی کا ہے جو جدہ یونیورسٹی کے مسلمان اقلیتوں کے انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ ''جرنل'' ۱۹۸۰ء۔ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا ہے۔

(۲) ہفت روزہ ''مسلم ورلڈ'' کراچی۔ ۱۲۔ دسمبر اور ۱۹۔ دسمبر ۱۹۸۱ء

(۳) مسلمان اقلیتیں (انگریزی) موتمر عالم اسلامی، کراچی ۱۹۷۷ء

میں ان کو قانونی مشکلات نہیں۔ ان کی نشستیں محفوظ ہیں۔ میلاد النبی کو قومی تعطیل کا دن قرار دے دیا گیا ہے، مسلم مدارس موجود ہیں اور مسجدوں کی تعمیر و توسیع کا کام جاری ہے۔ (۱)

۱۹۷۱ء میں فیجی اسٹوڈنٹس اسلامی سوسائٹی قائم کی گئی ہے تا کہ مسلمان طلبہ کو دینی فرائض پر عمل کرنے میں مدد دے۔ (۲)

---

(۱) جرنل (جدہ یونیورسٹی) شمارہ موسم سرما ۱۹۸۰ء گرما ۱۹۸۱ء

(۲) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ)۔ اگست ۱۹۸۱ء

نیو کیلے ڈونیا

نیو کیلے ڈونیا کا جزیرہ، فیجی اور شمال مشرقی آسٹریلیا کے درمیان واقع ہے۔ رقبہ ½7 ہزار مربع میل (19 ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی ½1 لاکھ کے قریب ہے۔ فرانس کا قبضہ ہے اور جزیرے کی تقریباً ایک تہائی آبادی فرانسیسی باشندوں پر مشتمل ہے۔ اسلامی ایسوسی ایشن نومیا (نیو کیلے ڈونیا) کے عبدہ محمد کی اطلاع کے مطابق مسلمانوں کی بیشتر آبادی جزیرے کے دوشہروں بوریل (bourail) اور نومیا (noumea) اور ان کے گردونواح میں آباد ہے۔

بوریل کے مسلمان ان الجزائری مسلمانوں کی اولاد ہیں جو ۱۸۷۲ء میں یہاں قیدی کی حیثیت سے لائے گئے تھے۔ ان کی تعداد کئی ہزار تھی۔ ان کو یہاں محنت طلب کاموں میں جیسے بستیوں کی تعمیر، سڑکوں کی تعمیر اور نکل کی کانوں میں کام کرنا ہے استعمال کیا گیا۔ یہ لوگ اگرچہ خود کو مسلمان اور عرب کہتے ہیں لیکن ان کو نہ عربی زبان آتی ہے اور نہ اسلام سے واقف ہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سے ناواقف ہو گئے ہیں۔ عیدین کی نمازیں تک نہیں پڑھتے۔ ہر تین ماہ میں ایک جگہ جمع ہو کر ایک گائے ذبح کرتے ہیں۔ لیکن وہ اپنا جداگانہ تشخص قائم کیے ہوئے ہیں۔ ان کا قبرستان الگ ہے، غیر مسلموں میں شادی کرتے ہیں لیکن یہ شادی گرجوں میں نہیں ہوتی اور ان میں بچوں کی ختنہ کرنے کا رواج ہے۔

بوریل کے برعکس دارالحکومت نومیا کے مسلمانوں کی اکثریت انڈونیشی ہے۔ ان لوگوں کو آئے ہوئے پانچ سال سے چالیس سال کی مدت گذر چکی ہے۔ تعداد پانچ اور چھ ہزار کے درمیان ہے۔ انڈونیشی زبان بولتے ہیں اور اسلام پر عمل کرتے ہیں۔ عید اور میلادالنبی کے تہوار مناتے ہیں۔ نومیا میں صومالیہ اور یمن کے مسلمان بھی پائے جاتے ہیں۔ وہ عربی اور فرانسیسی دونوں زبانیں بولتے ہیں اور اسلام پر عمل کرتے ہیں۔ عربوں اور انڈونیشی باشندوں کی اپنی الگ

الگ تنظیمیں ہیں، لیکن اب اسلامی سرگرمیوں کے لیے ایک اسلامی ایسوسی ایشن بن گئی ہے جس کا دفتر نومیا میں ہے۔ یہ جماعت نومیا میں پہلی مسجد بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ [1]

---

(۱) جدہ یونیورسٹی کے مسلمان اقلیتوں کے انسٹی ٹیوٹ کے مجلہ ''جرنل'' جلد ۳ شمارہ نمبر ۱۲ ۱۹۸۱ء صفحہ ۲۰۷، ۲۱۰ مضمون نگار پورا نام (Abdou Muhammed aqueh Taeleb) ہے۔

پاپوآ نیوگنی

آسٹریلیا کے شمال میں جزیرہ نیوگنی کا مشرقی حصہ ہے۔ انڈونیسی نیوگنی سے جس کو مغربی ایریان کہا جاتا ہے، ملا ہوا ہے۔ رقبہ ایک لاکھ ۸۷ ہزار مربع میل (چار لاکھ ۷۵ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی اکتیس لاکھ ہے۔ مغربی ذرائع کے مطابق نصف آبادی عیسائی ہو چکی ہے۔ باقی مظاہر پرست ہے۔ دس فیصد باشندے انگریز ہیں۔ صدر مقام پورٹ مورسبی ہے۔

فیڈریشن آف اسلامک ایسوسی ایشنز، نیوزی لینڈ (ولنگٹن) کے محمد حنیف قاضی کی اطلاع کے مطابق مسلمان جہاز ران پانچ سو سال پہلے ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا سے یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ انھوں نے کچھ مقامی لوگوں کو مسلمان بھی کیا اور ان میں شادی بیاہ بھی کی۔ لیکن برطانوی تسلط کے بعد ان مسلمانوں کی ایک تعداد نے سابقہ عقائد اختیار کر لیے اور کچھ لوگ عیسائی ہو گئے۔ اب یہاں مسلمانوں کی تعداد صرف ڈھائی سو ہے جو یہاں کے چار بڑے شہروں میں پائے جاتے ہیں۔ کھیتوں میں بھی کچھ مسلمان کام کرتے ہیں، لیکن ان کی تعداد معلوم نہیں۔

۱۹۷۸ء میں لائے .... کے شہر میں جو ملک کا دوسرا بڑا شہر ہے، اسلامک سوسائٹی آف پاپوآ نیوگنی کے نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی ہے اور اس کی ایک شاخ پورٹ مورسبی میں بھی قائم کی گئی ہے۔ مسجد نہیں ہے۔ جمعہ اور عیدین کی نمازیں کسی ایک گھر میں پڑھ لی جاتی ہیں۔ دونوں شہروں میں ہر ہفتہ اجتماع ہوتا ہے جس میں قرآن اور حدیث کا درس ہوتا ہے۔[۱]

پاپوآ نیوگنی کو ۱۶۔ ستمبر ۱۹۷۵ء کو آزادی ملی۔

---

(۱) جرنل (جدہ یونیورسٹی) جلد ۳ شمارہ نمبر ۳، ۱۹۸۱ء صفحہ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔

یورپ

یونان

یونان اور یونانیوں سے مسلمانوں کا تعلق تاریخ اسلام کے ابتدائی دَور ہی میں قائم ہوگیا تھا۔اس زمانے میں یونان بازنطینی یا رومی سلطنت کا مرکز تھا۔ بازنطینیوں سے مسلمانوں کی پہلی جنگ عہدِ رسالت میں خالدؓ بن ولید کی قیادت میں موتہ کے مقام پر ہوئی تھی جواب موجودہ اُردن میں واقع ہے۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں مسلمانوں نے مصر، شام اور ایشیائے کوچک کا مشرقی حصہ بازنطینیوں سے چھین لیا اور بعد میں رفتہ رفتہ ان کو سارے مقبوضات سے محروم کر دیا اور بازطینی سلطنت یونان تک محدود ہوکر رہ گئی۔

مسلمانوں اور یونانیوں کے تعلقات کی ابتدائی پانچ سو سال کی تاریخ صرف جنگوں تک محدود نہیں تھی بلکہ ثقافتی اور علمی تعلقات کے لحاظ سے بھی اہمیت رکھتی ہے۔اس زمانے میں یونانی علوم کے کثرت سے عربی میں ترجے کیے گئے اور یونانی فلسفہ اور طب نے خاص طور پر مسلمانوں کے افکار کو متاثر کیا۔

مسلمانوں اور یونانیوں کے تعلقات کا دوسرا دَور عثمانی ترکوں کے عروج سے شروع ہوتا ہے۔اب تک مسلمانوں نے یونانیوں سے ان کے مقبوضات چھینے تھے۔عثمانی ترک آگے بڑھ کر خاص یونان پر حملہ آور ہوئے۔سلطان اورخان نے ۱۳۵۴ء/۷۵۵ھ میں درہ دانیال پار کر کے گیلی پولی پر قبضہ کیا۔ ۱۳۸۰ء میں سلطان مرادخاں اول نے مقدونیہ فتح کیا۔اس کے جانشین بایزید اول نے ۱۳۹۳ء میں تھسلی فتح کیا۔ ۱۴۶۷ء تک وسطی یونان، اپیرس اور جزیرہ نما موریا بھی عثمانی سلطنت کا حصہ بنا لیے گئے اور اس طرح ایک سو تیرہ سال کی مدت میں پورا یونان مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔

ترک یونان کے مختلف حصوں پر ۳۲۸ سال سے ۵۷۳ سال تک قابض رہے۔ اس کے بعد جب عثمانی ترکوں کو زوال ہوا تو یونانیوں نے مغربی ملکوں اور روس کی مدد سے اپنی کھوئی ہوئی مملکت بحال کرنی شروع کر دی۔ ۱۸۲۸ء میں پورے ۳۲۸ سال کے بعد ایتھنز اور موریا ترکوں کے قبضہ سے نکل گئے اور جدید دَور کی پہلی یونانی حکومت قائم ہوئی۔ ۱۸۳۲ء میں اپیرس کا صوبہ، ۱۸۶۴ء میں تھسلی اور ۱۹۱۳ء میں کریٹ اور مقدونیہ بھی ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئے اور یونان کا ملک اپنی موجودہ سرحدوں کے ساتھ وجود میں آ گیا۔ صرف مشرقی تھسلی (تراقیہ) جس میں ادرنہ اور استنبول کے شہر واقع ہیں، ترکوں کے پاس رہ گئے کیونکہ اس علاقے کی نوے فیصد آبادی ترک اور مسلمان تھی۔

اندازہ ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز میں یونان میں مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا ایک تہائی تھی۔ ۱۹۲۰ء میں یونان کی کل آبادی ۵۵ لاکھ تھی جس میں چودہ لاکھ مسلمان تھے۔ مغربی تھریس کی دو تہائی آبادی مسلمان تھی۔ لیکن مسلمانوں کے قتل عام اور ۱۹۲۲ء میں ترکوں اور یونانیوں کی آبادی کے تبادلہ کے بعد اب یونان میں مسلمانوں کی تعداد صرف ایک لاکھ تیس ہزار رہ گئی ہے اور ان کی بیش تر تعداد مغربی تھریس میں آباد ہے۔ یونان کے مختلف حصوں میں ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق مسلمانوں کی تعداد حسب ذیل ہے۔

۱۔ مغربی تھریس: [illegible] ہزار (۲۷ فیصدی)

۲۔ جزائر ایجن: دس ہزار ([illegible] فیصدی)

۳۔ مقدونیہ: بارہ ہزار

۴۔ اپیرس: آٹھ ہزار

۵۔ ایتھنز: دس ہزار

ان مسلمانوں میں اسی ہزار ترک ہیں، تیس ہزار پومک مسلمان (بلغاروی زبان بولنے والے) دس ہزار البانوی مسلمان اور دس ہزار دیگر نسلوں کے مسلمان، جزائر ایجن کے مسلمانوں کی بڑی تعداد جزیرہ رہوڈس میں ہے جہاں وہ کل آبادی کا پندرہ فیصد ہیں۔ لیکن یہ مسلمان ترکی اور باقی اسلامی دنیا سے کٹے ہوئے ہیں، علماء اور اماموں کی کمی ہے۔ مسجدیں برباد ہو رہی ہیں۔ نوجوان طبقہ اسلام سے ناواقف ہے اور مسلمان لڑکیاں یونانی غیر مسلموں سے شادی کر لیتی ہیں۔

ایتھنز کے مسلمانوں میں آٹھ ہزار عرب اور مصری ہیں اور باقی دو ہزار البانوی۔ یہاں اسلامی ملکوں کی مدد سے ایک مسجد اور اسلامی مرکز تعمیر کرنے کا منصوبہ زیر عمل ہے۔ [1]

مغربی تھریس کے مسلمان نسبتاً خوشحال اور تعلیم یافتہ ہیں۔ عام طور پر زراعت پیشہ اور مویشی پالنے والے ہیں۔ ان کی اپنی مسجدیں اور مدرسے ہیں۔ مسجدوں کی تعداد تین سو اور دینی مدرسوں کی تعداد دو سو ہے۔ یہاں کے مرکزی شہر گوملجینہ میں پندرہ بڑی مسجدیں ہیں۔ رہوڈس میں پانچ مسجدیں ہیں لیکن ان کی حالت اچھی نہیں اور صرف عیدین کے موقع پر استعمال ہوتی ہیں۔ قرآن آسانی سے دستیاب ہے۔ ترکی ترجمہ استعمال میں ہے۔ یونانی زبان میں بھی قرآن کا ترجمہ موجود ہے لیکن وہ غیر مسلموں کا کیا ہوا ہے اس لیے مسلمان اس کو استعمال نہیں کرتے۔ ہر سال چار سو مسلمان حج کو جاتے ہیں۔ شخصی قانون نافذ ہے مسلمانوں کے دو ثانوی مدرسے ہیں جہاں بنیادی اسلامی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ [2] مسلمان طلبہ یونیورسٹی میں بھی موجود ہیں لیکن وہاں کا ماحول مسلمانوں کے لیے سازگار نہیں، جس کی وجہ سے مسلمان یونیورسٹی میں داخلہ سے بچتے ہیں۔ یونانی پارلیمنٹ میں بھی دو مسلمان ممبر ہیں۔

یونان کے ترک مسلمانوں کو ۱۹۲۴ء کے ترکی یونان معاہدہ کے تحت اسی طرح تحفظ حاصل ہے جس طرح ترکی میں رہ جانے والے یونانیوں کو تحفظ حاصل ہے۔ لیکن اس کے باوجود ترکوں کو شکایت ہے کہ یونانی حکومت معاہدہ کی خلاف ورزی کرتی رہتی ہے۔ مسلمان غیر منقولہ جائداد خرید و فروخت نہیں کر سکتے۔ حکومت اوقاف کی زمینوں پر قبضہ کرتی رہتی ہے۔ نئی مسجدیں اور گھر بنانے کی اجازت نہیں۔ مسلمانوں کو سرکاری ملازمتیں نہیں دی جاتیں، بنک قرض نہیں دیتے۔ وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں یا ایک شہر سے دوسرے شہر میں منتقل نہیں ہو سکتے۔ کاروں، بسوں اور ٹریکٹروں کو چلانے کے لائسنس نہیں دیئے جاتے۔ مسلمانوں پر

---

(۱) جرنل (جدہ یونیورسٹی کے مسلمان اقلیتوں کا انسٹی ٹیوٹ)

(۲) یونانی حکومت کا دعویٰ ہے کہ ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۰ء تک حکومت نے اسی (۸۰) مسلم ابتدائی مدرسے قائم کیے ہیں اور مقامی سرکاری انتظامیہ نے ۹۴ مدرسے قائم کیے ہیں۔ سالونیکا میں ایک تدریسی اکیڈمی قائم کی گئی ہے جہاں مذکورہ بالا مدرسوں کے لیے اساتذہ کو تربیت دی جائے گی۔ (مسلمز ان یورپ ۷۔ مارچ ۱۹۸۰ء)

دباؤ ہے کہ ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔[1] چنانچہ مغربی تھریس کے کئی ہزار مسلمان ہجرت کر کے ترکی یا آسٹریلیا چلے گئے۔ جب قبرص کے مسئلہ پر ترک اور یونان میں کشیدگی پیدا ہوئی تو اگست ۱۹۷۴ء اور اگست ۱۹۷۵ء کے درمیان مغربی تھریس کے چھ ہزار مسلمان ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔

یونان کے مسلمانوں میں سب سے تشویش ناک حالت پومک مسلمانوں کی ہے جو بلغاروی زبان بولتے ہیں۔ وہ غریب ہیں اور ان میں امام تک نہیں۔ اسلام سے ان کا رشتہ تقریباً منقطع ہو گیا ہے۔

۱۹۲۳ء سے اب تک یونانی آبادی کئی گنا زیادہ ہو گئی ہے لیکن مسلمانوں کی تعداد میں اس عرصہ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا، حالانکہ مسلمانوں میں شرح پیدائش یونانیوں سے زیادہ ہے۔ ۱۹۲۳ء میں مغربی تھریس کی ۸۴ فیصد زمین ترکوں کے پاس تھی۔ اب یہ تناسب پچاس فیصدی رہ گیا ہے۔

---

(۱) دنیا کی مسلمان اقلیتیں (موتمر عالم اسلامی، کراچی کا انگریزی کتابچہ) ۱۹۷۷ء

یونانی پالیمنٹ نے حال ہی میں ایک قانون منظور کیا ہے، جس کے ذریعے اس نے مغربی تھریس میں مسلمانوں کے اوقاف اور رفاہی اداروں کا انتظام تقریباً اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، اس فیصلے نے مسلمانوں میں غم وغصہ کی لہر دوڑا دی ہے۔ پارلیمنٹ کے دو مسلمان ممبروں نے دھوکہ دینے کا الزام لگاتے ہوئے کہا ہے کہ یہ بل ایسے وقت منظور کیا گیا جب وہ پارلیمنٹ میں موجود نہیں تھے (مسلم ورلڈ ۲۱۔ فروری ۱۹۸۱ء)

یوگوسلاویا

یورپی ملکوں میں مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد یوگوسلاویا میں ہے۔ یوگوسلاویا میں اسلام کا تعارف اگرچہ اس دور ہی میں ہوگیا تھا جو اسلامی تاریخ میں عربوں کا دور کہلاتا ہے، لیکن اس ملک میں اسلام کے روشن باب کا آغاز عثمانی ترکوں کی آمد کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ترکوں کی آمد کے وقت یوگوسلاویا کئی آزاد ریاستوں میں تقسیم تھا جن میں سرویا اور بوسنیا کی ریاستیں سب سے بڑی تھیں۔ ۱۳۸۹ء اور ۱۵۲۱ء کے درمیان ترک ان دونوں ریاستوں کو فتح کرنے کے بعد تقریباً پورے یوگوسلاویا پر قابض ہوگئے۔ ۱۶۸۲ء میں ویانا کے دوسرے محاصرے کے بعد ترک پسپا ہونا شروع ہوئے، یہاں تک کہ ۱۹۱۳ء میں جنگ بلقان کے دوران یوگوسلاویا کا آخری حصہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ پہلے یوگوسلاویا آسٹریا کے زیر اقتدار آیا پھر ۱۹۱۸ء میں مکمل طور پر آزاد ہوگیا۔

عثمانی ترکوں کے دور میں جزیرہ نما بلقان میں اسلامی تہذیب وتمدن سے جتنا متاثر یوگوسلاویا کا علاقہ ہوا اتنا متاثر کوئی دوسرا علاقہ نہیں ہوا۔ خاص طور پر مقدونیہ، بوسنیا، اور ہرزیگووینا کے علاقے اسلام سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ مقدونیہ کا علاقہ ترک اور البانوی آبادی کا مرکز تھا اور بوسنیا اور ہرزیگووینا جسے ترک بوسنہ اور ہرسک کہتے ہیں، مقامی مسلمانوں کا جن کی آبادی کے ایک بڑے حصے نے اسلام قبول کرلیا تھا، سب سے بڑا مرکز تھا۔ ان علاقوں میں ترکی علم وادب کو بھی فروغ حاصل ہوا اور بوسنوی اسلامی ادب کی آبیاری بھی ہوئی۔ بوسنہ کے مسلمانوں نے خاص طور پر سلطنت عثمانیہ کو کئی عظیم شخصیتیں دیں، جن میں محمد پاشا صوقوللی کا نام سب سے اہم ہے۔ وہ ۱۵۶۴ء/۹۷۲ھ تا ۱۵۷۹ء/۹۸۷ھ سلطنت عثمانیہ کے وزیر اعظم رہے تھے۔

عثمانی سلطنت کا اقتدار ختم ہونے کے بعد یوگوسلاویا کے مسلمان مختلف نشیب وفراز سے

گزرے۔ بارہا ان کا قتل عام ہوا، مذہبی آزادی پر پابندیاں لگیں مذہبی آزادی اور شہری آزادیاں بحال بھی ہوئیں، یہاں تک کہ ۱۹۴۵ء میں یوگوسلاویا میں کمیونسٹ حکومت قائم ہوگئی جو اب تک ہے۔

اشتراکی حکومت کے ابتدائی دور میں مسلمانوں پر بڑے مظالم ہوئے۔ بوسنہ اور ہرسک کے مسلمانوں کو کمیونسٹ پارٹی کی حمایت کرنے پر مجبور کیا گیا۔ مسلمانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ خود کو سردی کہلائیں، نہیں تو ان کی قومیت کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ لیکن یہ سیاست کامیاب نہ ہوئی۔ حکومت نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کو تسلیم کرلیا اور ۱۹۵۳ء میں مذہبی آزادی کے اصول کو بھی تسلیم کرلیا گیا۔ مسلمانوں کو مساوی حقوق ملے اور ان کو حکومت میں ہر سطح پر آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی گئی۔ اگرچہ مسلمان اب بھی متعصب اور کٹر اشتراکیوں اور قوم پرست سربیوں کے تعصب کا نشانہ بنتے رہتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ان کو یوگوسلاویا میں دوسرے اشتراکی ملکوں کے مقابلے میں زیادہ مذہبی آزادی حاصل ہے۔

مسلمانوں کی تعداد

یوگوسلاویا کا رقبہ ۹۹ ہزار مربع میل (۲ لاکھ ۵۵ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۱ء) دو کروڑ ۲۳ لاکھ ہے۔ اکثریت عیسائی ہے اور ان میں آرتھوڈوکس کلیسا کے پیرو سب سے زیادہ ہیں پھر کیتھولک عیسائی ہیں۔ مسلمانوں کا تناسب سترہ اعشاریہ دو فیصد ہے۔ سرکاری حساب سے پوری آبادی میں مسلمانوں کی تعداد ۲۷½ لاکھ ہوتی ہے اور مسلمانوں کی تنظیم کے حساب سے ۳۸ لاکھ۔ یہودیوں کی تعداد چھ ہزار ہے۔

یوگوسلاویا ایک وفاقی ریاست ہے جو ذیل کی چھ جمہوریتوں پر مشتمل ہے: (۱) بوسنہ ہرسک (۲) سربیا (۳) مقدونیہ (۴) مونٹی نگرو یا قراداغ (۵) کروشیا یا خیروات (۶) سلووینیا۔

مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد بوسنہ ہرسک کی جمہوریہ میں آباد ہے۔ بوسنہ ہرسک کا رقبہ ۵۱ ہزار مربع کلومیٹر اور آبادی (۱۹۷۸ء) ۴۱ لاکھ ۲۵ ہزار ہے۔ یہاں مسلمانوں کا تناسب ۱۹۵۳ء میں ۳۲ اعشاریہ ۳ فیصد تھا لیکن ۱۹۷۱ء میں یہ تناسب بڑھ کر ۳۹½ فیصد ہو گیا۔ سرائے بوسنہ یا سراجیوو ریاست کا صدر مقام ہے۔ یہ شہر مسلمانوں کا سب سے بڑا تاریخی مرکز ہے۔ یہاں کے چپہ چپہ پر عثمانی دور کی یادگاریں ہیں، جن میں غازی خسرو بگ کی مسجد، علی پاشا

کی مسجد اور غازی خسرو بیگ کا مدرسہ اہم ہیں۔ مدرسہ کے ساتھ عہد عثمانی کا ایک کتب خانہ بھی ہے۔ یہاں تین ہزار سے زیادہ عربی، فارسی اور ترکی مخطوطات ہیں اور یہ کتب خانہ اپنے نادر قلمی نسخوں کی وجہ سے یورپ کے اہم کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔ یوگوسلاوی مسلمانوں کی مرکزی تنظیم کا صدر دفتر بھی اسی شہر میں ہے اور غازی خسرو بیگ کا کتب خانہ اسی تنظیم کے انتظام میں ہے۔

بنالوقہ (banjaluka) موستر (mostar) فوکا، اس ریاست میں مسلمانوں کے دوسرے اہم تاریخی اور تہذیبی مرکز ہیں۔ ان شہروں میں بھی عثمانی دَور کی یادگاریں پائی جاتی ہیں اور مسجدوں کے مخروطی میناران کی اسلامی حیثیت کا اعلان کرتے ہیں۔ بوسنہ کے مسلمان سربوکروٹ زبان بولتے ہیں اور ان کی مطبوعات اسی زبان میں ہیں۔

بوسنہ کے بعد مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد سربیا میں پائی جاتی ہے۔ یوگوسلاوی مسلمانوں کی تنظیم کے مطابق یہاں مسلمانوں کی تعداد ساڑھے تیرہ لاکھ ہے۔ ان کی اکثریت توصووا میں ہے جو سربیا کے اندر ایک خودمختار علاقہ ہے۔ توصووا کی آبادی (۱۹۷۸ء) ۵ لاکھ ۸۴ ہزار تھی۔ اور تاریخی پرستینا اس علاقہ کا صدر مقام ہے۔ پرزرن (prizren) دوسرا اہم اسلامی اور تاریخی مرکز ہے۔ توصووا کے مسلمانوں کی اکثریت البانوی نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ پرستینا میں سربیا کے مسلمانوں کی علاقائی نظامت کا صدر دفتر بھی ہے۔

یوگوسلاویا میں مسلمان آبادی کا تیسرا بڑا مرکز ریاست مقدونیہ ہے۔ مذہبی نظامت کے اعداد شمار کے مطابق مقدونیہ میں مسلمانوں کی تعداد ساڑھے چار لاکھ ہے۔ مقدونیہ کی کل آبادی (۱۹۷۸ء) ۱۹ لاکھ ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کی اکثریت ترک ہے، باقی مسلمان البانوی ہیں۔ اُسکپ (skopie) ریاست کا صدر مقام ہے اور ریاست میں مسلمانوں کا سب سے بڑا تاریخی اور تہذیبی مرکز ہے۔ یہ شہر ۱۳۹۲ء میں بایزید یلدرم نے آباد کیا تھا۔ سرائے بوسنہ کی طرح یہاں کے چپّے چپّے پر عثمانی دَور کی یادگاریں موجود ہیں۔

مونٹی نیگرو جسے ترکی میں قرا داغ کہا جاتا ہے ملک کی سب سے چھوٹی ریاست ہے۔ اور آبادی (۱۹۷۸ء) تقریباً چھ لاکھ ہے۔ مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ ہے۔ ٹیٹوگراڈ صدر مقام ہے اور مسلمانوں کی علاقائی نظامت کا صدر دفتر بھی یہیں ہے۔

یوگوسلاویا کی باقی دو ریاستوں کروشیا (خروات) اور سلوو ینیا میں مسلمانوں کی تعداد بہت

کم ہے اوران کی آبادی منتشر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کروشیا کے صدر مقام زغرب میں مسلمانوں کی تعداد پچاس ہزار ہے۔[1]

یوگوسلاوی مسلمانوں کی مذہبی نظامت کے مطابق پورے ملک میں مسجدوں کی تعداد ایک ہزار نو سو پچاس ہے۔ ان میں ایک ہزار بانوے (۱۰۹۲) مسجدیں بوسنہ ہرسک، کروشیا اور سلووینیا میں ہیں، چار سو پینتالیس (۴۴۵) سربیا میں، تین سو بہتر (۳۷۲) مقدونیہ میں اور چھہتر (۷۶) مونٹی نیگرو میں ہیں۔ عارضی عبادت گاہیں جن کو مصلا کہا جاتا ہے ان کے علاوہ ہیں۔ ۱۹۴۵ء سے اب تک سات سو نئی مسجدیں تعمیر کی گئی ہیں۔

یوگوسلاویا میں مسلمانوں کی ایک مرکزی مذہبی نظامت قائم ہے جو حکومت کی مداخلت سے آزاد ہے اور اس کے ارکان کا انتخاب نیچے سے اوپر تک ہر سطح پر مسلمان خود کرتے ہیں۔ مذہبی نظامت کی چار علاقائی شاخیں ہیں۔ جن کے دفاتر سرائے بوسنہ، قوصووا، اُسکپ اور ٹیٹوگراڈ میں ہیں۔ مرکزی سربراہ رئیس العلماء کہلاتا ہے۔ اور اس کا دفتر سرائے بوسنہ میں ہے۔ مسجدوں کی تعمیر، دیکھ بھال، دینی تعلیم کا انتظام مذہبی نظامت کے سپرد ہے۔ دینی نظامت کے تحت مسجدوں اور مدرسوں میں ایک لاکھ بیس ہزار بچے دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ دینی نظامت کے تحت کتابیں بھی شائع کی جاتی ہیں اور متعدد ہفتہ وار اور ماہانہ اخبار اور رسالے بھی شائع ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کی جائدادوں، اوقاف اور مذہبی اداروں کے قومی ملکیت میں چلے جانے کے بعد مذہبی نظامت نے زکوٰۃ، فطرے، صدقات اور قربانی کا بے مثال نظام قائم کر کے جس طرح اپنے مالی مسائل حل کیے ہیں وہ دوسرے اسلامی ملکوں کے لیے نمونہ ہیں۔

---

(۱) مسلمز ان یورپ، لندن۔ ۱۵۔ مارچ ۱۹۸۲ء

بلغاریہ

بلغاریہ پر عثمانی ترکوں نے ۱۳۶۶ء میں قبضہ کیا تھا جو چار سو سال سے زیادہ قائم رہا۔ ۱۸۷۸ء میں معاہدۂ برلن کے تحت بلغاریہ کی خود مختار ریاست قائم ہوئی، جس پر سلطنت عثمانیہ کو بالادستی حاصل تھی۔ بلغاریہ کا جنوبی حصہ جس کو مشرقی رومیلی کا نام دیا گیا بدستور سلطنت عثمانیہ کا صوبہ رہا۔ ۱۹۰۸ء میں بلغاریہ مکمل طور پر آزاد ہو گیا اور یہاں کے حکمران نے زار کا لقب اختیار کیا۔ ۱۹۱۳ء کی جنگ بلقان کے بعد مشرقی رومیلی بھی ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ۱۹۴۶ء میں بلغاریہ میں بادشاہت ختم کر دی گئی اور ریاست کو جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔ پھر اسی سال بلغاریہ پیپلز ری پبلک بن گیا اور اس پر کمیونسٹوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔

بلغاریہ کا رقبہ ۴۳ ہزار مربع میل (ایک لاکھ دس ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) ۸۸ لاکھ ہے۔ صوفیہ دارالحکومت ہے۔

بلغارہ کے شہر عثمانی دَور میں اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز بن گئے تھے۔ جس کے آثار مسجدوں اور دوسری عمارتوں کی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔ کئی ترک مشاہیر اور ادیب یہاں پیدا ہوئے۔ ملک کے جنوبی حصے میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد آباد تھی۔ فلیبی کا شہر جسے اب پلوودیو (plovdiv) کہا جاتا ہے مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ پلونا کا مشہور مقام جہاں روسیوں کے مقابلہ میں ترک سپہ سالار عثمان پاشا نے غیر معمولی شہرت حاصل کی تھی، بلغاریہ ہی میں واقع ہے۔

بلغاریہ کی آزادی کے بعد یہاں کے مسلمان بڑی تعداد میں ہجرت کر کے ترکی چلے گئے اور اب مسلمانوں کی تعداد دس فیصد کے قریب ہے۔ الکتانی کی ''کتاب'' المسلمون فی اروبا و امریکا (یورپ و امریکہ کے مسلمان) مطبوعہ ظہران ۱۹۷۶ء (سعودی عرب) میں مسلمانوں کی

تعداد ساڑھے بارہ لاکھ بتائی ہے۔اس تعداد میں سات لاکھ ترک، تین لاکھ بیس ہزار پومک اور دو لاکھ چالیس ہزار جپسی شامل ہیں۔لیکن یوگوسلاوی محقق اسماعیل بالک نے، جو آسٹریا کی نیشنل لائبریری ویانا میں مشرقی زبانوں کے ماہر ہیں۔پومک اور جپسی مسلمانوں کی تعداد کو مبالغہ آمیز بتایا ہے۔[1] عام خیال یہ ہے کہ پومک مسلمانوں کی تعداد دو لاکھ ہے اور جپسی مسلمان بہت کم ہیں۔

۱۹۶۲ء میں بلغاریہ کی اکادمی آف سائنسز کے جائزہ کے مطابق بلغاریہ میں صرف ۳½ فیصد لوگ مذہب پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ان میں عیسائیوں کی تعداد ۲۷ فیصد اور مسلمانوں کی ½۶ فیصد ہے۔[2]

مسلمانوں کے دینی امور کی نگرانی کے لیے مفتی اعظم کے تحت ایک مرکزی بورڈ ہے جس کے تحت نو علاقائی بورڈ ہیں۔ہر بورڈ ایک مفتی کے تحت ہے۔مسجدوں کی تعداد ایک ہزار دو سو ساٹھ ہے۔[3]

بیشتر اشتراکی ملکوں کی طرح بلغاریہ میں مذہبی سرگرمیوں پر طرح طرح کی پابندیاں عائد ہیں۔مذہب کی باقاعدہ تعلیم کی اجازت نہیں۔مذہب کے خلاف مسلسل پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے اور مسلمانوں پر خصوصاً پومک مسلمانوں پر تبدیلی مذہب کے لیے مسلسل دباؤ ڈالا جارہا ہے۔ان سے کہا جارہا ہے کہ وہ بلغاری نام رکھیں، اگر ایسا نہیں کریں گے تو نہ توان کو ملازمت دی جائے گی اور نہ مدرسوں میں داخلہ ملے گا۔ڈاکٹر اسماعیل بالک کے مطابق بلغاریہ کے مسلمانوں کی صورت افسوسناک اس وجہ سے ہے کہ ان میں سات لاکھ ترک ہیں جن کو مسیحی باشندے عہد قدیم سے مسیحی بنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور ان کے مصائب کی اصل وجہ یہی مسیحی جذبہ ہے کیمونزم نہیں ہے۔[4] ڈاکٹر اسماعیل لکھتے ہیں کہ مشرقی یورپ کے اشتراکی ملکوں میں ثقافتی پالیسی کو عام کرنے میں مذہب کے مقابلے میں الحاد کی تبلیغ پر کہیں زیادہ زور دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ان ملکوں میں اسلام پر بے کسی کی حالت طاری ہے، خاص طور پر نوجوان نسل میں اور یہ کہ مشرقی یورپ میں مسلمانوں کے لیے حالات زیادہ امید افزا نہیں ہیں۔[5] بلغاریہ میں مسلمانوں کو اور کم از کم

---

(۱) جرنل (جدہ یونیورسٹی) جلد اول شمارہ اول ۱۹۷۹ء مضمون کے اردو ترجمہ کے لیے دیکھئے فکر ونظر، اسلام آباد۔اکتوبر ۱۹۸۲ء۔نیوز آف مسلمز ان یورپ ۲۷۔جنوری ۱۹۸۱ء میں مسلمانوں کی تعداد ½۷ لاکھ دی ہے۔

(۲) اسٹیٹسمین ایر بک ۱۹۷۱ء۔۱۹۷۲ء۔

(۳) ایضاً۔

(۴) جرنل (جدہ) جلد اول شمارہ اول ۱۹۷۹ء غیر مضمون ''مشرقی یورپ میں اسلام'' جو اسماعیل بالک کے مضمون کا ترجمہ ہے اور فکر ونظر اسلام آباد۔اکتوبر ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا ہے۔

(۵) ایضا

نوجوان نسل کو روایتی نام تک اختیار کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ عملی طور پر یہ اقدار بلغاریہ کے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی طرف ایک قدم ہے۔ خاص طور پر پومک مسلمانوں کو یہ پابندی تمام بیرونی ناموں پر نہیں ہے۔ بائبل میں جو نام آئے ہیں ان کو بلغاروی قرار دیا گیا ہے، لیکن ایسے نام جن میں ذرہ برابر بھی اسلامی اثر ہو تو خواہ وہ بائبل ہی میں کیوں نہ آئے ہوں، ان کو اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً کوئی شخص اسماعیل نام نہیں رکھ سکتا، حالانکہ یہ نام بائبل میں موجود ہے۔

روسی رسالہ ''مسلمز آف دی سوویٹ ایسٹ'' تاشقند ۱۹۷۸ء/ ۱۳۹۸ھ کے مطابق بلغاریہ میں چھ مفتی اور پانچ سو امام ایسے ہیں جن کو سرکاری طور پر تنخواہیں ملتی ہیں۔ ضمنی اخراجات اوقات سے پورے کیے جاتے ہیں۔''[۱]

مشرقی بلاک کے ملکوں میں جس کلچرل پالیسی پر عمل کیا جارہا ہے اس نے نوجوان نسل میں اسلامی تشخص ختم کر دیا ہے۔ وہ اس بات پر خوش ہیں کہ ان کو نئے نظام کے تحت ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہوئے ہیں، لیکن یہ مواقع مسلمانوں کو صرف اس وقت حاصل ہوتے ہیں جب وہ نئے نظام کے آگے بہ رضا و رغبت ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ اس کے باوجود بلغاریہ میں قومی امتیازات کی مثالیں ملتی ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں وہاں وہ ترکی مدرسے بند کر دیے گئے، جنھوں نے قومی جذبہ پیدا کرنے کی تھوڑی سی بھی کوشش کی تھی۔ حال ہی میں جب صدر قذافی اور لیبیا کی جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ کے جنرل سکرٹری نے بلغاریہ کا دورہ کیا تھا تو حکومت بلغاریہ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی اسلام دشمن پالیسی بدل دے گی اور اسلامی ناموں کو بدل کر بلغاروی نام اختیار کرنے کے لیے جبری پالیسی ترک کر دے گی۔ یہ بھی طے پایا تھا کہ طرابلس کی جمعیۃ الدعوۃ الاسلامیہ شہر شومین (shumen) کے مدرسہ کو جسے بند کر دیا گیا تھا دوبارہ کھولنے کے لیے بلغاریہ کے مسلمانوں کی مالی امداد کرے گی۔[۲] معلوم نہیں ان فیصلوں پر کہاں تک عمل کیا گیا۔

---

(۱) ایضاً

(۲) جرنل (جدہ یونیورسٹی) جلد اول شمارہ اول ۱۹۷۹ء نیز مضمون ''مشرقی یورپ میں اسلام'' جو اسماعیل بالک کے مضمون کا ترجمہ ہے اور فکر و نظر، اسلام آباد، اکتوبر ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا ہے۔

رومانیا

رقبہ 2/1 91 ہزار مربع میل۔ آبادی (۱۹۷۹ء) دو کروڑ بیس لاکھ۔ دارالحکومت بخارسٹ ہے۔

جب ترک بلقان میں داخل ہوئے تو رومانیا کا موجودہ علاقہ تین بادشاہوں میں تقسیم تھا۔ ان کے نام ولاچیا، مولداویا اور ٹرانسلوانیا تھے، جن کو ترک بالترتیب افلاق، یوغدان اور اردل کہتے تھے۔ رومانیا کا دارالحکومت بخارست، ریاست ولاچیا میں تھا۔ ولاچیا نے ۱۳۸۹ء میں ہی ترکوں کی بالادستی تسلیم کر لی تھی، لیکن وہاں ترکوں کو مکمل اقتدار ۱۴۶۲ء میں محمد فاتح کے زمانہ میں حاصل ہوا۔ ۱۴۸۴ء میں مولداویا پر بھی ترکوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔ جب سلطنت عثمانیہ کا زوال شروع ہوا تو روس نے بلقان کی ریاستوں کو ترکوں کے خلاف بھڑکایا۔ ۱۸۵۹ء میں ولاچیا اور مولداویا کو ملا دیا گیا اور متحدہ بادشاہت کا نام رومانیا رکھا گیا، لیکن رومانیا پر اب بھی عثمانی سلطنت کی بالادستی قائم تھی۔ ۱۸۷۸ء میں یہ بالادستی بھی ختم ہوگئی اور رومانیا مکمل طور پر آزاد ہو گیا۔ اس طرح رومانیا پر مسلمانوں کی بالادستی چار سو سولہ سال قائم رہی۔

دوسری عالمی جنگ میں رومانیا ۱۹۴۱ء میں جرمنی کے حلیف کی حیثیت سے شامل ہوا۔ ۱۹۴۴ء میں روس نے قبضہ کر لیا اور ۳۰۔ دسمبر ۱۹۴۷ء کو رومانیا ایک اشتراکی جمہوریہ بن گیا۔

ترکوں کے دَورِ حکومت میں دوبروجہ کا علاقہ جو دریائے ڈینیوب اور بحیرۂ اسود کے درمیان واقع ہے مسلمان آبادی کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ لیکن رومانیا سے ترکوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد رومانیا کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں سے بھی مسلمان ہجرت کر کے ترکی چلے گئے اور اب رومانیا میں بہت کم مسلمان رہ گئے ہیں۔ اندازہ ہے کہ رومانیا میں ۱۹۷۱ء میں صرف ۳۵ ہزار مسلمان تھے۔ [1] یہ سب ترک ہیں۔ الکتانی نے اپنی کتاب ''المسلمین فی اوروبا و امریکہ'' میں

---

(۱) فکر و نظر، اسلام آباد، اکتوبر ۱۹۸۲ء ملاحظہ کیجئے اسماعیل بالک کا مضمون ''مشرقی یورپ میں اسلام''

مسلمانوں کی تعداد نوے ہزار لکھی ہے اور بعض ذرائع کے مطابق یہ تعداد دو لاکھ بھی بتائی گئی ہے۔ لیکن مشہور یوگوسلاوی محقق اسماعیل بالک اس تعداد کو مبالغہ آمیز لکھتے ہیں۔ اور ۳۵ ہزار کو صحیح سمجھتے ہیں کیونکہ یہ تعداد ان کو رومانیا کے مسلمانوں کے مفتی یعقوب مصطفیٰ نے بتائی تھی۔

رومانیہ میں اشتراکی حکومت کے باوجود اب بھی گیارہ ہزار آٹھ سو کلیسا ہیں اور دو مسیحی دینی کالج ہیں۔ یہودیوں کی تعداد بھی ایک لاکھ دس ہزار ہے' اور ان کے تین سو صومعے ہیں۔ موتمر عالم اسلامی کے اندازہ کے مطابق مساجد کی تعداد ستر ہے، جن میں سے بعض سولہویں اور انیسویں صدی کے درمیان تعمیر ہوئی تھیں۔ مسلمانوں کے مفتی کا مرکز بندرگاہ کونستانٹا ہے جو صوبہ دوبرجہ میں واقع ہے۔

اسماعیل بالک لکھتے ہیں:

''رومانیا میں مسلمان زبوں حالی کا شکار ہیں۔ مفتی یعقوب مصطفی نے راقم الحروف کو خود بتایا کہ مسلمانوں کے پاس مسجدیں اور دوسری عمارتیں موجود ہیں، لیکن ان کو بھی استعمال نہیں کیا جاتا۔ مدرسے خالی پڑے ہیں کیونکہ کوئی طالب علم دینی تعلیم کے لیے ان میں داخلہ نہیں لیتا۔ اس کی وجہ فعال قیادت کی کمی ہے، اساتذہ کی اور رومانی زبان میں اسلامی کتابوں کی کمی بھی اس کی دوسری وجہ ہے۔ یوگوسلاویا اور ترکی کے مسلمانوں نے اپنے رومانی بھائیوں کی مدد کی کئی مرتبہ کوشش کی لیکن بظاہر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اسی طرح رابطۂ عالم اسلامی نے جو کوششیں کی ہیں ان میں بھی کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔''[1]

---

(۱) فکر و نظر، اسلام آباد، اکتوبر ۱۹۸۲ء ملاحظہ کیجیے اسماعیل بالک کا مضمون ''مشرقی یورپ میں اسلام''

ہنگری

ہنگری کا رقبہ ۳۶ ہزار مربع میل (۹۳ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۱ء) ایک کروڑ ساتھ لاکھ۔ بوداپسٹ دارالحکومت ہے۔

جدید تحقیقات کے مطابق ہنگری میں اسلام دسویں صدی عیسوی ہی میں پہنچ گیا تھا۔ یوگوسلاوی محقق اسماعیل بالک نے اس موضوع پر جرمن زبان میں ایک کتابچہ لکھا ہے جس کا ترجمہ دوسرے سال ہی یعنی ۱۹۶۵ء میں ''الاسلام فی المجار فی القرون الوسطیٰ'' کے نام سے قاہرہ سے شائع ہوگیا تھا۔ اس تحقیق کے مطابق ہنگری میں دسویں صدی سے بارہویں صدی تک اسلام کی بلا روک ٹوک اشاعت ہوتی رہی۔ بارہویں صدی کے وسط میں مشہور عرب عالم ابوحامد محمد غرناطی متوفی ۱۱۶۹ء مختصر مدت تک وہاں مقیم رہے اور ان کے صاحبزادے حامد بن محمد غرناطی نے ہنگری میں مفتی کے فرائض انجام دیئے۔ لیکن تیرہویں صدی میں مسلمانوں کے خلاف جو سخت اقدامات کیے گئے ان کے نتیجے میں وسط یورپ میں وجود میں آنے والی یہ پہلی مسلم آبادی ختم ہوگئی۔''[1]

اس کے تین سو سال بعد ہنگری سے مسلمانوں کا تعلق اس وقت ہوا جب سلیمان قانونی نے ۱۵۲۶ء/۹۳۲ھ میں ہنگری فتح کیا۔ ہنگری ۱۶۸۶ء/۱۰۹۷ھ تک عثمانی سلطنت کا ایک صوبہ رہا۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

اسماعیل بالک نے اپنے مضمون میں ہنگری میں مسلمانوں کی تعداد نہیں لکھی، لیکن مسیحی مسلم تعلقات کے مرکز واقع برمنگھم نے مسلمانوں کی تعداد ۱۹۸۱ء میں تیس ہزار بتائی ہے۔[2]

اسماعیل بالک نے لکھا ہے کہ ''دوسری عالمی جنگ سے پہلے وارسا اور بوداپسٹ میں مسجدوں کی تعمیر کے جو منصوبے تیار ہوئے تھے وہ دھرے کے دھرے رہ گئے ہیں۔ لیکن پیکس

(۱) فکر ونظر اسلام آباد، اکتوبر ۱۹۸۲ء مضمون ''مشرقی یورپ میں اسلام۔''
(۲) نیوز آف مسلمز ان یورپ ۲۷۔ جنوری ۱۹۸۲ء

(pecs) میں ہنگری کی حکومت نے سیاحوں کے لیے اس واحد مسجد کو مرمت کے بعد کھول دیا ہے
جو عثمانی دور سے چلی آ رہی تھی۔

ہنگری ایک اشتراکی ملک ہے۔

پولینڈ

پولینڈ کا رقبہ ایک لاکھ بیس ہزار مربع میل اور آبادی (۱۹۷۸ء) ۳½ کروڑ ہے۔ دارالحکومت وارسا ہے۔

پولینڈ سے پہلا واسطہ جن مسلمانوں سے پڑا وہ منگول اور تاتاری تھے۔ جن کا مرکزی والگا کی جنوبی وادی میں سرائے کا شہر تھا۔ اس کے بعد سترہویں صدی کے آخر میں پولینڈ کے جنوبی صوبے پوڈولیا پر ۱۶۷۲ء میں عثمانی ترکوں نے قبضہ کرلیا جو ۱۶۹۹ء تک قائم رہا۔ ۱۹۴۷ء سے یہاں اشتراکی حکومت قائم ہے۔

''پولینڈ میں کئی ہزار مسلمان ہیں جو تاتاری نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسری عالمی جنگ سے پہلے پولینڈ کے شمالی مشرقی گوشہ میں آباد تھے۔ صرف ولنو کے علاقے میں سولہ مسجدیں اور ایک مفتی تھا۔ لیکن جنگ کے نتیجے میں یہ مسلمان پراگندہ ہوگئے۔ اب پولینڈ میں صرف دو مسجدیں ہیں اور تیسری مسجد تعمیر کرنے کا منصوبہ ہے۔ بیالسٹوک (byalstok) کے علاقہ کے علاوہ مسلمان ہر جگہ منتشر ہیں۔ لیکن ان کی اکثریت وارسا میں رہتی ہے۔''[1]

محمد علی الحرکان سکرٹری رابطۂ عالم اسلامی کی اطلاع کے مطابق پولینڈ میں مسلمانوں کی تعداد نو ہزار ہے۔[2] لیکن اسماعیل بالک نے لکھا ہے کہ ان کی تعداد ۱۹۷۱ء میں پندرہ ہزار تھی۔ عیسائی مسلم تعلقات کے مطالعہ کے مرکز نے ۱۹۷۹ء میں بھی یہی تعداد بتائی ہے۔ حالانکہ گزشتہ آٹھ سال کی مدت میں اس تعداد میں اضافہ ہونا چاہیے۔ روزنامہ ڈان کراچی مورخہ ۸۔ اپریل ۱۹۸۳ء میں ایک پولستانی نومسلم بوگوسلاو۔ آر۔ زگورسکی (Boguslaw R Zagorski) کے

---

(۱) رابطہ عالم اسلامی کا ماہنامہ جرنل (مکہ) اکتوبر ۱۹۸۱ء

(۲) ہفت روزہ ''مسلم ورلڈ'' کراچی ۹۔ جنوری ۱۹۸۲ء

بارے میں ایک مضمون شائع ہوا ہے اس میں پولینڈ میں مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار بتائی گئی ہے۔

محمد علی الحرکان نے اپنے بیان میں یہ بھی کہا ہے کہ "کمیونسٹ حکومت مسلمانوں کے مذہبی آزادی میں رکاوٹ ڈال رہی ہے۔ ان حالات میں رابطۂ عالم اسلامی مسلمانوں کے ساتھ کیے جانے والے سلوک، زیادتیوں اور بین الاقوامی حقوق کی خلاف ورزی پر فوجی حکومت کی سخت مذمت کرتی ہے۔"[1]

اسماعیل بالک لکھتے ہیں: "دوسری عالمی جنگ سے پہلے وارسا میں مسجد کی تعمیر کا جو منصوبہ تیار کیا گیا تھا وہ دھرا کا دھرارہ گیا۔ یہاں امام محمود طٰہ سرگرم ہیں، لیکن ابھی تک پولینڈ کی چھ اسلامی انجمنوں کی طرف سے کوئی متحدہ کوشش نہیں کی گئی۔"[2]

جرنل، مکہ معظّمہ کی اطلاع کے مطابق چند سال پہلے وارسا کے امام محمد طٰہ زوک (Zuk) "الاسلام" کے نام سے ایک پرچہ میموگراف پر نکالتے تھے۔ اب وہ ایک مصری سائنسدان کی مدد سے جو وارسا میں کام کر رہا ہے اسلام پر عربی کی ضروری کتابوں کا پولستانی زبان میں ترجمہ شائع کرنا چاہتے۔ حال ہی میں یہاں کے مسلمانوں نے پولستانی مسلمانوں اور باقی اسلامی دنیا کے درمیان تعلق قائم کرنے کے لیے رابطۂ اسلامی سے مدد طلب کی ہے۔[3]

بوگوسلاوز گورسکی نے بتایا ہے کہ پولینڈ میں تین مسجدوں کی تعمیر کا منصوبہ تیار کیا گیا ہے لیکن سرمایہ کی کمی ان کی تکمیل میں حائل ہے۔ لیبیا نے وارسا کی مسجد کے لئے جو رقم دینے کا وعدہ کیا تھا وہ ابھی تک نہیں ملی اور بیالسٹوک کی مسجد کے لیے عراق نے مدد دینے کا جو وعدہ کیا تھا وہ عراق ایران کی جنگ کی نذر ہو گیا۔[4]

---

(۱) ہفت روزہ "مسلم ورلڈ" کراچی ۹۔ جنوری ۱۹۸۲ء

(۲) فکرونظر، اسلام آباد۔ اکتوبر ۱۹۸۲ء۔

(۳) دی جرنل (رابطہ عالم اسلامی، مکہ) اکتوبر ۱۹۸۱ء۔

(۴) روزنامہ "ڈان" کراچی۔ ۸۔ اپریل ۱۹۸۲ء

فن لینڈ

فن لینڈ کا رقبہ ایک لاکھ تیس ہزار مربع میل (تین لاکھ پانچ ہزار مربع کلومیٹر) ہے۔ اور آبادی (۱۹۸۰ء) ۴۸ لاکھ۔ دارالحکومت ہیلسنکی ہے۔

فن لینڈ شروع میں سویڈن کی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ ۱۸۰۹ء میں سلطنت روس کی تابع ایک ریاست ہوگیا۔ ۶۔ دسمبر ۱۹۱۷ء کو فن لینڈ آزاد ہوگیا۔

فن لینڈ کے مسلمان تاتاری ترک ہیں جو ۱۸۶۰ء میں روس کی طرف سے آئے۔ اسماعیل بالک کے مطابق ۱۹۶۷ء میں یہاں ایک ہزار مسلمان تھے۔[۱] مسیحی مسلمان مطالعہ کے انسٹی ٹیوٹ نے جو اعداد شمار شائع کیے ہیں ان کے مطابق ۱۹۸۱ء میں مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار تھی۔[۲]

فن لینڈ میں ایک چھوٹی سی مرکزی مسجد ہیل سنکی کی ایک بڑی عمارت کے اندر قائم ہے۔ اس عمارت کے مختلف حصوں کو کرایہ پر دیا جاتا ہے جس سے مذہبی کام انجام دیئے جاتے ہیں۔ ہیلسنکی کے باہر تمپیرے (tampere) اور تورکو (turku) میں نماز کے لیے کرایہ پر کمرے لے لیے جاتے ہیں۔[۳]

موتمر عالم اسلامی کے مطابق "دارالحکومت ہیلسنکی میں ساڑھے چھ سو مسلمان ہیں اور تمپیرے میں ایک سودس۔ فنی زبان میں قرآن کے ترجمے میں موجود ہیں اور قرآن آسانی سے دستیاب ہے۔ دینی کتابیں بھی آسانی سے مل جاتی ہیں۔ شخصی قانون نافذ نہیں۔ ۸۵ فیصد بچے

(۱) فکر ونظر، اسلام آباد، اکتوبر ۱۹۸۲ء۔

(۲) نیوز آف مسلمز ان یورپ ۲۷۔ جنوری ۱۹۸۲ء

(۳) فکر ونظر، اسلام آباد، اکتوبر ۱۹۸۲ء۔

سویڈن

سویڈن کا رقبہ ایک لاکھ ۷۳ ہزار مربع میل (چار لاکھ ۱۱ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) ۸۳ لاکھ ہے۔ اسٹاک ہالم دارالحکومت ہے۔ سترہویں صدی میں سویڈن یورپ کی بہت بڑی طاقت تھی۔ اب یہ ایک آئینی بادشاہت ہے۔ اس ملک کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ یورپ کی پہلی پارلیمنٹ (riksdag) ۱۴۳۵ء میں یہاں قائم ہوئی اور اس میں معاشرے کے ہر طبقہ کو نمائندگی دی گئی تھی۔

موتمر عالم اسلامی کے تخمینہ کے مطابق ۱۹۷۷ء کے قریب سویڈن میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً دس ہزار تھی۔ ان کی اکثریت غیر ملکی ہے۔ اسٹاک ہالم میں تین ہزار، گوٹن برگ میں تین ہزار اور مالمو میں ایک ہزار مسلمان تھے۔

محمد انور نے سویڈن کے مسلمان مہاجرین کا جو جائزہ شائع کیا ہے اس کے مطابق مسلمانوں کی تعداد ۲۴ ہزار ہے۔ مسیحی مسلمان تعلقات کے ادارے کے مطابق ۱۹۷۹ء میں سویڈن میں پچیس ہزار مسلمان تھے۔ سویڈن کے ابتدائی مسلمان آباد کار ترک مہاجر تھے جو دوسری عالم جنگ کے بعد یہاں آ کر آباد ہوئے۔ اس کے بعد مراکش، یوگوسلاوی اور پاکستانی مسلمان آنا شروع ہوئے، یوگوسلاوی مسلمان ان میں سب سے زیادہ ہیں۔ پاکستانی مسلمانوں کی تعداد پانچ سو ہے۔ (۱) سویڈن کے اصلی باشندوں میں بھی کچھ مسلمان پائے جاتے ہیں۔ (۲)

سویڈن میں دو اسلامی مرکز ہیں ایک اسٹاک ہالم میں دوسرا مالمو میں، ۱۹۷۷ء تک اسٹاک ہالم کا اسلامی مرکز، نماز کے ایک ہال، چند کمروں اور دفتر پر مشتمل تھا اور حکومت سویڈن اسلامک

---

(۱) جرنل (جدہ یونیورسٹی) جلد اول شمارہ اول ۱۹۷۹ء۔

(۲) ترکستانی دانشور ہائے مرزا ہایت نے سویڈن میں ترک باشندوں کی تعداد ۱۴½ ہزار بتائی ہے دیکھئے مضمون ''مغربی جرمنی میں ترک'' مطبوعہ جرنل (جدہ یونیورسٹی جلد ۳ شمارہ نمبر ۲ (۱۹۸۱ء)

سوئیڈن

سوئیڈن کا رقبہ ایک لاکھ ۷۳ ہزار مربع میل (چار لاکھ ۱۱ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی ۱۹۸۰ء) ۸۳ لاکھ ہے۔ اسٹاک ہالم دارالحکومت ہے۔ سترہویں صدی میں سوئیڈن یورپ کی بہت بڑی طاقت تھی۔ اب یہ ایک آئینی بادشاہت ہے۔ اس ملک کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ یورپ کی پہلی پارلیمنٹ (riksdag) ۱۴۳۵ء میں یہاں قائم ہوئی اور اس میں معاشرے کے ہر طبقہ کو نمائندگی دی گئی تھی۔

موتمر عالم اسلامی کے تخمینہ کے مطابق ۱۹۷۷ء کے قریب سوئیڈن میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً دس ہزار تھی۔ ان کی اکثریت غیر ملکی ہے۔ اسٹاک ہالم میں تین ہزار، گوٹن برگ میں تین ہزار اور مالمو میں ایک ہزار مسلمان تھے۔

محمد انور نے سوئیڈن کے مسلمان مہاجرین کا جو جائزہ شائع کیا ہے اس کے مطابق مسلمانوں کی تعداد ۲۴ ہزار ہے۔ مسیحی مسلمان تعلقات کے ادارے کے مطابق ۱۹۷۹ء میں سوئیڈن میں پچیس ہزار مسلمان تھے۔ سوئیڈن کے ابتدائی مسلمان آبادکار ترک مہاجر تھے جو دوسری عالم جنگ کے بعد یہاں آ کر آباد ہوئے۔ اس کے بعد مراکش، یوگوسلاوی اور پاکستانی مسلمان آنا شروع ہوئے، یوگوسلاوی مسلمان ان میں سب سے زیادہ ہیں۔ پاکستانی مسلمانوں کی تعداد پانچ سو ہے۔[1] سوئیڈن کے اصلی باشندوں میں بھی کچھ مسلمان پائے جاتے ہیں۔[2]

سوئیڈن میں دو اسلامی مرکز ہیں ایک اسٹاک ہالم میں دوسرا مالمو میں، ۱۹۷۷ء تک اسٹاک ہالم کا اسلامی مرکز، نماز کے ایک ہال، چند کمروں اور دفتر پر مشتمل تھا اور حکومت سوئیڈن اسلامک

---

(۱) جرنل (جدہ یونیورسٹی) جلد اول شمارہ اول ۱۹۷۹ء۔
(۲) ترکستانی دانشور ہائے مرزا ہایت نے سوئیڈن میں ترک باشندوں کی تعداد ½۱۴ ہزار بتائی ہے دیکھئے مضمون ''مغربی جرمنی میں ترک'' مطبوعہ جرنل (جدہ یونیورسٹی جلد ۳ شمارہ نمبر ۲ (۱۹۸۱ء)

سنٹر کو بیس ہزار پونڈ سالانہ کی امداد دیتی ہے۔[1]

مسلمانوں کی چار تنظیمیں ہیں۔ ان کے علاوہ مسلمان سفیروں کی ایک کونسل بھی ہے۔ نیشنل فیڈریشن آف مسلمز بھی قائم ہے۔[2] جو غالباً مسلمان تنظیموں پر مشتمل ہے۔ اس فیڈریشن کو فری چرچز کمیشن میں نمائندگی حاصل ہے۔

سویڈن کی حکومت ناروے اور ڈنمارک کے مقابلے میں مسلمان مہاجرین سے زیادہ تعاون کرتی ہے۔ مسلمان مہاجرین کی اکثریت غیر ہنر مند مزدوروں پر مشتمل ہے جو سخت اور گندے قسم کے کام کرتے ہیں۔ کچھ لوگ کارخانوں میں بھی کام کرتے ہیں۔ قانونی طور پر تنخواہ اور شرائط کار میں کوئی امتیاز نہیں لیکن عملی طور پر ایسا نہیں' مسلمان کم تنخواہ اور زیادہ کام کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کی وجہ مالک کا امتیازی سلوک، زبان سے ناآشنائی اور غیر ہنر مند ہونا ہے۔ بہت کم لوگوں کے پاس ذاتی مکان ہیں۔ مالک رہائش فراہم کرتا ہے یا کرایہ کے مکان میں رہتے ہیں۔ بڑی تعداد شہر کے اندرونی حصوں میں رہتی ہے جہاں معیار پست ہے۔ مذہبی تعلیم پر پابندی نہیں لیکن کوئی انتظام نہیں ہے۔[3]

موتمر عالم اسلامی کے مطابق قرآن آسانی سے مل جاتا ہے اور اس کا تین مرتبہ سویڈن کی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے جو عیسائیوں نے کیے تھے اور اب دستیاب نہیں ہیں۔ سویڈن کی زبان میں اسلام پر کتابچے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ شخصی قانون نافذ نہیں۔ مدرسے نہیں ہیں۔ احمدی عقائد کے لوگ سرگرم ہیں۔

---

(۱) مسلم ورلڈ، کراچی ۲۱۔ دسمبر ۱۹۷۷ء

(۲) جرنل (جدہ) جلد اول شمارہ اول ۱۹۷۹ء

(۳) ایضاً۔

ناروے

ناروے کا رقبہ ایک لاکھ ۲۵ ہزار مربع میل (تین لاکھ ۲۳ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) چالیس لاکھ ہے۔ اوسلو، دارالحکومت ہے۔ ناروے مشہور جنگجو قبائل وائی کنگز کا وطن تھا جنھوں نے ۸۰۰ء اور ۱۰۰۰ء کے درمیان اپنے بحری چھاپوں سے سارے یورپ میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ ۱۳۸۱ء تا ۱۸۱۴ء ناروے پر ڈنمارک کا اور ۱۸۱۴ء سے ۱۹۰۵ء تک سویڈن کا قبضہ رہا۔ ناروے میں آئینی بادشاہت قائم ہے۔

ناروے میں مسلمانوں کی تعداد نو ہزار ہے اور یہ سب بیرون ملک سے تعلق رکھتے ہیں۔ سب سے بڑا گروہ پاکستانیوں کا ہے جن کا تعداد پانچ ہزار آٹھ سو اکاون ہے۔[۱] مسیحی مسلم مطالعہ کے ادارہ کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۷۹ء میں ناروے میں مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار تھی۔[۲] مسلمان آبادکاروں کی اکثریت غیر ہنرمند ہے اور زیادہ تر ہوٹلوں، اور ریستورانوں، دھلائی اور صفائی کے کاموں میں ملازم ہیں۔

ناروے میں کوئی مسجد نہیں۔ اوسلو میں پاکستانی اسلامی انجمن حنفیہ نے دو کمروں پر مشتمل ایک مرکز قائم کر رکھا ہے جہاں بچوں کو دینی تعلیم دی جاتی ہے۔ پاکستان ویلفیر ایسوسی ایشن پاکستانی باشندوں میں سرگرم ہے۔ پاکستانیوں، ترکوں اور یوگوسلاوی مسلمانوں کے درمیان ابھی تک ربط و تعاون نہیں۔[۳]

کئی سال سے اوسلو میں اسلامی مرکز قائم کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اب ۱۹۸۱ء کے موسم خزاں میں حکومت نے اس مقصد کے لیے ایک قطعہ زمین دے دیا ہے۔[۴]

---

(۱) جرنل (جدہ) جلد اول، شمارہ اول ۱۹۷۹ء
(۲) نیوز آف مسلمز ان یورپ ۲۷۔ جنوری ۱۹۸۲ء
(۳) جرنل (جدہ) جلد اول، شمارہ ال ۱۹۷۹ء
(۴) نیوز آف مسلمز ان یورپ ۱۵۔ مارچ ۱۹۸۲ء

ڈنمارک

ڈنمارک، شمالی یورپ کا ایک چھوٹا سا ملک ہے جو سارے یورپ کو ڈیری کی مصنوعات فراہم کرنے کے علاوہ صنعت وحرفت میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ ڈنمارک کا رقبہ سترہ ہزار مربع میل (۴۳ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۱ء) ۵۱ لاکھ سے کچھ زیادہ ہے۔ کوپن ہیگن دارالحکومت ہے۔ یہاں جو زبان بولی جاتی ہے وہ ڈینش یعنی ڈنمارکی کہلاتی ہے۔ تقریباً تمام آبادی عیسائی ہے۔

مسلمانوں کی تعداد ۲۵ ہزار بتائی جاتی ہے۔[1] لیکن مسیحی مسلم تعلقات کے ادارے نے ۱۹۸۱ء میں مسلمانوں کی تعداد تیس ہزار بتائی ہے۔[2] تمام مسلمان بیرونی ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں جو تلاش معاش کے سلسلے میں آئے ہوئے ہیں۔ اکثریت کوپن ہیگن اور اس کے نواح میں رہتی ہے۔ کچھ تعداد دوسرے بڑے شہر ارہس (arhus) میں بھی رہتی ہے۔ آبادکاروں میں سب سے بڑا گروہ پاکستانی مسلمانوں کا ہے جن کی تعداد گیارہ ہزار ہے۔ مقامی لوگوں میں بھی اسلام پھیل رہا ہے۔ سب سے پہلے ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان یہاں کے چند لوگ اسلام لائے۔ اسی زمانہ میں باہر سے مسلمان آنا شروع ہوگئے لیکن آمد کا یہ سلسلہ ۱۹۷۵ء تک بند ہوگیا۔ ایک اطلاع کے مطابق جو مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے کوپن ہیگن کا اسلامی مرکز اب تک کئی ہزار اہل ڈنمارک کو مسلمان بنا چکا ہے۔[3] صرف مئی ۱۹۷۹ء میں ڈنمارک کے پچیس باشندوں نے اسلام قبول کیا۔[4] اس

---

(۱) اسلامک ہیرلڈ، کوالالپور، جلد ۴ شمارہ ۷۔ ۱۹۸۰،۸ء نیز جرنل جلد اول شمارہ اول ۱۹۷۹ء۔

(۲) نیوز آف مسلمز ان یورپ ۷۔ ۲ جنوری ۱۹۸۲ء

(۳) اسلامک ہیرلڈ، کوالالپور جلد ۴ شمارہ ۷۔ ۱۹۸۰،۸ء

(۴) ایضاً بحوالہ ''الداعوۃ'' سعودی عرب۔

کے ساتھ ہی مسیحی مبلغ بھی آبادکاروں میں سرگرم ہیں اور ان کو کامیابی بھی ہوئی ہے۔[1]

اسکنڈے نیویا کے ملکوں میں سب سے بہتر حالت ڈنمارک کے مسلمانوں کی ہے۔ وہ منظم بھی ہیں اور ان کی شرائط کار بھی اچھی ہیں۔ مسلمان شروع میں نماز کے لیے کرایہ پر کوئی کمرہ لے لیتے تھے، لیکن جلد ہی انھوں نے چھ مسجدیں تعمیر کر لیں۔ ڈنمارک میں پہلی مسجد کا جولائی ۱۹۶۷ء میں افتتاح ہوا تھا۔ تقریب میں مختلف ملکوں کے مسلمانوں نے جن میں دو سو ڈنمارکی مسلمان شامل تھے حصہ لیا۔

کوپن ہیگن میں کئی سال سے ایک اسلامی مرکز کام کر رہا ہے جو ایک ایسی عمارت میں قائم ہے جہاں پہلے ڈیری کا کام ہوتا تھا۔ یہاں نماز اور مذہبی تعلیم کا انتظام ہے۔ مرکز سے اسلامی کتابچوں کے علاوہ ایک سہ ماہی جریدہ (islamisk udsvn) بھی شائع ہوتا ہے۔ یہ مرکز نہ صرف ڈنمارک کے لیے بلکہ پورے اسکنڈے نیویا کے لیے مرکز اطاعات کا فرض ادا کرتا ہے۔ مرکز اطاعات کا اسلامی مدرسہ ۱۹۷۵ء سے چل رہا ہے اور اس کا نصاب تعلیم حکومت کا منظور کردہ ہے۔[2] منتظمین یہ کوشش کر رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے دینی تقاضوں کو بھی پورا کر سکیں اور ان قانونی اور انتظامی شرائط کو بھی پوری کر سکیں جو حکومت نے آزاد مدرسوں کے لیے مقرر کی ہیں۔

مراکشی سفیر کی سربراہی میں ایک کمیٹی کئی سال سے کوپن ہیگن میں اسلامی مرکز اور ایک مسجد کے لیے مستقل عمارت کی تعمیر کے لیے کوشش کر رہی تھی۔ تازہ ترین اطلاع کے مطابق ڈنمارک کی حکومت نے اس مقصد کے لیے کوپن ہیگن کے وسط میں ۲۷ ہزار مربع میٹر کا ایک قطعہ اراضی فراہم کر دیا ہے جس پر مسجد، ثقافتی مرکز اور دکانیں تعمیر کی جاسکیں گی اور کھیلوں کے میدان بھی ہوں گے۔[3]

ڈنمارک میں قرآن آسانی سے دستیاب ہے۔ ڈنمارک کی زبان میں بھی ترجمہ ہوگیا ہے، لیکن یہ ترجمہ قادیانیوں کے اہتمام میں کرایا گیا ہے اور حاشیہ میں قادیانی نقطۂ نظر کی ترجمانی کی گئی ہے۔[4]

---

(۱) موتمر عالم اسلامی کراچی کا کتابچہ "مسلمان اقلیتیں"۔

(۲) نیوز آف مسلمز ان یورپ ۷۔ مارچ ۱۹۸۰ء

(۳) مسلم ورلڈ، کراچی ۲۹۔ اگست ۱۹۸۱ء

(۴) 'مسلمان اقلیتیں' شائع کردہ موتمر اسلامی، کراچی ۱۹۷۷ء ۴۔ جرنل (جدہ یونیورسٹی) جلد ۳ شمارہ نمبر ۲ (۱۹۸۱ء)

ڈنمارک میں اسلامی شخصی قانون نافذ نہیں۔ بنیادی اسلامی تعلیم مسجدوں میں دی جاتی ہے، لیکن دینی تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کا تناسب بہت کم ہے۔ بعض مدرسوں میں منتظمین کی اجازت سے ہفتہ میں ایک دن دینی تعلیم دی جاسکتی ہے۔

ترکستانی دانسور بابے مرزا ہایت نے اپنے ایک مضمون ''مغربی جرمنی میں ترک مطبوعہ جرنل (حدہ) میں ڈنمارک میں ترکوں کی تعداد چودہ ہزار لکھی ہے۔[1]

---

(۱) جرنل (جدہ یونیورسٹی) جلد ۳ شمارہ نمبر ۲ (۱۹۸۱ء)

سوئٹزرلینڈ

سوئٹزرلینڈ کا رقبہ سولہ ہزار مربع میل (۴۱ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی ۱۹۸۰ء ۶۴ لاکھ ہے۔ برن دارالحکومت ہے۔ جرمن، فرانسیسی اور اطالوی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ مقامی آبادی عیسائی ہے جن میں نصف کیتھولک کلیسا سے اور نصف پروٹسٹنٹ کلیسا سے وابستہ ہیں۔ تقریباً بیس ہزار باشندے یہودی ہیں۔ مسیحی مسلمان تعلقات کے ادارے کے تخمینہ کے مطابق ۱۹۸۰ء میں مسلمانوں کی تعداد ۵۵ ہزار تھی، جن میں موتمر عالم اسلامی کے کتابچے کے مطابق پانچ ہزار مقامی باشندے ہیں۔ باقی بیرونی ملکوں سے آئے ہوئے مسلمان ہیں۔[1] بابائے مرزا ہایت نے سوئٹزرلینڈ میں صرف ترکوں کی تعداد تیس ہزار سات سو لکھی ہے۔[2]

سوئٹزرلینڈ ۱۸۱۵ء سے کسی ملک کے ساتھ جنگ میں شریک نہیں ہوا، اس لیے اس کو ایک غیر جانبدار ملک کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ میثاق اوقیانوس یا اس قسم کے کسی معاہدے میں شریک نہیں۔ اقوام متحدہ کے کئی اداروں کے صدر دفتر سوئٹزرلینڈ میں ہیں۔ اپنے خوبصورت مناظر کی وجہ سے عالمی سیاحت کا بہت بڑا مرکز ہے اس کے علاوہ عالمی بنکنگ کا بھی بہت بڑا مرکز ہے۔

نویں صدی عیسوی میں کچھ عرب چھاپہ مار جنوبی فرانس کی طرف سے بڑھتے ہوئے سوئٹزرلینڈ کے بعض حصوں پر قابض ہو گئے تھے اور مونترو (montreaux) کے علاقے میں آباد بھی ہو گئے تھے، لیکن جلد ہی نکال دیئے گئے۔[3]

مسلمان زیادہ تر شہروں میں خصوصاً جنیوا، لوزان، زیورچ اور برن میں آباد ہیں۔ مسجد کوئی

---

(۱) دیانت، انقرہ یکم مئی ۱۹۷۹ء میں سوئٹزرلینڈ میں مسلمانوں کی تعداد صرف پانچ ہزار بتائی گئی ہے۔

(۲) جرنل (جدہ یونیورسٹی) جلد ۳ شمارہ نمبر ۲ (۱۹۸۱ء) مضمون "مغربی جرمنی میں ترک"

(۳) تفصیل کے لئے دیکھئے امیر شکیب ارسلان کی کتاب "جنوبی یورپ پر عربوں کے حملے" اردو ترجمہ انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۵۷ء

نہیں۔ جنیوا میں اسلامک انسٹی ٹیوٹ ہے اور ایک اسلامی مرکز ہے۔ اسلامی مرکز میں نماز کا بھی انتظام ہے۔ انسٹی ٹیوٹ میں ایک مدرسہ ہے جہاں کچھ مسلمان بچے دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

مسلمان، بین الاقوامی اداروں کے دفتروں میں بعض اہم عہدوں پر فائز ہیں۔

قرآن آسانی سے مل جاتا ہے۔ جرمن اور فرانسیسی ترجمے بھی مل جاتے ہیں اور بعض دینی کتب بھی مل جاتی ہیں۔

امپیکٹ کی اطلاع کے مطابق یکم مئی ۱۹۷۹ء کو لوزان میں ایک اسلامی مرکز کا افتتاح کیا گیا ہے جس میں اسلامی ملکوں کے سفارت خانوں کے عملے نے شرکت کی۔ (۱)

---

(۱) امپیکٹ لندن۔ ۸۔ ۲۱۔ جون ۱۹۷۹ء

آسٹریا

آسٹریا کا رقبہ ۳۲ ہزار مربع میل (۸۴ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۷۸ء) ۷۵ لاکھ ہے۔ ویانا دارالحکومت ہے۔ زبان جرمن ہے اور ۸۸ فیصد باشندے کیتھولک کلیسا سے وابستہ ہیں۔ باقی لوگ پروٹسٹنٹ اور دوسرے فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ تیرہ ہزار یہودی بھی ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد ڈاکٹر اسماعیل بالک کے مطابق ۱۹۷۸ء میں پچاس ہزار تھی۔ یہی تخمینہ موتمر عالم اسلامی کا ہے۔ لیکن مسیحی مسلمان تعلقات کے ادارہ نے ۱۹۸۰ء میں مسلمانوں کی تعداد ستر ہزار بتائی ہے۔[1] ویانا میں مسلمانوں کی تعداد بیس ہزار ہے۔

۱۵۲۶ء میں ہنگری پر عثمانی ترکوں کے قبضہ کے بعد عثمانی ترکوں کا وسط یورپ میں سب سے بڑا حریف آسٹریا ہی تھا۔ ترکوں نے ۱۵۲۹ء اور پھر ۱۶۸۳ء میں دو مرتبہ آسٹریا کے دارالحکومت ویانا کا محاصرہ کیا لیکن قبضہ کرنے میں ناکام رہے۔ دوسرے محاصرے کی ناکامی کے بعد آسٹریا ہنگری کی شہنشاہیت وجود میں آئی جس کا خاتمہ پہلی جنگ عظیم میں جرمنی اور آسٹریا کی شکست کے بعد ۱۹۱۸ء میں ہوا اور اس طرح آسٹریا کی موجودہ جمہوریہ وجود میں آئی۔

آسٹریا میں اسلام انیسویں صدی میں یوگوسلاویا کے بوسنوی مسلمانوں کے ذریعہ پہنچا۔ مسلمانوں کی اکثریت ترک یا یوگوسلاوی مزدوروں پر مشتمل ہے۔ مسلمان اتنی بڑی تعداد کے باوجود منظم نہیں ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں ویانا میں اسلامی مرکز اور ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی اور اب پندرہ لاکھ ڈالر کے خرچ سے دوسری مسجد تعمیر کی جارہی ہے۔ اس مسجد کے لیے شاہ فیصل نے ایک لاکھ

---

(۱) مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ) اگست ۱۹۸۲ء میں بھی مسلمانوں کی تعداد ستر ہزار بتائی گئی ہے اور یہ وضاحت بھی کی ہے کہ ان میں پانچ ہزار مسلمان آسٹروی شہری ہیں اور ان کی اکثریت بوسنوی مسلمانوں کی اولاد ہے۔ بائے مرزا حایت (Hayit) نے آسٹریلیا میں ترکوں کی تعداد ۴۹ ہزار لکھی ہے جرنل (جدہ) جلد ۳ شمارہ نمبر ۲ (۱۹۸۱ء) مضمون "جرمنی میں ترک"، لیکن مضمون میں غلطی سے آسٹریا کی بجائے آسٹریلیا لکھ دیا گیا ہے۔

ڈالر دیئے تھے۔ ڈاکٹر اسماعیل بالک کی اطلاع کے مطابق مدرسوں میں بھی اسلامی تعلیم اگلے تعلیمی سال سے شروع ہو جائے گی۔ [1]

آسٹریا کی حکومت نے ۲۔ مئی ۱۹۷۹ء کو اسلام کو سرکاری طور پر آسٹریا کا ایک مذہب قبول کر لیا جس کے بعد توقع ہے کہ مسلمانوں کی بہت سی مشکلات دُور ہو جائیں گی اور ان کی دینی تعلیم کی سہولتیں حاصل ہو جائیں گی۔ [2]

آسٹریا کے مسلمانوں میں ڈاکٹر اسماعیل بالک (Smail Balic) کی شخصیت بہت اہم ہے۔ وہ آسٹریا کی نیشنل لائبریری ویانا میں مشرقی زبانوں کے ماہر ہیں۔ وہ نسلاً بوسنوی مسلمان ہیں اور یوگوسلاویا کے مسلمانوں سے متعلق کئی کتابوں اور مقالوں کے مصنف ہیں۔ جن میں ایک ''بوسنہ کی اسلامی ثقافت'' سے متعلق ہے۔ یہ کتاب سربوکروٹ زبان میں ہے اور ۱۹۷۶ء میں ویانا سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ انھوں ۱۹۶۴ء میں جرمن زبان میں ہنگری میں اسلام کی تاریخ پر ایک کتابچہ بھی لکھا تھا جس کا عربی ترجمہ ''الاسلام فی المجارفی القرون الوسطیٰ، ۱۹۶۵ء میں قاہرہ سے شائع ہوا۔

---

(۱) مسلم ورلڈ، کراچی ۲۰۔ فروری ۱۹۸۲ء اور نیوز آف مسلمز ان یورپ ۱۵۔ مارچ ۱۹۸۲ء

(۲) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ) اگست ۱۹۸۲ء

اٹلی

اسپین، پرتگال اور فرانس کی طرح اٹلی بھی یورپ کے ان ملکوں میں سے ہے جن پر عربوں کا اقتدار رہا۔ اٹلی کے جزیرے صقلیہ (سسلی) پر ۸۲۷ء/ ۲۱۲ھ سے ۱۰۹۱ء/ ۴۸۴ھ تک مسلمانوں کی حکومت رہی۔ اس زمانے میں جنوبی اٹلی کے صوبوں قلوریہ (calabria) انکبردہ، (longobardi) اپولیا اور کمپانیا پر بھی کچھ مدت مسلمانوں کی حکومت رہی۔ ریو طارنت (tranto) ابرندس (brindzi) باری اور سلرنو یہاں کی مشہور بستیاں تھیں۔ یہ علاقے کبھی صقلیہ کی اسلامی حکومت کے تحت آجاتے تھے اور کبھی خود مختار ہو جاتے تھے۔ باری ۱۰۶۱ء/ ۴۵۳ھ میں مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ صقلیہ سے مسلمانوں کا اقتدار ختم ہونے کے بعد اندلس کی طرح وہاں سے بھی ۱۲۴۹ء/ ۶۴۷ھ تک مسلمان یا تو نکال دیئے گئے، یا قتل کر دیئے گئے یا جبراً عیسائی بنا لیے گئے۔ صوبہ سلرنو میں نوسیرا کے علاقے میں جسے عرب لوجارہ کہتے تھے اسی ہزار مسلمان آباد تھے، لیکن ۱۳۰۰ء/ ۷۰۰ھ میں ان سب کو بھی جبراً عیسائی بنا لیا گیا اور اس طرح اٹلی کے ہر حصے سے مسلمانوں کا خاتمہ ہو گیا۔[1]

مسلمان اگرچہ صقلیہ اور جنوبی اٹلی سے ختم کر دیئے گئے لیکن صقلیہ اور شمالی اٹلی میں گیارھویں صدی سے تیرھویں صدی تک عربی کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کا کام ہوتا رہا جس نے یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے راہ ہموار کی۔[2]

اٹلی کا رقبہ ایک لاکھ سولہ ہزار مربع میل (تین لاکھ مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) ۵ کروڑ ستر لاکھ ہے۔ ملک کی بیشتر آبادی رومن کیتھولک عیسائی ہے۔ یہودیوں کی تعداد پچاس

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے سید ریاست علی ندوی کی کتاب ''تاریخ صقلیہ'' مطبوعہ اعظم گڑھ (ہند)

(۲) (The Legacy of Islam) آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۳۹ء صفحہ ۳۴۴۔۳۴۵ نیز (The Legacy of Israil) اور جارج سارٹن کی مقدمہ تاریخ سائنس۔

ہزار ہے۔ مسیحی مسلمان تعلقات کے انسٹی ٹیوٹ کے مطابق ۱۹۷۹ء میں اٹلی میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ اسی ہزار تھی۔ ترکی اخبار دیانت گزٹ، انقرہ مورخہ یکم مئی ۱۹۷۹ء میں مسلمانوں کی تعداد پانچ لاکھ بتائی گئی ہے جو مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے۔ مسلمان زیادہ تر عرب ہیں اور شمالی افریقہ کے ملکوں سے ملازمتوں کی تلاش میں آئے ہیں۔ چونکہ نو وارد ہیں اس لیے ابھی تک منظم نہیں ہیں۔ پورے ملک میں کوئی مسجد نہیں۔ دار الحکومت روم میں ایک اسلامی مرکز ہے جس میں نماز کا انتظام ہے۔ سعودی حکومت نے مرکز کی عمارت اور مسجد کی تعمیر کے لیے ستر لاکھ ڈالر دیئے ہیں۔[1] لیکن گردونواح کے لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے تعمیر کا کام اب تک رکا ہوا تھا۔ لیکن اب اجازت مل گئی ہے۔ اور توقع ہے کہ روم میں پہلی مسجد جلد ہی بن جائے گی۔[2]

---

(۱) امپیکٹ، لندن۔ ۱۱۔ ۲۴ مئی ۱۹۷۹ء

(۲) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ)۔ جنوری ۱۹۸۳ء

ہالینڈ

ہالینڈ جس کا انگریزی میں نیدر لینڈز (netherlands) لکھا جاتا ہے شمالی یورپ کا ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ رقبہ چودہ ہزار مربع میل (۳۴ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) ایک کروڑ چالیس لاکھ ہے۔ ایمسٹرڈم، دارالحکومت ہے۔ یہاں آئینی بادشاہت قائم ہے۔ ولندیزی عام زبان ہے۔ بیشتر آبادی رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ہے جن کی تعداد تقریباً برابر ہے۔ یہودیوں کی تعداد تیس ہزار ہے۔ ۱۹۶۰ء کی مردم شماری میں اکیس لاکھ آبادی نے کسی بھی مذہب سے وابستگی ظاہر نہیں کی۔

مسیحی مسلمان تعلقات کے ادارے کے مطابق ۱۹۸۰ء میں ہالینڈ میں مسلمانوں کی تعداد دو لاکھ اسی ہزار تھی۔ ایک ولندیزی مضمون نگار نے یہ تعداد تین لاکھ بتائی ہے اور لکھا ہے کہ ان میں ترکوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ۳۵ ہزار مسلمان سرینام کی سابق ولندیزی نو آبادی کے ہیں اور اردو بول سکتے ہیں اور انھوں نے پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کے تعاون سے کئی مسجدیں قائم کر لی ہیں۔[1]

ہالینڈ میں مسلمانوں کی کئی تنظیمیں ہیں۔ جنھوں نے مل کر ایک وفاق بنالیا ہے جو ہالینڈ کی مسلم تنظیموں کا وفاق کہلاتا ہے۔ اسی طرح مسلمان خواتین کی ایک انجمن۔ ان دونوں نے مل کر ایک اسلامی اطلاعاتی کمیٹی قائم کی ہے۔ یہ کمیٹی سمعی بصری آلات، سلائڈوں، فلموں کو جمع کر رہی ہے۔ ایک اور تازہ اطلاع کے مطابق شہر اتریخت (utrecht) میں جون ۱۹۸۱ء میں ایک مسجد اور ایک اسلامی مرکز کا افتتاح ہوا اور راٹرڈم میں ایک مسجد تعمیر کرنے کے منصوبے کا اعلان کیا گیا ہے۔[2]

---

(۱) ڈان، کراچی ۳۰۔ اپریل ۱۹۸۲ء

(۲) نیوز آف مسلمز ان یورپ ۷۔ مارچ اور ۱۵۔ مارچ ۱۹۸۲ء

ایک اور اطلاع کے مطابق ہالینڈ کے پاکستانی مسلمان مولانا شاہ احمد نورانی کی رہنمائی میں ایک دینی مدرسہ قائم کر رہے ہیں۔ (۱)

مشہور ترکستانی دانشور بابے مرزا ہایت کی ایک تازہ اطلاع کے مطابق ہالینڈ میں ترکوں کی تعداد ۹۴ ہزار ہے۔ (۲)

---

(۱) جنگ کراچی۔ جنوری ۱۹۸۳ء

(۲) جرنل (مسلمان اقلیتوں کے امور کا انسٹی ٹیوٹ) اصیہ جلد ۳ شمارہ نمبر ۲ (اردو ریویو)

بلجیم

بلجیم کا رقبہ بارہ ہزار مربع میل اور آبادی (۱۹۸۰ء) ۹۸ لاکھ ہے۔ دارالحکومت بروسلز ہے۔ شمالی حصہ میں فلیمش زبان بولی جاتی ہے جو ولندیزی زبان کی ایک شاخ ہے، جنوبی حصہ میں فرانسیسی عام ہے اور مشرقی سرحد پر تھوڑی سی آبادی جرمن بھی بولتی ہے۔ عام آبادی عیسائی ہے جس میں رومن کیتھولک کلیسا کے پیرو نوے فیصد ہیں۔ اکتالیس ہزار باشندے یہودی ہیں۔

ترکی کی وزارت مذہبی امور کے پرچے دیانت گزٹ کے مطابق بلجیم میں دو لاکھ مسلمان ہیں جن میں ۶۵ ہزار ترک ہیں۔[1] عیسائی مسلم تعلقات کے ادارے کے مطابق ۱۹۸۰ء میں بلجیم میں مسلمانوں کی تعداد ڈھائی لاکھ تھی۔[2]

بلجیم کی حکومت نے ۱۹۔ جولائی ۱۹۷۴ء کو ایک حکم کے ذریعہ اسلام کو سرکاری طور پر تسلیم کرلیا ہے۔[3]

---

(۱) دیانت گزٹ، انقرہ۔ ۱۵، جنوری ۱۹۷۹ء۔ ترکستانی دانشور بابائے مرزا ہایت نے اپنے مضمون "مغربی جرمنی میں ترک" میں بلجیم میں ترکوں کی تعداد ۵۹ ہزار دو سو لکھی ہے۔ جرنل (جدہ) یونیورسٹی جلد ۳ شمارہ نمبر ۲۔ ۱۹۸۱ء

(۲) نیوز آف مسلمز ان یورپ۔ ۷ ۔ ۲۔ جنوری ۱۹۸۲ء

(۳) دیانت گزٹ، انقرہ۔ ۱۵۔ جنوری ۱۹۷۹ء

جرمنی

جرمنی کا ملک دوسری عالمی جنگ کے بعد سے دو حصوں میں تقسیم ہے۔ایک مغربی جرمنی، جس کا رقبہ ۹۵ ہزار آٹھ سو مربع میل (۲لاکھ ۴۸ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) چھ کروڑ ۱۶ لاکھ ہے، دوسرے مشرقی جرمنی، جس کا رقبہ ۴۰ ہزار چھ سو مربع میل (ایک لاکھ ۸ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) ایک کروڑ ۶۷ لاکھ ہے۔سابق دارالحکومت برلن بھی دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ہے۔مشرقی برلن، مشرقی جرمنی کا صدر مقام ہے جبکہ مغربی جرمنی کا صدر مقام بون ہے۔ مغربی جرمنی میں جمہوری طرز کی حکومت قائم ہے اور مشرقی جرمنی میں کمیونسٹ پارٹی کا راج ہے۔

جرمنوں کے مسلمانوں کے تعلقات عربوں کے زمانہ سے کسی نہ کسی شکل میں رہے ہیں۔ عثمانی ترکوں کے زمانہ میں یہ تعلق زیادہ قریبی ہوا۔خاص طور پر اٹھارہویں صدی میں جرمن فوج میں ترکوں اور تاتاریوں پر مشتمل دستے بھی ہوتے تھے۔ان کے لیے جرمنی میں مسجدیں بھی بنائی گئیں۔پہلی جنگ عظیم میں زار روس کے تاتاری مسلمان اور برطانوی ہند کے مسلمان جنگی قیدی کئی ہزار کی تعداد میں جرمنی کے کیمپوں میں رہے اور برلن کے نواح میں قیصر ولیم کے حکم سے ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی جو اب تک موجود ہے اور الجامع الاسلامیہ برلن کہلاتی ہے۔

۱۹۲۴ء تک جرمنی میں غیر جرمن مسلمانوں کی تعداد اتنی ہوگئی کہ اس سال شارلوٹن برگ (برلن) میں پہلی جرمن مسلم ایسوسی ایشن قائم ہوئی۔دو سال بعد ۱۹۲۶ء میں برلن میں ولمرس ڈورف (wilmersdore) کی مسجد تعمیر ہوئی۔اس علاقہ میں مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار تھی۔ ان کی کچھ تعداد دوسری عالمی جنگ میں کام آئی اور کچھ نے اسلام ترک کر دیا۔۱۹۴۸ء میں مغربی جرمنی اور برلن میں صرف تین سو اور مشرقی جرمنی میں صرف ایک سو مسلمان رہ گئے تھے۔[1]

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے جرمن نو مسلم رہنما محمد سلیم عبداللہ کا مضمون ''جرمنی میں اسلام کے ڈھائی سو سال'' مطبوعہ ہفت روزہ ''مسلم ورلڈ'' کراچی۔ ۱۴۔اکتوبر ۱۹۸۱ء

دوسری عالمی جنگ کے بعد روس اور مشرقی یورپ کے اشتراکی ملکوں کے مسلمانوں نے ہزاروں کی تعداد میں ہجرت کر کے وفاقی جرمنی میں پناہ حاصل کی، ان کی اکثریت بعد میں جرمنی سے چلی گئی اور امریکہ، کنیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں آباد ہوگئی۔ لیکن ان میں چھ ہزار مسلمان وفاقی جرمنی میں خصوصاً جنوبی حصوں میں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔

مسلمانوں کی تعداد

وفاقی جرمنی میں مسلمانوں کی تعداد میں اصل اضافہ ۱۹۵۰ء کے بعد ہوا ہے۔ جرمنی میں تیز رفتار صنعتی ترقی کی وجہ سے افرادی قوت کی کمی ہوگئی جسے اسپین، اٹلی، ترکی، یوگوسلاویا اور دوسرے ملکوں کے مزدوروں نے پوری کی۔ ان میں مسلمانوں کی بھی بہت بڑی تعداد تھی اس وقت جرمنی میں مسلمانوں کی تعداد پندرہ لاکھ اور سترہ لاکھ کے درمیان بتائی جاتی ہے۔ نومسلم جرمن رہنما محمد سلیم عبداللہ نے جدہ یونیورسٹی کے مسلمان اقلیتوں کے انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ جرنل [1] میں مسلمانوں کی تعداد پندرہ لاکھ لکھی ہے جس کی ملک وار تقسیم اس طرح ہے:

ترک	بارہ لاکھ
یوگوسلاوی	ایک لاکھ بیس ہزار
عرب	ساٹھ ہزار
افریقی اور ایشیائی	تیس ہزار
ایرانی	بیس ہزار
اشتراکی ملکوں کے پناہ گزین	۶۸ ہزار ۸ سو
جرمن مسلمان	ایک ہزار دو سو

مسلمان اگرچہ پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن ان کی اکثریت شمالی رہائن ویسٹ فالیا ریاست کی وفاقی اراضی پر آباد ہے۔ وفاقی دارالحکومت بون کے علاوہ کولون، ڈوزلڈورف، ایسین (essen) ڈورٹمنڈ، آکن (Aachen) اور دوسرے صنعتی شہر اسی ریاست میں ہیں۔

---

(۱) جرنل (جدہ) جلد ۲ شمارہ نمبر ۲، ۱۹۸۰ء اور جلد ۳ شمارہ نمبر ۱، ۱۹۸۱ء کا مشترکہ شمارہ۔

مسلمانوں کا دوسرا بڑا مرکز بویریا کی ریاست ہے جہاں سلیم عبداللہ کے مطابق صرف میونک اور اس کے نواح میں چالیس ہزار مسلمان آباد ہیں۔ برلن میں مسلمانوں کی تعداد ڈیڑھ ہزار بتائی جاتی ہے۔ اب تک صرف ۶½ ہزار مسلمانوں کو جرمن شہریت ملی ہے۔ ان میں اصل جرمن بھی شامل ہیں۔ جن کو شہریت مل گئی ہے ان کو جرمن بولنے والے مسلمان کہا جاتا ہے۔ یعنی انھوں نے جرمن شہریت تو اختیار کر لی ہے لیکن اپنی خصوصی حیثیت کو برقرار رکھا ہے۔ (۱)

وفاقی جرمنی کے ۹۶ فیصد مسلمان سنی ہیں۔ ساٹھ ہزار شیعہ ہیں۔ ان میں انیس ہزار اثنا عشری ہیں اور باقی ترکی کے علوی ہیں۔ (۲)

مساجد

جرمنی میں مسجدوں کی تعداد چار سو ہے۔ عام طور پر لوگوں کے گھروں کے پچھلے صحن پر سائبان ڈال کر یا غلہ گھروں کی شکستہ عمارتوں کو یا متروکہ کارخانوں کی عمارتوں کو مسجد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور ان کا کرایہ ادا کیا جاتا ہے۔ لیکن اب مختلف شہروں میں مینار اور گنبد والی مستقل مسجدیں بھی بڑی تعداد میں بن رہی ہیں۔ برلن میں ایسی دو مسجدیں ہیں جن کا پیچھے ذکر کیا جاچکا ہے۔ ہیمبرگ کی مسجد ۱۹۶۵ء میں، آکن کی ۱۹۶۷ء میں اسٹاڈ ایلن ڈرف (stadt allendorf) کی مسجد کی ۱۹۷۰ء میں اور میونک کی مسجد کی ۱۹۷۳ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ تازہ اطلاعات کے مطابق دسمبر ۱۹۸۰ء میں نیورمبرگ میں جامع ایوب سلطان کی تعمیر مکمل ہوگئی۔ (۳)

جولائی ۱۹۸۱ء میں ڈورٹمنڈ میں چودہویں مسجد کا افتتاح کیا گیا۔ بریمن اور ہینوور میں بھی مسجدیں زیر تعمیر ہیں اور وفاقی دارالحکومت بون میں زیر تعمیر مسجد ۱۹۸۵ء تک مکمل ہو جائے گی۔ (۴)

جرمن قانون کے مطابق سرکاری مدرسوں میں دینی تعلیم دی جاسکتی ہے، لیکن اس کے لیے اساتذہ کا تربیت یافتہ ہونا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے مدرسے قائم کرنے کی کوشش کی

---

(۱) ہفت روزہ ''مسلم ورلڈ'' کراچی۔ ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء

(۲) جرنل (جدہ) جلد ۲ شمارہ نمبر ۲ جلد ۳ شمارہ نمبر ۱ ۱۹۸۱ء

(۳) نیوز آف دی مسلمز ان یورپ۔ ۱۵۔ مارچ ۱۹۸۱ء

(۴) نیوز آف دی مسلمز ان یورپ۔ ۱۵۔ مارچ ۱۹۸۱ء

جارہی ہے، لیکن تربیت یافتہ اساتذہ نہ ہونے کی جہ سے مسلمان اس سہولت سے فی الحال فائدہ نہیں اٹھارہے ہیں۔ ترکوں کی بعض دینی جماعتوں نے قرآنی مدرسے قائم کررکھے ہیں لیکن وہ ضرورت سے بہت کم ہیں۔ ستمبر ۱۹۸۱ء سے میونک میں پہلے جرمن اسلامی اسکول نے کام شروع کردیا ہے جس میں عربی اور جرمن زبان بھی پڑھائی جائے گی۔ [۱]

قرآن کے جرمن زبان میں نو ترجمے موجود ہیں لیکن یہ سب غیر مسلموں کے کیے ہوئے ہیں۔ ایک جرمن نو مسلم ڈاکٹر محمد امان ہوبوم (Hobohm) نے جرمن زبان میں قرآن کا ترجمہ مکمل کرلیا ہے لیکن ۱۹۷۷ء تک وہ شائع نہیں ہوا تھا۔ [۲] مولانا مودودی کے رسالہ دینیات کا ایک نو مسلم جرمن خاتون فاطمہ ہیرین (Heeren) نے جرمن زبان میں کیا ہے جو چھپ گیا ہے۔ ضروری دینی کتابوں کی بھی جرمن زبان میں کمی ہے۔

جرمنی میں مسلمانوں کی کم و بیش چار سو تنظیمیں کام کررہی ہیں لیکن ملک گیر تنظیم کوئی نہیں۔ ایک تنظیم جرمن مسلمانوں کی بھی ہے جس کے صدر عبدالرحمن نیوہوس (Neuhus) ہیں۔ [۳] برلن کے مسلمانوں کی بھی ایک تنظیم ہے۔ یکم دسمبر ۱۹۸۰ء کو بریمن میں جرمنی کے اماموں کی یونین قائم کی گئی ہے تاکہ مساجد کے اماموں کے درمیان رابطہ قائم ہوسکے۔

جرمنی کی گوئٹے یونیورسٹی، فرینکفرٹ میں ایک اسلامی انسٹی ٹیوٹ چار کروڑ مارک سے قائم کیا جارہا ہے۔ یہ رقم کویت، قطر، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بحرین اور الجزائر نے فراہم کی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے محرک ممتاز ترک محقق پروفیسر فواد سیزگن ہیں جن کو احادیث پر تحقیقی کام کرنے پر ۲۸۔ فروری ۱۹۷۹ء کو شاہ فیصل انعام دیا گیا تھا۔ [۴]

جرمنی میں جیسے جیسے مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جرمن عیسائیوں میں ان کے خلاف ردعمل بڑھ رہا ہے اور بعض متعصب افراد اور اخبار مسلمانوں کو نکالنے کا مطالبہ بھی کررہے ہیں۔ [۵]

---

(۱) ہفت روزہ "مسلم ورلڈ" کراچی۔ ۱۹۔ دسمبر ۱۹۸۱ء

(۲) مسلمان اقلیتیں (موتمر عالم اسلام، کراچی ۱۹۷۷ء

(۳) دیانت (انقرہ)۔ ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء

(۴) مسلم ورلڈ کراچی۔ ۲۱۔ مارچ ۱۹۸۱ء

(۵) تفصیل کے لیے دیکھیے محمد سلیم عبداللہ کا مضمون جرمنی کے مسلمانوں پر مطبوعہ جرنل (جدہ) جلد ۲ شمارہ نمبر ۲ (۱۹۸۰ء)

فرانس

فرانس کا رقبہ دو لاکھ گیارہ ہزار مربع میل (۵ لاکھ ۵۱ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۱ء) ۵ کروڑ ۳۸ لاکھ ہے۔ پیرس دارالحکومت ہے۔

مسلمانوں کا فرانس سے پہلا سابقہ اس وقت پڑا جب عرب اندلس کو فتح کرنے کے بعد پہلی صدی ہجری کے آخر میں فرانس میں داخل ہوئے۔ ۷۱۹ء/۱۰۰ھ سے ۸۰۱ء/۱۸۵ھ تک جنوبی اور وسطی فرانس مسلمان چھاپہ ماروں کا نشانہ بنا رہا۔ ۷۳۲ء/۱۱۴ھ میں اگرچہ فرانسیسیوں نے ٹورس کے مقام پر جو پیرس کے جنوب مغرب میں ½۱ سو میل کے فاصلے پر ہے مسلمانوں کو شکست دے دی تھی لیکن وہ دوسری صدی ہجری کے آخر تک مسلمانوں کو فرانس سے بے دخل نہ کر سکے اور جنوب مغربی فرانس کے اس گوشے میں جس کا مرکز اربونہ (فاربون) تھا مسلمان ۷۹۶ء/۱۸۸ھ تک قابض رہے۔ یہی وہی زمانہ ہے جب فرانس کے حکمران شارلمین نے خلیفہ ہارون الرشید سے دوستانہ تعلقات قائم کیے۔

دسویں صدی مسیحی میں ۸۸۹ء سے ۹۷۵ء تک کچھ مسلمان بحری مہم بازوں نے ایک بار پھر فرانس کے جنوب مغربی حصہ کو نیس سے گرینوبل بلکہ اس سے بھی آگے تک اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا تھا۔[1]

یورپ نے مسلمانوں کے خلاف جب صلیبی جنگیں شروع کیں تو ان میں سب سے نمایاں کردار فرانس کا تھا۔[2] پیٹر راہب جس نے صلیبی جنگوں کی آگ بھڑکائی ایک فرانسیسی تھا۔ اسی طرح تیسری صلیبی جنگ میں رچرڈ کا سب سے بڑا مددگار، اسپین میں جب مسلمانوں کی حکومت

(۱) تفصیل کے لیے دیکھیے امیر شکیب ارسلان کی کتاب کا اردو ترجمہ "جنوبی یورپ پر عربوں کے حملے" مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۰۷ء

(۲) دیکھیے لینگر کی انسائیکلو پیڈیا آف ورلڈ ہسٹری۔

ختم ہوگئی اور ۱۶۱۰ء میں مسلمانوں کو ملک سے نکال دیا گیا تو اندرونِ اندلس سے دو لاکھ مسلمانوں نے جنوبی فرانس میں پناہ لی۔ ان میں کچھ اسلامی ملکوں کو ہجرت کر گئے باقی عیسائی بنا لیے گئے۔

مسلمانوں کے علوم کو یورپ میں عام کرنے اور عربی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کرنے کے سلسلے میں بھی فرانس کی خدمات اہم ہیں۔ دسویں صدی عیسوی سے تیرہویں صدی تک جنوبی فرانس عربی کتابوں کے ترجمے کا مرکز بنا رہا۔

سولہویں صدی میں فرانس ترکوں کی سلطنت عثمانیہ کا یورپ میں سب سے بڑا حلیف تھا اور اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں فرانسیسیوں نے میسور کے حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی انگریزوں کے مقابلے میں مدد کی۔ اس کے بعد اگلی صدی میں جب شمالی افریقہ اور مغربی افریقہ کے مسلم ممالک پر فرانس کا قبضہ ہوا تو فرانس کا مسلمانوں اور اسلامی تہذیب سے براہ راست سابقہ پڑا اور فرانس میں اسلامی دنیا سے متعلق وسیع پیمانہ پر تحقیقی کام ہوا جو اب تک جاری ہے۔ انیسویں صدی میں فرانسیسی ادب اور افکار نے ترکوں اور عربوں پر بڑے گہرے اثرات ڈالے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ترکوں اور عربوں کی نشاۃ ثانیہ میں یورپ کی دوسری اقوام کے مقابلے میں فرانس کا سب سے زیادہ اثر پڑا۔

مسلمانوں کی تعداد

فرانس سے مسلمانوں کے اس طویل تعلق کے باوجود عربوں کے ابتدائی دور کے بعد مسلمان کبھی بھی فرانس میں آباد نہیں ہوئے اور نہ فرانس میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ فرانس میں مسلمانوں کی آمد انیسویں صدی کے نصف آخر میں اس وقت شروع ہوئی جب الجزائر اور تونس پر فرانس کا قبضہ ہوا تو وہاں سے بھی مسلمان فرانس پہنچنے لگے۔ لیکن مسلمانوں کی بڑے پیمانے پر آمد دوسری عالمی جنگ کے بعد شروع ہوئی۔ فرانس اب دنیا کی پانچویں بڑی صنعتی طاقت بن چکا تھا اور اسے جرمنی اور دوسرے مغربی ملکوں کی طرح مزدوروں کی ضرورت تھی۔ یہ ضرورت شمالی افریقہ کی فرانسیسی نو آبادیوں کے مسلمانوں نے پوری کر دی۔ مسلمانوں کی آمد کا یہ سلسلہ کم و بیش اب تک جاری ہے۔ اس وقت فرانس کی ۹۵ فیصد آبادی عیسائی ہے جن میں نوے فیصد رومن کیتھولک عقاید کے پیرو ہیں۔ یہودیوں کی تعداد ساڑھے چھ لاکھ ہے۔ مسلمانوں کی تعداد بیس اور تیس لاکھ کے

درمیان ہے۔ ۱۹۷۱ء میں صرف الجزائری مسلمانوں کی تعداد سات لاکھ تھی۔[1] مسلمانوں میں سب سے زیادہ تعداد الجزائر کے باشندوں کی ہے، اس کے بعد مراکش کے اور پھر تونس کے مسلمانوں کی باری آتی ہے۔ مغربی افریقہ کی سابق فرانسیسی نو آبادیوں کے مسلمان بھی آباد ہیں اور ایشیا کے مسلمان بھی۔ یوگوسلاوی مزدوروں میں بھی بیس فیصد مسلمان ہیں۔ ترکی سے بھی کارکن ٹھیکہ پر آتے ہیں اور ٹھیکہ ختم ہونے پر واپس چلے جاتے ہیں۔ اسلامی ملکوں کے طلبہ کی تعداد بھی کئی ہزار ہے۔

مساجد اور تعلیم

فرانس میں پہلی مسجد انیسویں صدی میں ورسائی کے مقام پر تعمیر کی گئی تھی تاکہ فرانس میں مقیم ترک سفیر اور اس کا عملہ اس میں نماز پڑھ سکے۔ لیکن اب اس کا کوئی وجود نہیں۔ ۱۹۲۴ء میں پیرس میں پہلی مسجد تعمیر ہوئی یہ بھی حکومت فرانس کی مدد سے تعمیر کی گئی ہے اور فرانس کی سب سے بڑی اور شاندار مسجد ہے۔ یہ وہی مسجد ہے جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے:

یہ بت کدہ انہیں غارت گروں کی ہے تعمیر
دمشق ہاتھ سے جن کے ہوا ہے ویرانہ

موتمر عالم اسلامی کی اطلاع کے مطابق پورے ملک میں دو سو مسجدیں ہیں جن میں اسی (۸۰) پیرس اور اس کے مضافات میں ہیں۔ لیکن ان کی بڑی تعداد نجی عمارتوں کی ہے یا ایسے کمروں کی جو نماز کے لیے مخصوص کر دیئے گئے ہیں۔ ابھی حال ہی میں سعودی عرب نے فرانس میں انیس مسجدوں کی تعمیر کے لیے پندرہ لاکھ فرانک دیئے ہیں۔[2] اس کے علاوہ رابطہ عالم اسلامی نے تین سو مسجدوں کی مرمت، تجدید اور دیکھ بھال کے لیے تیس لاکھ فرانک دیئے ہیں۔[3]

فرانس میں بھی یورپ کے دوسرے حصوں کی طرح اسلامی شخصی قانون نافذ نہیں۔ لیکن

---

(۱) جدہ یونیورسٹی کے مسلمان اقلیتوں کے انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ جرنل موسم گرما ۱۹۸۱ء میں ایس۔ ایم فخر الدین کا جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں مسلمانوں کی تعداد بیس لاکھ بتائی گئی ہے۔ یہی تعداد مسیحی مسلمان تعلقات کے ادارے نے دی ہے، لیکن ترکی کے محکمہ مذہبی امور کے اخبار دیانت گزٹ، انقرہ۔ یکم مئی ۱۹۷۹ء میں مسلمانوں کی تعداد انیس لاکھ اور موتمر اسلامی کے کتابچہ میں تیس لاکھ بتائی گئی ہے۔

(۲) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ) اگست ۱۹۸۱ء

(۳) ایضاً۔ فروری ۱۹۸۲ء

مذہبی آزادی ہے کہ لوگوں کی ایک تعداد ہر سال حج کو جاتی ہے۔ دینی تعلیم کا نظام ناقص اور غیر اطمینان بخش ہے۔ پیرس کی جامع مسجد میں بنیادی اسلامی تعلیم کا انتظام ہے لیکن اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ بعض اسلامی اداروں نے بچوں کی تعلیم کا انتظام کیا ہے۔

قرآن اور اس کے فرانسیسی ترجمے آسانی سے دستیاب ہیں۔ فرانسیسی زبان میں تقریباً ۳۶ مختلف ترجمے موجود ہیں، لیکن یہ تقریباً سب غیر مسلموں کے ہیں۔ فرانسیسی میں قرآن کا سب سے مستند اور مقبول ترجمہ ڈاکٹر حمید اللہ کا ہے جو تیس سال سے پیرس میں مقیم ہیں۔ ۱۹۷۹ء تک اس کے دس ایڈیشن نکل چکے تھے۔ مولانا مودودی کے رسالہ دینیات کا بھی فرانسیسی میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ اس رسالہ کے متعلق ڈاکٹر حمید اللہ نے کہا ہے کہ ''فرانسیسی زبان میں تبلیغ اسلام کے لیے ہم مدت سے اچھی کتاب کی کمی محسوس کر رہے تھے۔ یہ کمی رسالہ دینیات نے پوری کر دی۔ دینیات کے فرانسیسی ترجمہ سے غیر مسلموں میں دعوت دین کے بہت سے راستے نکل رہے ہیں۔ (۱)

فرانس میں مسلمانوں کی کئی تنظیمیں ہیں لیکن ان کی کارکردگی کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکی۔ پیرس میں رابطۂ عالم اسلامی کا بھی ایک دفتر ہے۔ یہ دفتر اسلامی کتابوں کو فرانسیسی زبان میں ترجمہ کرانے اور ان کو شائع کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ (۲)

خالص فرانسیسی باشندوں میں بھی اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے۔ موتمر عالم اسلامی کے کتابچہ کے مطابق فرانسیسی مسلمانوں کی تعداد پچیس ہزار ہے۔ (۳)

ان میں کئی دانشور ہیں۔ فرانسیسی نومسلموں میں سب سے ممتاز نام شیخ عبدالواحد یحیی (۱۸۸۶ء تا ۱۹۵۱ء) کا ہے جن کا فرانسیسی نام رینے گینوں (Rene Guenon) تھا۔ فرانسیسی مسلمان اسلامی احکام پر پوری طرح عمل کرتے ہیں۔ سور کے گوشت اور شراب سے بالکل پرہیز کرتے ہیں۔ یہ عام طور پر درمیانی یا نچلے درمیانی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بیشتر کالج کے تعلیم یافتہ ہیں۔ پیرس میں ان کے ایک رہنما فرانسیسی پارلیمنٹ کے اسپیکر بھی رہ چکے ہیں۔ پیرس میں یہ لوگ بہت سرگرم ہیں۔ (۴)

---

(۱) ہفت روزہ ''ایشیا'' لاہور۔ ۱۴۔ اپریل ۱۹۷۶ء

(۲) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ)۔ اگست ۱۹۸۱ء

(۳) ایس۔ ایم۔ فخر الدین نے فرانسیسی مسلمانوں کی تعداد آٹھ ہزار لکھی ہے۔

(۴) جدہ یونیورسٹی کے مسلمان اقلیتوں کے انسٹی ٹیوٹ کا جرنل اشاعت موسم گرما ۱۹۸۱ء مضمون ایس۔ ایم فخر الدین

برطانیہ

برطانیہ کا رقبہ ۹۴ ہزار مربع میل (دو لاکھ ۴۲ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۱ء) ۵ کروڑ ۵۸ لاکھ ہے۔ انگلستان، ویلز، اسکاٹ لینڈ اور شمالی آئر لینڈ پر مشتمل ہے۔ برطانیہ کے علاوہ متحدہ بادشاہت (united kingdom) بھی کہا جاتا ہے۔ لندن دار الحکومت ہے۔

اسلامی دنیا سے انگلستان کا پہلا قابل ذکر تعلق تیسری صلیبی جنگ (۱۱۸۹ء تا ۱۱۹۲ء) کے زمانہ میں ہوا، جب شاہ انگلستان رچرڈ اول شیر دل، سلطان صلاح الدین ایوبی سے بیت المقدس کو واپس لینے کے لیے فلسطین آیا تھا۔ اسی زمانہ کا دوسرا اہم واقع یہ ہے کہ رچرڈ کے بعد جب اس کا بھائی 'جان' (John) تخت پر بیٹھا تو اس نے پاپائے رومہ کے دباؤ سے نجات حاصل کرنے کے لیے خلافت موحدین کے حکمران محمد الناصر سے فوجی امداد طلب کی تھی اور درخواست میں یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو سلطان مراکش کو خراج بھی دے گا اور اسلام بھی قبول کر لے گا۔ یہ وہی 'جان' ہے جس نے ۱۲۱۵ء میں مشہور میگنا کارٹا پر دستخط کیے تھے۔ لیکن محمد الناصر چونکہ ایک سال پہلے العقاب کی جنگ میں اندلس میں عیسائیوں سے شکست کھا چکا تھا اس لیے 'شاہ جان' کی مدد نہیں کر سکا۔

برطانیہ کا عروج سولہویں صدی میں اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب انگریزوں نے مشرقی ملکوں کے ساتھ بحری تجارت کو فروغ دینا شروع کیا۔ ان کے نمائندے ترکوں کی عثمانی سلطنت میں بھی گئے اور ہندوستان کی تیموری سلطنت میں بھی۔ اگلی دو صدیوں میں برطانیہ نے مراکش سے انڈونیشیا تک پوری اسلامی دنیا سے تجارتی تعلقات قائم کر لیے۔ جلد ہی ان تجارتی تعلقات نے سیاسی رنگ اختیار کرنا شروع کر لیا اور انگریزوں کی تجارتی کوٹھیوں نے قلعوں کی شکل اختیار کر لی۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں انگریزوں نے جن ملکوں کو فتح کیا ان میں بیشتر یا تو

اسلامی ملک تھے یا وہاں مسلمانوں کی حکومتیں قائم تھیں یعنی ملایا، ہندوستان، مصر، عدن، مشرقی افریقہ، سوڈان اور نائیجیریا۔ اس طرح برطانوی سلطنت ایک ایسی سلطنت بن گئی جس میں دنیا میں سب سے زیادہ مسلمان آباد تھے۔ چنانچہ انگریزی زبان میں اسلام اور اسلامی دنیا سے متعلق جس قدر تحقیقی کام کیا گیا ہے اس کی مثال فرانسیسی زبان کے علاوہ کسی مغربی زبان میں نہیں ملے گی۔

مسلمانوں کی تعداد

برطانیہ میں مسلمانوں کی تعداد سات لاکھ سے دس لاکھ تک بیان کی جاتی ہے۔ سات لاکھ کی تعداد، اسلامک فاؤنڈیشن، لسٹر (انگلستان) کے محمد معشوق علی نے ایک مقالہ میں بتائی ہے جو انھوں نے لندن میں ۲۴۔۲۸، جولائی ۱۹۷۸ء کو ہونے والے ایک بین الاقوامی سیمینار میں پڑھا تھا۔ مسیحی مسلمان تعلقات کے ادارے نے یہ تعداد آٹھ لاکھ بتائی ہے۔[1] جب کہ دیانت گزٹ، انقرہ اور جرنل (جدہ) میں یہ تعداد دس لاکھ بیان کی گئی ہے۔[2] اردو ڈائجسٹ، لاہور کے مدیر الطاف حسین قریشی نے دورہ برطانیہ کے بعد اپنے ایک مضمون میں بھی مسلمانوں کی تعداد دس لاکھ بتائی ہے۔[3]

مسلمانوں کی اکثریت ان ملکوں سے آئی ہے جو دولت مشترکہ میں شامل ہیں یا کبھی شامل تھے۔ ان میں سب سے بڑی تعداد پاکستانی مسلمانوں کی ہے۔ ان کے علاوہ بنگلہ دیش، ہندوستان، قبرص، عرب ممالک اور افریقہ کے ان حصوں کے مسلمان بھی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں جو کبھی سلطنت برطانیہ کا ایک حصہ تھے۔ برطانوی نژاد مسلمان بھی ہیں اور ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اسلامی مرکز، ریجنٹ پارک مسجد (لندن) کے ڈاکٹر علی غامدی کا بیان ہے کہ ۱۹۷۴ء سے اب تک چار ہزار برطانوی باشندے اسلام قبول کر چکے ہیں۔[4]

برطانیہ میں پاکستانیوں کی تعداد چار سے ۶ لاکھ تک بیان کی جاتی ہے[5] اور وہ مسلمانوں

---

(۱) نیوز آف مسلمز ان یورپ (لندن)۔ ۷۔۲۔ جنوری ۱۹۸۲ء

(۲) دیانت گزٹ، انقرہ۔ یکم مئی ۱۹۷۹ء اور جرنل (جدہ) موسم سرما ۱۹۸۰ء اور موسم گرما ۱۹۸۱ء

(۳) اردو ڈائجسٹ لاہور۔ فروری ۱۹۸۲ء

(۴) روزنامہ ''جنگ'' کراچی۔ ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۸۲ء

(۵) چھ لاکھ کی تعداد الطاف حسین قریشی نے اردو ڈائجسٹ فروری ۱۹۸۲ء میں لکھی ہے۔

میں سب سے بڑا گروہ ہیں۔

معشوق علی کی تحقیق کے مطابق برطانیہ میں اولین مسلمان آباد کار انیسویں صدی کے وسط میں آئے تھے اور کارڈف، لیور پول، ٹائنے سائڈ (tyneside) اور لندن کی بندرگاہوں میں رہائش اختیار کی۔ یہ لوگ برطانوی جہازوں میں ملازم تھے اور ان کا تعلق عدن، یمن، بنگال، گجرات (ہندوستان) پنجاب اور سندھ سے تھا۔ اسی زمانہ میں طلبہ اور پیشہ ور لوگوں کی ایک تعداد بھی برطانیہ آئی پہلی اور دوسری عالمی جنگ کی درمیانی مدت میں مسلمان آباد کاروں کی آمد میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جو پاکستان نہیں جا سکی اپنے تحفظ کے لیے انگلستان چلی گئی جہاں ان کے عزیز موجود تھے۔ اسی طرح ۱۹۵۰ء کے بعد قبرص میں یونانی ترک کشمکش کے نتیجے میں قبرصی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد برطانیہ آ گئی۔ اسی زمانہ میں جزائر غرب الہند اور گیانا سے بھی مسلمان انگلستان آئے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد جب مشرقی افریقہ کے ممالک جو برطانیہ کے تحت تھے، آزاد ہوئے تو ان میں آباد ہندوستانی اور پاکستانی مسلمان نئی پابندیوں کی وجہ سے برطانیہ چلے گئے۔ ۱۹۶۱ء اور ۱۹۶۲ء کے درمیان نائیجیریا کے مسلمان بھی برطانیہ میں آباد ہوئے، جو زیادہ تر طلبہ تھے۔ ۱۹۶۲ء میں جب دولت مشترکہ کے ملکوں سے آنے والے آباد کاروں سے متعلق قانون منظور ہوا تو آمد پر پابندی لگنے کے ڈر سے ۱۹۶۲ء سے پہلے اور بعد میں لوگ کثرت سے برطانیہ پہنچے۔ ان میں اکثریت پاکستان سے آنے والوں کی تھی۔"

برطانیہ میں آباد مسلمانوں کی اسی فیصد تعداد سات علاقوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ پاکستانی مسلمان تقریباً ہر حصے میں موجود ہیں۔ ان کی تیس فیصد تعداد جنوب مشرقی انگلستان میں آباد ہے اور باقی آبادی کی اکثریت ویسٹ مڈلینڈ، یورک شائر، ہیمبر سائڈ اور شمال مغرب میں آباد ہے۔ اس کے برخلاف جزائر غرب الہند کے مسلمان، افریقی مسلمان اور قبرصی ترک زیادہ تر جنوب مشرقی حصے میں آباد ہیں۔ لندن میں مسلمانوں کی تعداد چار لاکھ [1] ہے جبکہ گلاسگو میں ان کی تعداد

(1) جنگ، کراچی۔ ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۸۲ء

دس ہزار ہے[1] شمالی انگلستان کے شہر بریڈ فورڈ میں ۴۲ ہزار مسلمان ہیں جن میں تیس ہزار پاکستانی ہیں۔[2]

مسجدیں اور تعلیم

برطانیہ میں مسجدوں کی تعداد میں بڑا اختلاف ہے۔ موتمر عالم اسلامی، کراچی نے ۱۹۷۷ء میں مسجدوں کی تعداد دو سو بتائی تھی۔ محمد انور نے جرنل (جدہ)[3] میں مسجدوں کی تعداد تین سو لکھی ہے۔ لیکن معشوق علی نے مسجدوں کی تعداد ایک ہزار بتائی ہے۔ اور وضاحت کی ہے کہ ان کی دو تہائی تعداد ۱۹۶۲ء کے بعد اس وقت وجود میں آئی جب پاکستان سے لوگ بڑی تعداد میں انگلستان پہنچے۔ ان کی بڑی تعداد نجی مکانوں میں ہے جنھیں مسلمانوں نے خرید لیا ہے۔ بیشتر مسجدوں میں کل وقتی امام اور عملہ موجود ہے۔ بڑی اور مستقل گنبد اور مینار والی مسجدیں بھی کافی تعداد میں ہیں۔ اس قسم کی پہلی مسجد ۱۸۹۰ء میں ووکنگ (سرے) میں تعمیر ہوئی اور بھوپال کی شاہ جہاں بیگم نے چونکہ اس کی تعمیر کے اخراجات برداشت کیے تھے اس لیے شاہ جہاں مسجد کہلاتی ہے۔ معشوق علی کے مطابق ۱۹۷۰ء سے اب تک برطانیہ میں ۲۴ کے قریب جامع مسجدیں تعمیر ہو چکی ہیں۔ برطانیہ کی تمام مسجدوں میں ریجنٹ پارک، لندن کی مسجد سب سے بڑی اور شاندار ہے۔ یہ سہ منزلہ عمارت ہے جس میں اسلامی مرکز بھی قائم ہے۔ مرکز اور مسجد کی تعمیر پر ایک کروڑ ڈالر خرچ ہوئے۔[4] گلاسگو، برمنگھم، وہائٹ چیپل اور دوسرے مقامات پر کئی شاندار مسجدیں زیر تعمیر ہیں۔

اب سے چند سال پہلے تک مسلمان بچوں کے لیے دینی تعلیم کا انتظام مسجدوں تک محدود تھا۔ لیکن اب مسلم ایجوکیشن ٹرسٹ کی کوششوں سے حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم کر لیا ہے کہ جن تعلیمی اداروں میں مسلمان بچے پڑھتے ہیں وہاں مسلمان بچوں کو اسلامی تعلیم دینے کا انتظام کیا جائے۔

---

(۱) اردو ڈائجسٹ، لاہور۔ فروری ۱۹۸۲ء

(۲) ہفت روزہ، مسلم ورلڈ۔ کراچی۔ ۷۔ مئی ۱۹۸۳ء

(۳) جرنل (جدہ یونیورسٹی، مسلمان اقلیتوں کا انسٹی ٹیوٹ) موسم سرما ۱۹۸۰ء وموسم گرما ۱۹۸۱ء

(۴) جنگ کراچی۔ ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۸۲ء

اس مقصد کے لیے ٹرسٹ نے نصاب بھی تیار کیا ہے اور اس کے مطابق کتابیں بھی لکھوائی جارہی ہیں۔ ٹرسٹ کے تحت مسلمان اساتذہ بچوں کو اسکول کے اوقات کے بعد دینی تعلیم دیتے ہیں۔

برطانیہ میں قرآن اور اس کے انگریزی ترجمے آسانی سے مل جاتے ہیں۔ ان ترجموں میں ممتاز انگریز نومسلم محمد مارماڈیوک پکتھال کا ترجمہ مستند سمجھا جاتا ہے۔ عبداللہ یوسف علی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے ترجمے بھی مل جاتے ہیں۔ دینی کتب بھی آسانی سے مل جاتی ہیں اور برطانیہ کے مختلف اسلامی ادارے کتابیں شائع بھی کررہے ہیں اور پاکستان اور اسلامی ممالک سے بغیر کسی رکاوٹ کے درآمد بھی کرتے ہیں۔

برطانیہ کے مسلمان کئی اخبار اور رسالے بھی شائع کرتے ہیں۔ ان میں ایک اردو روزنامہ ''جنگ'' ہے۔ دوسرا انگریزی کا پندرہ روزہ امپیکٹ (impact) ہے جسے ایک پاکستانی حاشر فاروق شائع کرتے ہیں۔ انگریزی کا ایک معیاری ماہنامہ (arabia) سعودی عرب کے ایک صحافی صلاح الدین شائع کرتے ہیں۔ ۲۲۔ نومبر ۱۹۸۱ء کو لندن میں مطالعہ پاکستان کے مرکز کا افتتاح کیا گیا۔ اس مرکز سے بھی ایک سہ ماہی انگریزی رسالہ ''پاکستان اسٹڈیز'' شائع کیا جاتا ہے۔

برطانیہ میں مسلمانوں کے کئی فعال ادارے اور تنظیمیں موجود ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) یو کے اسلامک مشن۔ ۱۹۶۲ء سے اسلامی افکار کو عام کرنے اور اسلامی مطبوعات فراہم کرنے کا کام کررہا ہے (۲) طلبہ کی اسلامی مجالس کی فیڈریشن جو ۱۹۶۲ء سے کام کررہی ہے۔ (۳) مسلمان تنظیموں کی یونین UMO جو ۱۹۷۰ء میں قائم کی گئی تھی (۴) اسلامک فاونڈیشن۔ ۱۹۷۳ء سے اسلامی کتب کی فراہمی اور اشاعت کے سلسلے میں مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔

ان کے علاوہ اسلامی کونسل برائے یورپ بھی ایک اہم ادارہ ہے جس کے سربراہ ایک مصری دانشور سائم عزام ہیں۔ اس کا دائرہ پورے یورپ تک پھیلا ہوا ہے۔

اسپین

اسپین کا رقبہ ۴ لاکھ ۹۲ ہزار مربع کلومیٹر اور آبادی (۱۹۸۰ء) ۳ کروڑ ۷۴ لاکھ ہے۔ میڈرڈ دارالحکومت ہے۔

اسپین میں مسلمان ۷۱۱ء/۹۲ھ میں داخل ہوئے اور ۱۴۹۲ء/۸۹۸ھ میں ان کا اقتدار ختم ہوگیا۔ آٹھ سو سال کی اس مدت میں اسپین علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کے لحاظ سے دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں آگیا تھا۔ آٹھ سو سال کا یہ زمانہ باقی یورپ کی تاریخ میں تاریک دور کہلاتا ہے، لیکن پورے یورپ میں صرف اندلس ہی تھا جہاں علم وفن کی شمع روشن تھی۔ گیارہویں صدی سے تیرہویں صدی تک یورپ والوں نے طلیطلہ کے شہر میں وسیع پیمانے پر عربی کتابوں کے یوروپی زبانوں میں جو ترجمے کیے، ان ہی کی وجہ سے یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار ہوئی۔ علم وفن میں جو عظیم شخصیتیں اندلس میں پیدا ہوئیں ان میں ابن حزم، ابن طفیل، ابن زہر، ابن رشد، زہراوی اور ابن عربی کے نام سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ مسلمانوں کے فن تعمیر کے شاہکار اگرچہ برباد ہوچکے ہیں لیکن ان کے کچھ نمونے آج بھی جامع قرطبہ، اشبیلہ کی مسجد کے مینار "جیرالڈا" اور غرناطہ کے قصر الحمراء کی شکل میں دیکھے جاسکتے ہیں۔[1]

مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ دور میں اسپین کے اس جنوب مشرقی علاقے میں جو ساحل بحیرۂ روم کے ساتھ ساتھ واقع ہے مسلمانوں کی اکثریت ہوگئی تھی۔ اگرچہ ان مسلمانوں کی اکثریت عرب اور بربر نسل سے تعلق رکھتی تھی لیکن ان میں ایک خاصی تعداد اسپین کے قدیم باشندوں کی بھی تھی جنھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ اس علاقے سے باہر بھی سرقسطہ تک ہر شہر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ لیکن جب مسلمانوں کا اقتدار ختم ہوگیا تو اسپین کے متعصب عیسائی حکمرانوں نے یا تو

(۱) اندلس کے اسلامی دور کی تاریخ کے لئے دیکھئے ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ حصہ اول باب نمبر ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱

مسلمانوں کو ملک سے نکال باہر کیا، یا ان کا قتل عام کیا یا پھر ان کو زبردستی عیسائی بنالیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سترہویں صدی کے آغاز سے موجودہ صدی کے وسط تک اسپین میں اسلام کا نام لینے والا کوئی نہیں تھا اور جامع قرطبہ سمیت تمام دوسری بڑی مساجد کو کلیساؤں میں تبدیل کردیا گیا تھا۔

لیکن آج مسلمانوں کے اخراج کے ساڑھے تین سو سال بعد اسپین میں پھر اذانوں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوگئی ہیں۔ اگرچہ اس وقت اسپین میں آباد مسلمانوں کی اکثریت عرب ملکوں کے طلبہ اور مزدوروں پر مشتمل ہے لیکن خود اسپین کے اصلی باشندوں کی ایک بڑی تعداد تیزی سے اسلام میں داخل ہورہی ہے اور ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کے اجداد کو زبردستی عیسائی بنا لیا گیا تھا لیکن دل میں انھوں نے اور ان کی اولاد نے ایمان کی شمع روشن رکھی اور اب جب کہ آزادی افکار اور آزادی ضمیر کے تصور کے تحت مسیحی کی زنجیریں سرکاری سطح پر کوٹی جاچکی ہیں یہ لوگ اپنے ایمان کی تجدید کررہے ہیں۔

اسپین میں مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں تخمینے مختلف ہیں۔ مسیحی مسلم تعلقات کے ادارے کے مطابق مسلمانوں کی تعداد پندرہ ہزار ہے۔[1] ترکی پرچے دیانت گزٹ انقرہ کے مطابق یہ تعداد ۲۵ ہزار ہے۔[2] کراچی کے ہفت روزہ یقین انٹرنیشنل نے لکھا ہے کہ صرف صوبہ قطلونیہ (catalonia) میں سرکاری اندازے کے مطابق پندرہ ہزار اور غیر سرکاری تخمینہ کے مطابق اسی (۸۰) ہزار مسلمان ہیں۔[3] اخوان المسلمون کے مجلہ ''المسلمون'' جدہ کے مطابق مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار ہے۔[4]

مسلمان سب سے زیادہ صوبہ قطلونیہ اور اس کے صدر مقام برشلونا (بارسلونا) میں آباد ہیں۔ ان کی بیشتر تعداد شمالی افریقہ خصوصاً ریف کے مزدوروں پر مشتمل ہے جو اس صدی کے نصف اول میں اسپین کے پاس تھا۔ قطلونیہ کے بعد مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد غرناطہ، اشبیلیہ اور مالقہ میں آباد ہے۔ صرف ان مسلمان طلبہ کی تعداد جو اسپین میں تعلیم حاصل کررہے ہیں

---

(۱) نیوز آف مسلمز ان یورپ۔ ۲۷، جنوری ۱۹۸۲ء

(۲) دیانت گزٹ، انقرہ۔ یکم مئی ۱۹۷۹ء

(۳) یقین انٹرنیشنل، کراچی۔ ۷، فوری ۱۹۸۲ء

(۴) روزنامہ ''جسارت'' کراچی۔ ۲۸، نومبر ۱۹۸۲ء بحوالہ مسلمون جدہ

ایک اندازے کے مطابق پانچ [۱] ہزار دوسرے اندازے کے مطابق آٹھ ہزار ہے۔ [۲]

اسپین میں اسلام کی اشاعت اور فروغ میں سب سے زیادہ حصہ ان عرب طلبہ کا ہے جو بڑی تعداد میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسپین گئے ہوئے ہیں۔ ان ہی طلبہ میں سے ایک نوجوان رامزا تاسی اور ان کے ساتھیوں نے ۱۹۶۶ء میں غرناطہ میں پہلا اسلامی مرکز قائم کیا۔ [۳] لیکن ان طلبہ میں سب سے اہم نام ایک شامی طالب علم نزار صباغ شہید (۱۹۴۱ء تا ۱۹۸۱ء) کا ہے۔ وہ قاہرہ یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی سند لینے کے بعد ۱۹۶۷ء میں مزید تعلیم کے لیے غرناطہ چلے گئے اور جب انھوں نے وہاں اسلام کے لیے حالات سازگار دیکھے تو خود کو تبلیغ اسلام کے لیے وقف کر دیا۔ نزار صباغ شہید کے آنے کے بعد شامی طلبہ کی اسلامی سرگرمیاں تیز ہو گئیں اور ان سب نے مل کر چند سالوں کے اندر اسپین کے گیارہ شہروں میں تیرہ اسلامی مراکز قائم کر دیئے۔ اس کے بعد نزار صباغ نے حکومت سے اجازت لینے کے بعد ۱۹۷۱ء میں ایک اسلامی جمعیت (اسلامک ایسوسی ایشن آف سپین) قائم کی۔ اس جمعیت کے قیام کے بعد دینی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے قانونی اجازت مل گئی اور اب جمعیت مسجدیں بھی قائم کر سکتی ہے۔ نزار صباغ شہید کی تحریک کا مرکز شہر بارسلونا تھا۔ یہیں جب کہ وہ اپنے دفتر میں داخل ہو رہے تھے کہ شام کی بعثی حکومت کے کارندوں نے ۲۲۔ نومبر ۱۹۸۱ء کو انھیں گولی مار کر شہید کر دیا۔ [۴]

روزنامہ جسارت، کراچی مورخہ ۳۰۔ اپریل ۱۹۸۲ء میں سندھ ٹریڈنگ ایجنسی کراچی کے چیف ایگزیکٹو جناب شفیق احمد واسطی کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے اپنے دورۂ اسپین کے مشاہدات کا تذکرہ کرتے ہوئے اسلام کی اشاعت سے متعلق بعض دلچسپ معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے تبلیغ اسلام کے سلسلے میں دو اسپینی نومسلموں امیر منصور اور احمد عبداللہ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ امیر منصور غرناطہ کے علاقے میں اسلامی سرگرمیوں کے نگران ہیں۔ یہاں جو اسلامی مرکز قائم ہے اس میں نماز کے علاوہ اسلامی تعلیم کا بھی انتظام ہے اور نو

---

(۱) یقین انٹرنیشنل، کراچی۔ ۷۔ فروری ۱۹۸۲ء

(۲) جسارت کراچی۔ ۲۸، نومبر ۱۹۸۲ء

(۳) ہفت روزہ "ایشیا" لاہور۔ ۳، جنوری ۱۹۸۲ء

(۴) ایضاً مضمون "نزار صباغ شہید" مضمون میں اسلامی جمعیت کے اغراض و مقاصد بھی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔

مسلموں کو ہر قسم کی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں۔ امیر منصور نے اسلامی مرکز کے ساتھ مختلف چھوٹی مصنوعات کا ایک کمپلیکس بھی قائم کیا ہے۔ گھر اور روزگار سے محروم ہو جانے والے نومسلم یہاں اپنے ہاتھوں سے مصنوعات تیار کر کے اخراجات پورے کرتے ہیں۔

احمد عبداللہ کے بارے میں واسطی صاحب نے لکھا ہے کہ ان کا ہسپانوی نام (Alvero Machordom comins) تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد نام بدل کر احمد عبداللہ کر دیا۔ وہ اسپین کی فوج کے سابق میجر ہیں اور بڑے سرگرم مبلغ ہیں اور اسلامی جمعیت سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے قرآن کا ہسپانوی زبان میں ترجمہ بھی کیا ہے۔[1]

واسطی صاحب نے آزاد کشمیر کے ایک پاکستانی نوجوان صوفی شان محمد کی تبلیغی کوششوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ قرطبہ میں رہتے ہیں۔ معمولی تعلیم یافتہ ہیں اور چھوٹا موٹا کاروبار کرتے ہیں۔ ان کی کوششوں سے قرطبہ کے پلازا کولون کی ایک مسجد جو ۱۹۴۰ء سے بند تھی اپریل ۱۹۸۱ء میں کھول دی گئی ہے۔ یہ مسجد اسپینی فوج کے مراکشی سپاہیوں کے لیے ۱۹۳۹ء میں تعمیر کی گئی تھی۔

واسطی صاحب کے بیان کے مطابق قرطبہ میں کل ایک سو بارہ مسلمان ہیں۔ ان میں دو تین گھرانے ایسے بھی ہیں جن کے اجداد پہلے مسلمان تھے۔ اشبیلیہ میں مسلمانوں کی تعداد صرف بارہ ہے اور یہ سب نومسلم ہیں۔ مالقہ میں نومسلم مسلمانوں کی تعداد ایک سو ہے۔ سب سے زیادہ مسلمان غرناطہ میں ہیں۔ مارچ ۱۹۸۲ء تک ان کی تعداد تین ہزار تھی۔ ان میں ایک ہزار وہ ہیں جن کے اجداد مسلمان تھے اور دو ہزار وہ ہیں جنھوں نے گزشتہ دو سالوں میں اسلام قبول کیا۔ غرناطہ میں ایک مسجد بھی زیر تعمیر ہے۔

۱۹۸۰ء کے بعد سے جامع قرطبہ میں جو اب کلیسا ہے تھوڑی سی جگہ نماز کے لیے مخصوص کر دی گئی ہے جہاں پچاس ہزار افراد کے لیے نماز پڑھنے کی گنجائش ہے۔

اندلس کی اسلامی جمعیت العروۃ الوثقیٰ کے نام سے عربی میں اور الاسلام کے نام سے

---

(۱) محمد سمیع اللہ نے لکھا ہے کہ اس ہسپانوی ترجمہ کی پہلی جلد سورۂ آل عمران تک بغیر عربی متن کے شائع ہوگئی ہے۔ لیکن مترجم کی عربی زبان اور قرآن کو سمجھنے کی اہلیت سطحی اور واجبی سی ہے۔ اس خلا کو پُر کرنے کے لیے غرناطہ کی مسلم جماعت نے ایک چار رکنی کمیٹی کو قرآن کا ہسپانوی میں ترجمہ کرنے کا کام سونپا ہے۔ یہ ترجمہ مع عربی متن کے شائع ہوگا۔ اس کام کے نگران امام محمد دیل پوزوال اندلسی ہیں۔ کمیٹی نے اب تک نصف قرآن کا ترجمہ کر لیا ہے۔ ترجمہ پر نظر ثانی کے لیے فاس (مراکش) کی جامع قرویین سے رابطہ ہے۔ (اردو ڈائجسٹ، لاہور۔ اگست ۱۹۸۱ء)

ہسپانوی زبان ایک رسالہ بھی شائع کرتی ہے۔اس کے علاوہ جمعیت کی طرف سے ہسپانوی زبان میں اسلامی کتب کا ترجمہ بھی کیا جا رہا ہے۔مولانا مودودی کے رسالہ دینیات کا ہسپانوی ترجمہ ۱۹۷۴ء میں ہو گیا تھا۔نزار صباغ شہید کے الفاظ میں ہسپانوی زبان میں اسلام کا صحیح اور جامع اور اثر انگیز تعارف کرانے والی پہلی کتاب رسالہ دینیات ہے۔[1]

---

(۱) ہفت روزہ ''ایشیا'' لاہور۔۳۔جنوری ۱۹۸۲ء

پرتگال

عربوں کے دَورِ عروج میں پرتگال اسلامی اندلس کا ایک حصہ تھا۔ دارالحکومت لزبن کو عرب لسبونہ اور اشبونہ کہتے تھے اور یہ شہر ۷۱۴ء/۹۵ھ سے ۱۱۴۷ء/۵۴۲ھ تک اندلس کے مسلمانوں کے پاس رہا۔ پورتو، ملک کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے جسے مسلمان برتقال کہتے تھے۔ یہ بندرگاہ بھی ۷۱۴ء/۹۵ھ سے ۱۰۹۲ء/۴۸۵ھ تک مسلمانوں کے پاس رہی۔ پرتگال کے جنوبی حصہ پر مسلمانوں کا اقتدار زیادہ عرصہ رہا۔ اور یہ حصہ ساتویں صدی ہجری کے نصف اول میں مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا۔ مسلمانوں کے زوال کے بعد اسپین کی طرح یہاں سے بھی مسلمان نکال دیئے گئے یا جبراً عیسائی بنا لیے گئے۔ لزبن کی جامع مسجد کو ۱۱۵۰ء/۵۴۵ھ میں کلیسا بنالیا گیا۔ اسلامی دَور میں پرتگال کے شہر بھی علم وادب کے مرکز بن گئے تھے۔ لزبن کے علماء میں ابواسحاق ابراہیم مصمودی متوفی ۳۶۰ھ جوزاہد اشبونی کے نام سے مشہور تھے اور شہر شنتر ین (santrem) کے علماء میں مورخ ابوالحسن علی مصنف کتاب الذخیرہ اور شاعر ابومحمد عبداللہ شنتر ینی کے نام قابل ذکر ہیں۔

پرتگال پہلے اسپین کا ایک حصہ تھا، لیکن بارہویں صدی میں ایک الگ ملک کی حیثیت اختیار کر لی۔ پہلے بادشاہت تھی لیکن ۱۹۱۰ء میں جمہوریہ بن گیا۔

پرتگال کا رقبہ ۳۵ ہزار مربع میل (۹۱ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ لزبن دارالحکومت ہے۔ پرتگالی زبان بولی جاتی ہے اور تقریباً تمام باشندے رومن کیتھولک عقیدہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہودیوں کی تعداد صرف چھ سو ہے۔

پرتگال میں مسلمانوں کی تعداد کے بارے میں تخمینوں میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ موتمر عالم اسلامی کراچی کے ۱۹۷۷ء کے تخمینے کے مطابق مسلمانوں کی تعداد دو ہزار ہے

جب کہ ترکی اخبار دیانت گزٹ میں مسلمانوں کی تعداد پانچ ہزار[1] بتائی گئی ہے۔ مسیحی مسلمان تعلقات کے ادارے نے مسلمانوں کی تعداد تیس ہزار لکھی ہے۔[2]

پرتگال میں آباد مسلمان پرتگالی نہیں ہیں بلکہ دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے مسلمان ہیں، لیکن یہ نہیں معلوم کہ یہ مسلمان کن ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یقیناً ان کی ایک تعداد تیمر (انڈونیشیا)، گنی بساؤ اور موزمبیق کی سابق پرتگالی نوآبادیوں سے تعلق رکھتی ہوگی۔ اس کے علاوہ ان میں مراکش اور شمالی افریقہ کے مسلمان بھی ہوں گے۔

۱۹۷۷ء تک پرتگال میں کوئی مسجد یا دینی مدرسہ نہیں تھا۔ مسلم ورلڈ کی ایک اطلاع کے مطابق موتمر عالم اسلامی کے جنرل سکرٹری انعام اللہ خاں جب اکتوبر ۱۹۸۱ء میں لزبن گئے تو انھوں نے دو مسجدوں میں تقریریں کیں۔[3] معلوم نہیں یہ مستقل مسجدیں ہیں یا نماز کے لیے حاصل کی ہوئی عمارتیں ہیں۔ نیوز آف مسلمز ان یورپ کی اطلاع کے مطابق ستمبر ۱۹۷۹ء میں لزبن میں ایک مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔[4] لیکن اسی پرچے کی ایک اور اشاعت میں تصریح کی گئی ہے کہ یہ مسجد ۱۹۸۲ء کے اوائل تک سرمایہ کی کمی کی وجہ سے تعمیر نہ ہوسکی۔ عبداللہ سوداگر باچو کی اطلاع کے مطابق متحدہ عرب امارات اور لیبیا نے لزبن کی مسجد کے لیے پچاس پچاس ہزار ڈالر دیے ہیں۔[5]

---

(۱) دیانت گزٹ، انقرہ یکم مئی ۱۹۷۹ء

(۲) نیوز آف مسلمز ان یورپ ۲۷، جنوری ۱۹۸۲ء

(۳) مسلم ورلڈ، کراچی ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۸۱ء

(۴) نیوز آف مسلمز ان یورپ ۱۵۔ مارچ ۱۹۸۲ء

(۵) مسلم ورلڈ کراچی ۱۶۔ جنوری ۱۹۸۲ء

شمالی اور جنوبی امریکہ

کنیڈا

کنیڈا کا رقبہ ½۸ ۳۸ لاکھ مربع میل (۹۲ لاکھ مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۱ء) دو کروڑ ۴۲ لاکھ۔ نصف سے کچھ کم آبادی رومن کیتھولک ہے اور باقی مسیحیت کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھتی ہے۔ یہودیوں کی تعداد تین لاکھ ہے۔ ڈی۔ ایچ ہمدانی نے مسلمانوں کی تعداد ستر ہزار لکھی ہے،[۱] لیکن مسلمانوں کا عام طور پر یہ خیال ہے کہ ان کی تعداد ایک لاکھ سے کم نہیں۔ حکومت کنیڈا کے مطابق ان میں چالیس سے پچاس ہزار پاکستانی ہیں۔[۲] پاکستانیوں کے بارہ سے پندرہ ہزار تعداد صرف دارالحکومت ٹورنٹو میں آباد ہے۔[۳]

جدہ یونیورسٹی کے مسلمان اقلیتوں کے انسٹی ٹیوٹ کے مجلہ جرنل میں کنیڈا کے مسلمانوں سے متعلق ایک پراز معلومات مضمون شائع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۷۱ء میں کنیڈا میں صرف تیرہ مسلمان تھے۔ ۱۹۵۱ء میں یہ تعداد دو اور تین ہزار تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد آنے والوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا اور اب یہ تعداد ایک لاکھ ہو چکی ہے۔ ابتدائی آبادکار عرب یا ترک تھے، لیکن اب پاکستان اور ہندوستان کے مسلمان سب سے زیادہ ہیں۔ اس کے بعد عرب میں۔ بنگلہ دیش، ترکی، ایران، مشرقی یورپ، مشرقی افریقہ اور بحیرۂ کیریبین کے مسلمان بھی کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔[۴] سب سے زیادہ مسلمان صوبہ اونٹاریو میں ہیں

---

(۱) جرنل (جدہ یونیورسٹی)، جلد نمبر ا شمارہ نمبر ا مضمون، کنیڈا میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی زندگی۔"

(۲) ایضاً، جلد ۳ شمارہ نمبر ۲ موسم سرما ۱۹۸۱ء، مضمون از خالد بن سعید۔

(۳) ایضاً۔

(۴) ایضاً جلد ۲ شمارہ نمبر ۲ (۱۹۸۰ء۔ ۱۹۸۱ء)

یعنی پچاس ہزار، اس صوبے کے شہر ٹورنٹو میں مسلمانوں کی تعداد چالیس ہزار ہے۔ صوبہ کوئیبک میں مسلمانوں کی تعداد پندرہ ہزار ہے اور وہ زیادہ مانٹریال میں آباد ہیں۔ صوبہ البرٹا میں بھی مسلمانوں کی تعداد پندرہ ہزار ہے۔ یہاں کی بیشتر تعداد ایڈمونٹن، کالگری اور لاک لایشے (lac laorency) کے شہروں میں پائی جاتی ہے۔ باقی بیس ہزار مسلمان، ملک کے دوسرے صوبوں میں منتشر ہیں۔ (۱)

کنیڈا کی پہلی مسجد ''الرشید'' ہے جو صوبہ البرٹا کے صدر مقام ایڈمونٹن میں نومبر ۱۹۳۸ء میں تعمیر کی گئی جبکہ وہاں لبنانی مسلمانوں کے صرف بیس خاندان آباد تھے۔ اب تقریباً بیس شہر ایسے ہیں جن میں مسجدیں موجود ہیں۔ ٹورنٹو کی جامع فیصل جو ۱۹۷۰ء میں تعمیر ہوئی پہلے کلیسا تھی جسے خرید کر مسجد میں تبدیل کیا گیا۔ (۲)

کنیڈا میں مسلمانوں کی کئی تنظیمیں ہیں۔ ان کی بیشتر تعداد ایک مرکزی تنظیم سے ملحق ہے جس کا نام ''کونسل آف مسلم کمیونٹیز آف کنیڈا (cmcc) ہے۔ اس کے تحت تعلیم، نوجوانوں اور خواتین کے امور، مذہبی اور تعلقات عامہ اور مطبوعات سے متعلق کمیٹیاں قائم ہیں۔ یہ تنظیم ایک وسیع تر اور منظم تنظیم فیڈریشن آف اسلامک ایسوسی ایشنز ان دی یونائیٹڈ اسٹیٹس اینڈ کنیڈا کی ممبر ہے جس کا صدر مقام ریاستہائے متحدہ میں اولڈ ہرج (نیوجرسی) میں ہے۔ یہ تنظیم ریاستہائے متحدہ کے طلبہ کی مشہور تنظیم ایم۔ ایس۔ اے کے تعاون سے کام کرتی ہے۔

بعض مسلم ادارے انگریزی عربی، اردو اور دوسری زبانوں میں خبرنامے اور جریدے بھی شائع کرتے ہیں۔ سی۔ ایم۔ سی۔ سی ایک سہ ماہی رسالہ اسلام کنیڈا انگریزی میں شائع کرتی ہے۔ مانٹریال سے پاکستانی مسلمان کریسنٹ کے نام سے ایک پندرہ روزہ پرچہ انگریزی میں شائع کرتے ہیں۔ شمالی امریکہ کی اسلامی تحریک ایک سہ ماہی پرچہ تحریک اردو اور انگریزی دونوں میں شائع کرتی ہے۔ یہ پرچہ اسلامک سرکل آف نارتھ امریکہ، مانٹاکلارا (کنیڈا) کی طرف سے شائع کیا جاتا ہے۔

---

(۱) جرنل (جدہ) جلد ۲ شمارہ ۲۔

(۲) ایضاً۔

کنیڈا میں مکمل مذہبی آزادی ہے۔ قرآن اور اس کے انگریزی اور فرانسیسی ترجمے اور اسلامی کتب آسانی سے مل جاتی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کو عام طور پر امتیازی سلوک کی شکایت ہے۔ حکومت اسلام کو تسلیم شدہ مذہب کی حیثیت سے مانتی ہے لیکن اسلامی شخصی قانون ابھی تک نافذ نہیں۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ

ریاستہائے متحدہ امریکہ کا رقبہ ½۵ ۳۵ لاکھ مربع میل اور آبادی (۱۹۸۰ء) ۲۲ کروڑ ۶۵ لاکھ ہے۔ امریکہ کی آبادی مخلوط النسل ہے۔ یہاں گورے، کالے، سرخ، زرد، ہر رنگ ونسل اور ہر ملک سے تعلق رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں۔ تقریباً ۸۷ فیصد گوری نسل کے لوگ ہیں، ½۱۲ فیصد افریقہ کے باشندے ہیں اور باقی ½ فیصد سرخ اور زرد رنگ کے لوگ اور ایشیائی باشندے ہیں۔ رنگ ونسل کی طرح مذہبی لحاظ سے بھی ریاستہائے متحدہ میں ہر مذہب کے پیرو پائے جاتے ہیں۔ ملک کی ۹۵ فیصد تعداد عیسائی ہے اور عیسائیوں کے ہر فرقہ کے لوگ کثیر تعداد میں ہیں، اس کے بعد یہودی ہیں جن کی تعداد ۱۹۷۹ء میں ۵۸ لاکھ تھی۔ مسلمانوں کی ابھی تک مردم شماری نہیں ہوئی لیکن ان کی تعداد ۱۲ لاکھ سے پچاس لاکھ تک بیان کی جاتی ہے۔ امریکہ میں بودھ، ہندو اور سکھ بھی پائے جاتے ہیں اور بہائی مذہب کے لیے بھی یہاں کی زمین خاصی زرخیز ثابت ہوئی ہے۔

نئی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ عرب اور افریقہ کے سیاہ فام باشندے کولمبس سے پہلے امریکہ پہنچ چکے تھے۔ کولمبس کے بعد بھی جو افریقی غلام امریکہ لائے گئے تھے ان میں بکثرت مسلمان بھی تھے جو جبر وتشدد اور متعصبانہ ماحول کی وجہ سے اپنے مذہب کو قائم نہ رکھ سکے۔ اس کے بعد انیسویں صدی میں کچھ عربوں اور ترکوں کے امریکہ پہنچنے اور وہاں آباد ہونے کی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ مسلمان بھی اسلامی دنیا سے کٹ جانے کی وجہ سے اور مقامی عیسائی اور یہودی عورتوں سے شادی کر لینے کی وجہ سے اپنا جداگانہ وجود قائم نہ رکھ سکے اور ان کی اگلی نسل کا بڑا حصہ غیر مسلم امریکی معاشرہ میں جذب ہوگیا۔ لیکن ان میں شام کے مسلمانوں کا ایک ایسا گروہ بھی تھا جو اپنے دین پر قائم رہا اور انھوں نے وسط مغرب کی ریاست آیووا کے شہر سیڈار ریپڈز میں ۱۹۲۹ء میں امریکہ کی پہلی مسجد کی بنیاد ڈالی جس کی تعمیر ۱۹۳۴ء میں مکمل ہوئی۔

مسلمان آباد کاروں کا پہلا بڑا ریلا پہلی اور دوسری عالمی جنگ کی درمیانی مدت میں امریکہ آیا۔ ان کی اکثریت مشرقی یورپ اور شام ولبنان کے عربوں پر مشتمل تھی۔ ان کی بھی کافی تعداد امریکی معاشرے میں ضم ہوگئی لیکن بیش تر تعداد نے اپنا علیحدہ وجود قائم کر رکھا۔

مسلمانوں کا دوسرا بڑا ریلا ۱۹۴۵ء اور ۱۹۶۵ء کے درمیان آیا۔ اس مدت میں اسلامی دنیا کے تقریباً تمام ممالک (اشتراکی حلقۂ اثر کے مسلم ملکوں کو چھوڑ کر) آزاد ہو چکے تھے۔ اس لیے اس مدت میں ان ملکوں کے سفارت خانوں کے عملے میں شامل ہو کر ہر طرف سے مسلمان امریکہ پہنچے، اس کے علاوہ طلبہ کی بھی بڑی تعداد اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ پہنچنا شروع ہو گئے۔ اندازہ ہے کہ ۱۹۶۵ء میں ریاستہائے متحدہ اور کنیڈا میں مسلمانوں کی تعداد دو لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔

مسلمان آباد کاروں کی سب سے بڑی تعداد ۱۹۶۵ء کے بعد امریکہ آئی۔ اس دَور میں بیش تر تعداد ملازمت کے سلسلے میں آئی کیونکہ ۱۹۶۵ء میں صدر جانسن کے دَورِ صدارت میں بیرون ملک سے آنے والوں کو امریکہ جانے کا موقع ملا۔ اس کے نتیجے میں انڈونیشیا، پاکستان اور ہندوستان سے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان امریکہ پہنچنے لگے۔ اسی طرح عرب ملکوں، ایران، ترکی اور افریقہ سے بھی کثیر تعداد میں مسلمان امریکہ آئے۔ اس طرح ۱۹۸۰ء تک باہر سے آنے والے مسلمانوں کی تعداد گیارہ لاکھ سے زیادہ ہوگئی۔

اس مدت میں خود امریکہ کے باشندوں میں بھی اسلام کی اشاعت شروع ہوگئی۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق پہلا گورا امریکی جو اسلام لایا الیگزینڈر رسل ویب (webb) تھا جس نے ۱۸۸۸ء میں اسلام قبول کیا تھا اور اسلام سے متعلق کتابچے بھی لکھے تھے۔ (۱)

۱۹۸۰ء میں گورے امریکی مسلمانوں کی تعداد چالیس ہزار تھی۔ لیکن ان کی اسی فیصد تعداد۔ ایسی خواتین پر مشتمل ہے جنھوں نے مسلمانوں سے شادی کے بعد اسلام قبول کیا۔ ۱۹۳۰ء سے سیاہ فام افریقی باشندوں میں اسلام پھیلنا شروع ہوا اور اس تیزی سے پھیلا کہ اس وقت کالے مسلمانوں کی تعداد دس لاکھ سے تیس لاکھ تک بیان کی جاتی ہے۔ ان میں ۷۵ ہزار اہل سنت و الجماعت ہیں اور باقی الیجاہ محمد کے امریکی مسلم مشن سے تعلق رکھتے ہیں۔ الیجاہ محمد چونکہ اسلام سے

(۱) امپیکٹ، لندن۔ ۲۷۔ مارچ تا ۹۔ اپریل ۱۹۸۱ء

بہت بھٹکے ہوئے تھے اس لیے ان کے پیروؤں کو عرصہ تک اسلام سے خارج سمجھا گیا۔ لیکن فروری ۱۹۷۵ء میں ان کی وفات کے بعد جب قیادت ان کے صاحبزادے وارث دین محمد کے ہاتھ میں آئی تو وہ کالے مسلمانوں کو بڑی حد تک اسی راستے پر لے آئے جو عام مسلمانوں کا ہے۔ اور اب کالے مسلمانوں کی مسجدیں تمام مسلمانوں کے لیے کھلی ہوئی ہیں بلکہ بعض مساجد میں امامت کے فرائض پاکستان اور دوسرے اسلامی ملکوں کے مسلمان انجام دے رہے ہیں۔

حال میں عارف غیور نے جو ٹیکساس کرسچین یونیورسٹی، فورٹ ورتھ میں معاون پروفیسر ہیں امریکن اکیڈمی کے رسالے (che annals) کی مارچ ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں ریاستہائے متحدہ میں مسلمانوں کی تعداد پر ایک تحقیقی مضمون لکھا ہے جس میں انھوں نے مسلمانوں کی کل تعداد بارہ لاکھ ۳ ہزار ۵ سو بتائی اور تفصیل سے بتایا کہ کس ملک سے کتنے مسلمان امریکہ میں آئے ہیں اور ان کی بڑی تعداد کہاں رہتی ہے۔ کالے مسلمانوں میں سے انھوں نے صرف ۷۵ ہزار سنی مسلمانوں کو اس تعداد میں شامل کیا ہے۔ اب اگر اس تعداد میں دس لاکھ سے بیس لاکھ تک کالے مسلمان شامل کر لیے جائیں تو مسلمانوں کی کل تعداد ۲۲ لاکھ سے ۳۲ لاکھ تک ہو جائے گی۔

کالے مسلمانوں کے بعد امریکہ میں سب سے زیادہ عرب ملکوں کے مسلمان ہیں جن کی تعداد ۴ لاکھ ۵۹ ہزار ہے۔ عربوں کے بعد ایرانی ہیں جن کی تعداد دو لاکھ پندرہ ہزار ہے، پھر ترک آتے ہیں جن کی تعداد ایک لاکھ پچیس ہزار ہے۔ اگر روس کے تاتاری مسلمانوں کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے تو ترکوں کی تعداد ایک لاکھ ۶۳ ہزار ہو جائے گی۔ پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد ۶۵ ہزار ہے۔ ان میں چالیس ہزار صرف پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ البانوی مسلمانوں کی تعداد بھی چالیس ہزار ہے اور یوگوسلادیا کے مسلمانوں کی تعداد ۳۵ ہزار ہے۔ باقی مسلمان ایشیا اور افریقہ کے دوسرے ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

عارف غیور کی تحقیق کے مطابق ایک لاکھ ۷۵ ہزار مسلمان نیویارک اور اس کے مضافات میں رہتے ہیں، ایک لاکھ بیس ہزار شگاگو اور اس کے مضافات میں رہتے ہیں، ایک لاکھ لاس اینجلس میں' ۶۵ ہزر ڈیٹروئٹ میں، ۴۵ ہزار دارالحکومت واشنگٹن میں، ۴۵ ہزار سان فرانسسکو میں اور چالیس ہزار ہیوسٹن (ٹیکساس) میں رہتے ہیں۔ لاس اینجلس میں عرب اور ایرانی اور شکاگو میں پاکستانی اور ہندوستانی دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے زیادہ ہیں۔

امریکہ میں باہر سے آنے والے مسلمان عام طور پر خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور ڈاکٹر، پروفیسر اور انجینئر کی حیثیت سے ملازم ہیں اور اب تجارت اور کاروبار کی طرف بھی توجہ دے رہے ہیں۔

مسلمانوں کی کئی تنظیمیں بڑی فعال ہیں۔ ان میں سب سے اہم مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (m.s.a) ہے۔ یہ تنظیم ۱۹۶۲ء میں طلبہ نے قائم کی تھی لیکن اب اس کو چلانے والے سابق طلبہ اور غیر طلبہ ہیں۔ اس کا صدر دفتر پلین فیلڈ (انڈیانا) میں ہے۔ ایم۔ ایس۔ اے کا اپنا دارالاشاعت اور کتاب گھر ہے۔ تنظیم کی طرف سے الاتحاد کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ اور ہورائزن (horizon) کے نام سے ایک ہفت روزہ انگریزی میں شائع ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کی دوسری اہم تنظیم "ریاستہائے متحدہ اور کنیڈا کی مسلمان انجمنوں کا وفاق" ہے یہ تنظیم ۱۹۵۲ء میں سیڈار ریپڈز کے شامی مسلمانوں نے قائم کی تھی۔ اس کی طرف سے مسلم اسٹار کے نام سے ایک اخبار شائع ہوتا ہے اور یونٹی پبلشنگ ہاؤس کے نام سے ایک دارالاشاعت بھی ہے۔

امریکی مسلمانوں کی تیسری بڑی جماعت، اسلامی پارٹی امریکہ ہے۔ یہ جماعت ۱۹۷۱ء میں یوسف مظفر الدین حامد اور ان کے ساتھیوں نے قائم کی تھی۔ اس کا صدر دفتر واشنگٹن میں ہے۔ اس کا مقصد تبلیغ کے علاوہ اسلام کو بحیثیت تحریک کے متعارف کرانا ہے۔ سیاہ باشندے اس کے روح رواں ہیں۔ جماعت کی طرف سے 'الاسلام' کے نام سے ایک انگریزی ماہنامہ بھی شائع کیا جاتا ہے اور اسلامک پارٹی پبلی کیشنز کے نام سے ایک دارالاشاعت بھی ہے۔

چوتھی بڑی تنظیم "امریکن مسلم مشن" ہے جسے ایلیجاہ محمد نے قائم کیا تھا اور ۱۹۷۵ء ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے وارث دین محمد اس کی قیادت کر رہے ہیں۔ حقیقت میں یہ مسلمانوں کی سب سے بڑی اور فعال تحریک ہے۔ اس کا مرکز شکاگو میں ہے اور اس کی طرف سے بلالین نیوز (bilalian news) کے نام سے ایک ہفت روزہ شائع ہوتا ہے۔ مسلم مشن کی دو سو سے زیادہ مسجدیں ہیں جو امریکہ کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی ہیں اور کئی جگہ اسلامی تعلیم کے اہم ادارے کام کر رہے ہیں۔ شکاگو میں ایک عالی شان مسجد زیر تعمیر ہے۔

بیرونی ملکوں سے آنے والے مسلمانوں نے بھی دو ڈھائی سو کے قریب مسجدیں بنالی ہیں، لیکن ان کی بڑی تعداد جرمنی اور فرانس کی طرح نجی مکانوں اور فلیٹوں میں پائی جاتی ہے۔ بعض

شہروں میں مستقل مسجدیں بھی بن گئی ہیں۔ واشنگٹن کا اسلامک سنٹر اور مسجد ان میں سب سے شاندار ہے۔ سیڈار ریپڈز (آیووا) کی مسجد بھی گنبد والی خوبصورت مسجد ہے۔ اسلامی کتب کی امریکہ میں کوئی کمی نہیں۔ مسلمانوں نے کتب فروشی کی متعدد کانیں قائم کرلی ہیں جن سے عربی، انگریزی اور اردو کی کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں۔

وسطی امریکہ

وسطی امریکہ سے ہماری مراد وہ ملک ہیں جو ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جنوبی امریکہ کے درمیان واقع ہیں اور جن میں میکسیکو کے علاوہ باقی ملک بہت چھوٹے ہیں۔ ان میں سوائے بلیزے (belize) کے تمام ملکوں میں ہسپانوی زبان بولی جاتی ہے جس کی وجہ سے اس خطہ کو لاطینی امریکہ بھی کہا جاتا ہے۔ بلیزے کی سرکاری زبان انگریزی ہے۔ عقیدے کے لحاظ سے اس خطے کے باشندوں کی عظیم اکثریت رومن کیتھولک ہے۔ اس کے علاوہ ان میں سے کسی بھی ملک میں سفید فام باشندوں کی اکثریت نہیں۔ یہ لوگ سفید فام اور سرخ ہندی باشندوں کی مخلوط نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ تھوڑی تعداد میں افریقی باشندے بھی پائے جاتے ہیں جو کسی زمانے میں غلاموں کی حیثیت سے لائے گئے تھے۔ مسلمان اس خطے میں نہ ہونے کے برابر ہیں اور ان کے بارے میں معلومات یا تو بالکل نہیں یا برائے نام ہے۔

میکسیکو

میکسیکو میں مسلمانوں کی تعداد تین سو کے قریب ہے اور یہ سب مسلمان ملکوں کے سفارت خانوں کے عملے پر مشتمل ہیں۔ میکسیکو میں نو اسلامی ملکوں کے سفارت خانے ہیں، لیکن اس کے باوجود دارالحکومت میکسیکو سٹی میں جمعہ کی نماز کا بھی انتظام نہیں۔ [1]

بلیزے

ایک سو افریقی اور پچاس عرب مسلمان ہیں۔ دارالحکومت بیل موپان میں جمعہ کی نماز کا انتظام ہے اور ایک اسلامی مرکز بنانے کا منصوبہ بھی ہے۔ اسلامی مشن کے نام سے ایک تنظیم بھی

(1) ماہنامہ "اردو ڈائجسٹ" لاہور۔ اگست ۱۹۸۱ء مضمون محمد سمیع اللہ "لاطینی امریکہ میں اسلام"

قائم ہے۔[1]

کوسٹاریکا

یہاں بہت سے عربی النسل مسلمان ہیں لیکن تعداد نہیں معلوم۔ دارالحکومت سان جوزی میں ایک اسلامی مرکز قائم ہے جس کے امام مصطفیٰ محمد، اسلام پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔[2]

پاناما

پاناما میں مسلمانوں کی تعداد ایک ہزار پانچ سو ہے۔ پہلی مسجد کا سنگ بنیاد رمضان۔ اگست ۱۹۸۰ء/ ۱۴۰۰ھ میں رکھا گیا۔ یہ مسجد بھارتی صوبہ گجرات کے ایک مسلمان تاجر سلیمان بھیکو اور حکومت لیبیا کے تعاون سے بنائی جارہی ہے۔ اخراجات کا اندازہ پچاس لاکھ ڈالر ہے۔ سلیمان بھیکو پچاس سال سے پاناما میں رہ رہے ہیں۔ پاناما میں مسلمانوں کی ایک تنظیم بھی ہے جس کے سربراہ احمد ایف بھیکو ہیں۔[3]

وسطی امریکہ کے دوسرے ملک سان سلواڈور، ہونڈوراس اور نکاراگوا ہیں۔ لیکن یہاں کے مسلمانوں کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔

---

(۱) ماہنامہ ''اردو ڈائجسٹ'' لاہور۔ اگست ۱۹۸۱ء مضمون محمد سمیع اللہ ''لاطینی امریکہ میں اسلام''

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً

جزائر غرب الہند

شمالی اور جنوبی امریکہ کے درمیان بحر اوقیانوس اور بحیرۂ کیری بین میں جو بے شمار جزیرے واقع ہیں ان کو عام اصطلاح میں جزائر غرب الہند کہا جاتا ہے۔ سولھویں صدی میں ان جزیروں پر برطانیہ، اسپین اور فرانس نے قبضہ کرلیا تھا۔ اب ان میں سے بیشتر آزاد ہو چکے ہیں۔ امریکہ کی طرح یہاں بھی لاکھوں کی تعداد میں غلام لائے گئے تھے اس لیے ان کی آبادی میں افریقی باشندے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ذیل میں ان جزیروں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن میں مسلمان پائے جاتے ہیں۔

ٹرینی ڈاڈ اور ٹوباگو

رقبہ ۲ ہزار مربع میل اور آبادی (۱۹۷۸ء) گیارہ لاکھ تیس ہزار ہے۔ ۴۳ فیصد آبادی افریقی نسل سے، ۳۶ فیصد ہندوستانی اور پاکستانی اور ۱۶ فیصد مخلوط نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ ۱۸۳۱ء میں جب برطانیہ نے غلامی کا نظام ختم کر دیا تو گنے کے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے ہندوستان سے مزدور بلائے گئے ان میں مسلمان بھی تھے۔ اب یہی مسلمان ان جزیروں میں اسلام کا نام بلند کیے ہوئے ہیں۔

۱۹۶۰ء کی مردم شماری کے مطابق ملک کی آٹھ لاکھ ۲۷ ہزار آبادی میں ایک لاکھ نوے ہزار ہندو اور پچاس ہزار مسلمان تھے۔ باقی آبادی عیسائی تھی۔ گویا مسلمانوں کا تناسب چھ فیصد سے کچھ زیادہ ہے۔ لیکن موتمر عالم اسلامی کے کتابچے میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ پچیس ہزار بتائی گئی ہے۔ اسی طرح محمد سمیع اللہ نے مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ پندرہ ہزار بتائی ہے جو ۱۹۷۸ء کی آبادی کا دس فیصد ہوتی ہے۔

ٹرینی ڈاڈ میں مسجدوں کی تعداد ستر[1] ہے۔ دارالحکومت پورٹ آف اسپین میں کوئنز اسٹریٹ (queen's) پر ایک شاندار مسجد ہے اور سینٹ جوزف نامی بستی میں ایک مسجد قائداعظم محمد علی جناح کے نام پر ہے۔[2] مسجدوں کے ساتھ دینی مدرسے بھی ہیں اور دونوں کا انتظام اچھا ہے۔ مسجد اور مدرسے اہل سنت والجماعت ایسوسی ایشن چلاتی ہے جو دینی مدرسوں کے علاوہ جدید مدرسے بھی چلاتی ہے۔ بحیثیت مجموعی یہاں کے مسلمان خوشحال ہیں۔ ان میں بڑے بڑے تاجر، قانون داں، ڈاکٹر اور انجینئر ہیں۔

ٹرینی ڈاڈ میں قرآن اور اس کے ترجمے اور اسلامی کتب آسانی سے مل جاتی ہیں۔ اسلامی شخصی قانون نافذ نہیں لیکن مسلمان اس پر عمل کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے دوسرے اداروں میں ایک اسلامک ٹرسٹ آف ٹرینی ڈاڈ اور دوسرے اسلامی مبلغین کی تنظیم برائے کیرمی بیئن اور جنوبی امریکہ کے نام قابل ذکر ہیں۔[3]

گرینا ڈا

ٹرینی ڈاڈ کے شمال میں ستر اسی میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ مسلمانوں کی تعداد صرف ایک سو ہے۔ جس میں ستر افریقی اور تیس ہندوستانی ہیں۔ مسجد نہیں ہے صرف ایک کمرہ نماز جمعہ کے لیے مخصوص ہے۔[4]

بارباڈوس

یہ جزیرہ گرینا ڈا کے شمال مغرب میں تقریباً دوسو میل کے فاصلہ پر ہے۔ نوے فیصد آبادی افریقی ہے۔ تقریباً سب عیسائی ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد ایک ہزار ہے جو زیادہ تر ہندوستانی ہیں۔ کچھ مقامی لوگوں نے بھی اسلام قبول کیا ہے۔ دارالحکومت برج ٹاون میں دو مسجدیں ہیں۔ یہاں

---

(1) اردو ڈائجسٹ، لاہور۔ اگست ۱۹۸۱ء مضمون "لاطینی امریکہ میں اسلام" از محمد سمیع اللہ۔

(2) پان امریکن ورلڈ گائڈ ۱۹۸۰ء

(3) اسلامک ہیرلڈ، کوالالمپور۔ جلد ۴ شمارہ ۷۔ ۸ (۱۹۸۰ء)

(4) اردو ڈائجسٹ، لاہور۔ اگست ۱۹۸۱ء

تبلیغی جماعت کافی سرگرم ہے۔ جنوری ۱۹۸۱ء سے کرائسٹ چرچ میں ایک اسلامی مرکز کام کر رہا ہے۔ اس کے لیے ٹرینی ڈاڈ کے مخیر مسلمانوں اور سعودی حکومت نے بھی مدد دی ہے۔ اب ایک دینی تعلیمی ادارہ قائم کرنے کی کوشش کی جاری ہے۔ (۱)

سینٹ وِن سنٹ

بار باڈوس کے مغرب میں ایک سو میل کے فاصلہ پر ایک جزیرہ ہے۔ اکثریت افریقی باشندوں پر مشتمل ہے۔ مسلمانوں کی تعداد صرف تین سو ہے۔ ایک مسجد بھی ہے۔ (۲)

ڈومی نیکا

جزیرہ سینٹ ون سنٹ کے شمال میں ہے۔ اکثریت افریقی ہے۔ مسلمانوں کی تعداد صرف پچاس ہے اور انھوں نے پچھلے چھ سات سالوں میں اسلام قبول کیا ہے۔ کوئی مسجد نہیں ہے۔ جمعہ کی نماز ایک مسلمان کے گھر میں ادا کی جاتی ہے۔ مسلمان ایک اسلامی مرکز قائم کرنا چاہتے ہیں، لیکن نہ عمارت ہے اور نہ سرمایہ۔ (۳)

جمیکا

جزائر غرب الہند کی سابق برطانوی نو آبادیوں میں سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ اکثریت افریقی باشندوں پر مشتمل ہے۔ اکیس لاکھ آبادی میں صرف ڈھائی ہزار مسلمان ہیں۔ دو مسجدیں ہیں۔ ایک سینٹ کیتھرین میں اور دوسری سینٹ موالینڈ میں۔ (۴)

بہاماس

یہ مجموعہ الجزائر امریکی ریاست فلوریڈا کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ ۸۵ فیصد آبادی

---

(۱) اردو ڈائجسٹ، لاہور۔ اگست ۱۹۸۱ء

(۲) ایضاً۔

(۳) ایضاً۔

(۴) ایضاً۔

افریقی ہے۔ انگریزی عام زبان ہے۔ مسلمانوں کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ ہے۔ اسلام صرف دس بارہ سال پہلے روشناس کرایا گیا تھا۔ جمعیت اسلام کے نام سے ایک تنظیم بھی قائم ہے۔ [1]

برمودا

ریاستہائے متحدہ کے مشرق میں بحر اوقیانوس میں واقع چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں جہاں امریکہ کے بحری اور فضائی اڈے قائم ہیں۔ ۵۴ ہزار آبادی میں تین چار سو مسلمان ہیں جو زیادہ تر نومسلم ہیں۔ ایک مسجد اور اسلامی مرکز بھی موجود ہے۔ [2]

کوراکاؤ

جزائر غرب الہند کے جنوب میں اور جنوبی امریکہ کی ریاست وینیزویلا کے شمالی ساحل کے پاس جزیروں کا ایک مجموعہ ہے جو نیدرلینڈ اینٹیلیس کہلاتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا جزیرہ کوراکاؤ ہے۔ یہ ہالینڈ کے قبضے میں ہیں۔ ڈیڑھ لاکھ کی آبادی میں مسلمان صرف دو سو ہیں جو زیادہ تر لبنانی ہیں۔ ایک مسجد بھی ہے جس میں جامع ازہر کے سند یافتہ ایک امام مقرر ہیں۔ [3]

---

(۱) اردو ڈائجسٹ لاہور۔ اگست ۱۹۸۱ء

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً

گُیانا

گوئیانا کا رقبہ ۸۳ ہزار مربع میل اور آبادی (۱۹۷۸ء) ۸ لاکھ بیس ہزار ہے جارج ٹاؤن دارالحکومت ہے اور انگریزی سرکاری زبان ہے۔ ۵۷ فیصد باشندے عیسائی، ۳۳ فیصد ہندو اور ۹ فیصد مسلمان ہیں۔

پہلے یہ ملک برطانوی گیانا کہلاتا تھا۔ یہاں بھی گنے کے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے شروع میں افریقہ سے غلام لائے گئے لیکن جب غلامی پر پابندی لگ گئی تو ۱۸۳۸ء اور ۱۹۱۷ء کے درمیان ہندوستان سے مزدور بلائے گئے اور اتنی تعداد میں آئے کہ اس وقت نصف سے زیادہ تعداد ہندوستانیوں کی ہے۔ افریقہ سے جو غلام لائے گئے تھے ان میں مسلمانوں کی کثرت تھی اور وہ فولانی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے لیکن ۱۷۶۳ء میں جب یہاں ہالینڈ کی حکومت تھی انھوں نے بغاوت کردی جس کے نتیجے میں ان کو اس سختی سے کچلا گیا کہ تمام افریقی اسلام سے بیگانہ ہو گئے۔ اس وقت جو مسلمان ہیں وہ سب ہندوستان اور پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں اور اردو بولتے ہیں۔ صرف آٹھ سو مسلمان شامی ہیں۔[1]

مسلمان عام طور پر ساحلی علاقے میں رہتے ہیں۔ اکثریت زراعت پیشہ ہے لیکن تجارت اور صنعت وحرفت میں بھی نمایاں ہیں۔ مسلمان عام طور پر خوشحال ہیں اور ان کے اثرات ہیں۔ احمدی بھی کافی تعداد میں ہیں۔

گیانا میں مسجدوں کی تعداد ایک سو پچیس (۱۲۵) ہے اور ان سب کے ساتھ مدرسے ہیں۔ ۶۵ مسجدیں گنبد و مینار والی ہیں۔ دارالحکومت جارج ٹاؤن میں چھ مسجدیں ہیں۔ بعض مسلمان طلبہ

---

(۱) جرنل (جدہ یونیورسٹی) جلد ۳ شمارہ نمبر ۲ (موسم سرما ۱۹۸۱ء) مضمون گیانا کے مسلمان از رالف رائی شرٹ، باہیا یونیورسٹی، برازیل۔

اسلامی یونیورسٹی مدینہ اور کراچی (پاکستان) کے دینی مدرسوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ قرآن اور اس کے انگریزی ترجمے آسانی سے مل جاتے ہیں لیکن اسلام سے متعلق کتابیں آسانی سے دستیاب نہیں۔ اسلامی شخصی قوانین نافذ نہیں اور تعدادِ ازدواج قانوناً ممنوع ہے۔ بیس تا پچاس افراد ہر سال حج کرتے ہیں۔ عید الاضحیٰ اور میلاد النبی ہر سال میں دو چھٹیاں مسلمانوں کو دی جاتی ہیں۔

۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۴ء تک پیپلز پروگریسو پارٹی جس میں ہندوستانیوں کو غلبہ تھا حکمراں رہی، لیکن اس کے بعد سے پیپلز نیشنل کانگریس پارٹی حکمراں چلی آ رہی ہے جس میں افریقی باشندوں کو غلبہ حاصل ہے۔ یہ پارٹی سوشلزم کی علمبردار ہے۔ اس نے گنّے کے کھیتوں، شکر کے کارخانوں اور بکسائیٹ کی کانوں کو قومی ملکیت میں لے لیا ہے جس سے ہندوستانیوں کی معاشی زندگی بالعموم اور مسلمانوں کی بالخصوص بہت متاثر ہوئی ہے۔ تعلیمی اداروں کو بھی قومی ملکیت میں لے لیا گیا ہے اور کتابوں کی درآمد کو بھی سرکاری تحویل میں لے لیا گیا ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کی دینی مشکلات بڑھ گئی ہیں۔ ملازمتوں میں بھی مسلمانوں سے امتیاز برتا جا رہا ہے اور ہر جگہ افریقی باشندوں کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ حکومت الیجاہ محمد کے پیرووں اور احمدیوں کی سرپرستی کر رہی ہے۔[۱]

---

(۱) مسلمانوں کی یہ مشکلات ''مسلم انفرمیشن بیورو، گیانا کے صدر مولوی محمد حسین غنی نے پیش کی ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ماہنامہ ''یونیورسل میسیج'' کراچی۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء

سُرینام

سرینام کا ملک جنوبی امریکہ کے شمالی ساحل پر گیانا اور فرانسیسی گیانا کے درمیان واقع ہے۔

۲۵۔نومبر ۱۹۷۵ء کو آزادی حاصل کرنے سے پہلے ہالینڈ کے قبضہ میں تھا اور ولندیزی کہلاتا تھا۔ رقبہ ۶۳ ہزار مربع میل اور آبادی (۱۹۷۹ء) ۴ لاکھ ۷۹ ہزار ہے۔ ۳۵ فیصد باشندے ہندوستانی، تیس فیصد افریقی اور پندرہ فیصد انڈونیشی ہیں۔ افریقی غلاموں کی حیثیت سے لائے گئے تھے اور ہندوستانی اور انڈونیشی ۱۸۷۳ء کے بعد یعنی جب ہالینڈ نے غلامی ختم کر دی، مزدوروں کی حیثیت سے لائے گئے۔ آزادی سے قبل ایک چوتھا آبادی جس میں ہندوستانیوں کی اکثریت تھی نقل مکانی کر کے ہالینڈ چلی گئی۔ اب تیس ہزار ہندوستانی مسلمانوں میں صرف بیس ہزار باقی بچے ہیں اور ۷۴ ہزار اہل جاوا میں صرف ۵۳ ہزار بچے ہیں۔ اگر رفتار یہی رہی تو ۲۰۰۰ء تک سرینام مسلمانوں سے خالی ہو جائے گا۔[1]

۱۹۶۴ء میں ایک لاکھ ۴۲ ہزار عیسائی، ۸۷ ہزار ہندو اور ۶۴ ہزار مسلمان تھے۔[2] مسلمانوں میں ستر فیصد انڈونیشی اور تیس فیصد ہندوستانی ہیں۔ مسلمان کل آبادی کا ۲۲ فیصد تھے۔ ۱۹۷۹ء میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ چار ہزار تھی جس میں ۷۴ ہزار جاوا کے انڈونیشی اور تیس ہزار ہندوستانی مسلمان تھے۔[3] کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی ایک تہائی آبادی حمدی ہے۔[4]

ہندوستانی مسلمان زراعت پیشہ تجارت پیشہ اور صنعت کار ہیں اور خوشحال ہیں جبکہ انڈونیشی

---

(۱) جرنل (جدہ یونیورسٹی) جلد ۳ شمارہ نمبر ۲ (موسم سرما ۱۹۸۱ء) دیکھئے رالف رومیٹرٹ کا مضمون "گویانا کے مسلمان"

(۲) اسٹیٹسمین ایر بک ۱۹۷۰ء۔۱۹۷۱ء

(۳) جرنل (جدہ یونیورسٹی) جلد ۳ شمارہ نمبر ۲ (موسم ۱۹۸۱ء) مضمون از پروفیسر رالی شرٹ۔

(۴) ایضاً۔

باشندے بہت غریب ہیں۔ مذہب سے گہری وابستگی رکھتے ہیں لیکن ان کی مسجدوں کا رخ مغرب کی طرف ہوتا ہے کیونکہ کعبہ انڈونیشیا کے مغرب میں ہے اس کے برخلاف ہندوستانی مسلمان مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں کیونکہ خانہ کعبہ سُرینام کے مشرق میں ہے۔ (۱)

موتمر عالم اسلامی کراچی کے مطابق سرینام میں مسجدوں کی تعداد پچاس اور محمد سمیع اللہ کے مطابق ستر ہے۔ صدر مقام پارامار یبو کی جامع مسجد ۱۹۳۲ء میں تعمیر کی گئی تھی۔ محمد سمیع اللہ لکھتے ہیں کہ بہت سی مسجدیں دیوبندی اور بریلوی اختلافات کی وجہ سے بند پڑی ہیں۔ پورے سرینام میں مشکل سے ایک یا دو مسجدیں ایسی ہوں گی جہاں نماز پنجگانہ باجماعت ادا کی جاتی ہو۔ ایک اور وجہ مسجدوں کے آباد نہ ہونے کی یہ بھی ہے کہ بہت سے مسلم گھرانے ملک کی آزادی کے وقت کالے افریقیوں کے تشدد کے خوف سے ہالینڈ چلے گئے تھے۔ (۲)

موتمر عالم اسلامی، کراچی کے کتابچہ کے مطابق ”قرآن اور اس کے ولندیزی ترجمے آسانی سے مل جاتے ہیں لیکن اسلامی کتب کی فراہمی کافی نہیں۔ ہر سال ۲۵ تا ۵۰ مسلمان حج کو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کا شخصی قانون نافذ ہے۔ کل بیس مدرسے ہیں۔ مسلمانوں نے ان کے علاوہ جدید اسکول بھی قائم کر رکھے ہیں جن میں اسلامی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان مدرسوں میں طلبہ کی کل تعداد ایک ہزار ہے۔ لیکن اکثریت بنیادی اسلامی تعلیم سے محروم ہے۔ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل مسلمان بھی ہیں لیکن کم تعداد میں ہیں۔ بعض اہم عہدوں پر مسلمان فائز ہیں۔ دو مسلمان وزیر ہیں اور سات مسلمان پارلیمنٹ کے رکن ہیں۔“

اس کے برخلاف محمد سمیع اللہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ملکی معاملات میں کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ یہاں تک کہ سرکاری ملازمتوں اور اقتصادی سرگرمیوں میں ان کا عدم وجود برابر ہے۔ البتہ عید الفطر کی چھٹی ضرور دی جاتی ہے اور مسلمان میلاد النبی کے موقع پر چھٹی دلوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ قادیانیوں کی تعداد چھ ہزار ہے اور وہ مسلم عوام کے ذہنوں میں انتشار پیدا کر رہے ہیں۔ ہندوستانی اور انڈونیشی مسلمانوں کے درمیان بہت کم ربط و ضبط ہے۔ ریاض (سعودی

(۱) جرنل (جدہ یونیورسٹی) جلد ۳ شمارہ نمبر ۲ (موسم سرما ۱۹۸۱ء) مضمون از پروفیسر رائی شرٹ۔

(۲) اردو ڈائجسٹ، لاہور، اگست۔ ۱۹۸۱ء

عرب) کے دارالافتا کی جانب سے دو انڈونیشی گریجوئیٹ سُرینام بھیجے گئے ہیں جو جاوا کے مسلمانوں میں کام کر رہے ہیں۔ ولندیزی زبان میں قرآن کریم کے تین ترجمے موجود ہیں۔ ان میں سے دو قادیانیوں نے کیے ہیں جو لاہوری اور ربوہ گروپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ تیسرا ترجمہ ایک مستشرق پروفیسر جے۔ ایچ۔ کریمرس نے کیا ہے قادیانی اپنا پروپیگنڈہ زوروں سے کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اس ملک میں کلیدی عہدوں پر قابض ہیں، یہاں تک کہ ایک قادیانی ریڈیو اسٹیشن کا مالک ہے۔ سرینام میں صرف ایک مسلم ملک انڈونیشیا کا سفارت خانہ ہے۔[1]

سرینام کے مسلمانوں کی کئی تنظیمیں ہیں۔ مثلاً ''سرینام اسلامک ایسوسی ایشن، سرینا مسلم ایوسی ایشن، سرینام مسلم فیڈریشن، سرینام میں اسلامی دینی حلقوں کی فاونڈیشن، محمدیہ اسلام، آل مسلم آرگنائیزیشن وغیرہ۔ اب یہ تمام تنظیمیں مجلس مسلمین سرینام یا سرینام اسلامک آرگنائیزیشن کے تحت متحد ہوگئی ہیں جس کے صدر اسحاق جمال الدین (Isaac Jamaluddin) ہیں۔ یہ تنظیم اسلامک کونسل آف ساوتھ امریکہ کی رکن ہے۔[2]

---

(۱) اردو ڈائجسٹ، لاہور، اگست ۱۹۸۱ء

(۲) جرنل (جدہ) سرما ۱۹۸۰ء و گرما ۱۹۸۱ء

وینی زوئیلا

وینی زوئیلا کا رقبہ ۳ لاکھ ۵۲ ہزار مربع میل اور آبادی (۱۹۷۸ء) ایک کروڑ اکتیس لاکھ ہے۔ تقریباً تمام باشندے کیتھولک عیسائی ہیں۔ زبان ہسپانوی ہے۔ یہودیوں کی تعداد پندرہ ہزار ہے۔ مسلمانوں کی تعداد بیس ہزار سے پچاس ہزار تک بیان کی جاتی ہے۔ بیس ہزار کا اندازہ موتمر عالم اسلامی کراچی کا ہے جبکہ محمد سمیع اللہ نے اردو ڈائجسٹ میں مسلمانوں کی تعداد پچاس ہزار بیان کی ہے۔ محمد سمیع اللہ کی تحریر کے مطابق صرف دارالحکومت کاراکس میں تیس ہزار مسلمان ہیں لیکن ان کا وجود نمایاں نہیں۔ (۱)

مسلمان تقریباً سب لبنان اور فلسطین کے باشندے ہیں جو موجودہ صدی کے آغاز میں آئے تھے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد کچھ مسلمان پاکستان اور ہندوستان کے بھی آگئے ہیں۔ مسلمان زیادہ تر دارالحکومت اور اس کے گردونواح میں رہتے ہیں۔ یا پھر دوسرے شہروں میں آباد ہیں۔

۱۹۵۱ء میں ابراہیم بارود کاراکس پہنچے۔ انھوں نے مسلمانوں کو نماز اور دینی باتوں کے لیے اپنے گرد جمع کرنا شروع کیا۔ ایک مسلم ایسوسی ایشن بھی قائم کی گئی۔ مسجد کی تعمیر شروع کی گئی جو ۱۹۶۴ء میں مکمل ہوئی۔ (۲) اس ایسوسی ایشن نے جامعہ ازہر، قاہرہ کے فارغ التحصیل ایک عالم کی خدمات حاصل کیں۔ موتمر کی اطلاع میں کہا گیا ہے کہ ۱۹۷۰ء سے کوئی امام یا معلم نہیں، مسجد بھی مرمت طلب ہے۔ بنیادی اسلامی تعلیم مسجد میں دی جاتی تھی، لیکن معلم کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ اگر طلبہ کی تعداد ایک سو تیس ہو جاتی تو حکومت ابتدائی مدرسہ کے طور پر اس کو تسلیم کر لیتی۔

---

(۱) اردو ڈائجسٹ، لاہور۔ اگست ۱۹۸۱ء

(۲) مسلمان اقلیتیں (انگریزی) شائع کردہ موتمر عالم اسلامی، کراچی ۱۹۷۰ء

لیکن تازہ اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ کاراکس میں ۱۹۷۲ء سے ایک اسلامی مرکز قائم ہے اور اس کے لیے ایک دومنزلہ عمارت خریدی گئی ہے۔ مسلمان بچوں کے لیے ایک اسکول بھی ہے جس میں ۶۴ بچے تعلیم پا رہے ہیں۔ یہ اسکول گو حکومت کی تحویل میں ہے مگر اس میں دینی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور دو گھنٹے اسلامیات اور عربی کے لیے مخصوص ہیں۔ اس مرکز اسلامی کے ناظم شیخ مصطفی الہمشری ہیں جو جامعہ ازہر کے فارغ التحصیل ہیں۔ پاکباز مسلمان ہیں اور عربی اور فرانسیسی پر کامل عبور رکھتے ہیں۔ مسلم ایسوسی ایشن کے موجودہ صدر شیخ اسماعیل ہیں، جو صرف اس لیے کریانے اور گوشت کی دوکان چلا رہے ہیں کہ مسلمان حلال گوشت کھا سکیں۔ وہ قصاب کے گھر روزانہ آدھی رات کے بعد جاتے ہیں اور اپنے ہاتھ سے جانور ذبح کرتے ہیں۔ حکومت دینی زوئیلا نے چار سال پہلے سات ہزار چار سو مربع میٹر کا ایک قطعۂ زمین مسجد کی تعمیر کے لیے دیا تھا۔ مسجد کا سنگ بنیاد ربیع الآخر ۱۹۷۹ء/۱۳۹۹ھ میں رکھا گیا، لیکن ابھی تک تعمیر کا کام شروع نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اس پر کرایہ دار قابض ہیں۔ (۱)

---

(۱) اردو ڈائجسٹ، لاہور۔ اگست ۱۹۸۱ء

کولمبیا

کولمبیا کا رقبہ چار لاکھ ۵۵ ہزار مربع میل اور آبادی (۱۹۷۸ء) دو کروڑ ۵۶ لاکھ ہے۔ زبان ہسپانوی ہے۔ لوگ عام طور پر رومن کیتھولک عقیدے کے عیسائی ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ بیان کی جاتی ہے۔[1] یہ زیادہ تر فلسطین، جنوبی لبنان اور شام کے تارکین وطن ہیں۔ ۱۸۹۱ء میں سب سے پہلے لبنانی، کولمبیا آئے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد زیادہ تعداد میں آنا شروع ہوئے۔ اکثریت عیسائی عربوں کی ہے، جن کی تعداد ڈھائی لاکھ ہے۔[2] عیسائی عرب اقتصادی طور پر مسلمان عربوں سے بہتر ہیں۔

مسلمانوں کی مذہبی حالت بھی کافی خراب ہے۔ پورے ملک میں نہ کوئی مسجد ہے اور نہ کوئی مستند عالم۔ کولمبیا میں دو عرب ملکوں یعنی مصر اور لبنان کے سفارت خانے ہیں۔ مسلمان زیادہ تر ملک کے جنوبی علاقے میں رہتے ہیں۔ دارالحکومت بوگوٹا میں ان کی تعداد کم ہے۔ بہت سے مسلمانوں نے مقامی عورتوں سے شادیاں کرلی ہیں۔ ایک عرب کولمبیائی کلب بھی ہے لیکن اس کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔[3]

---

(۱) اردو ڈائجسٹ، لاہور۔ اگست ۱۹۸۱ء

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً

پیرو

پیرو کا رقبہ چار لاکھ ۹۶ ہزار مربع میل اور آبادی (۱۹۷۸ء) ایک کروڑ ۶۸ لاکھ ہے۔ لیمادارالحکومت ہے۔ ہسپانوی زبان بولی جاتی ہے۔ نوے فیصد آبادی کیتھولک عقائد کی پیرو ہے۔ یہودیوں کی تعداد صرف پانچ ہزار ہے۔ مسلمانوں کی تعداد بھی پانچ ہزار بیان کی جاتی ہے۔

مسلمان آبادی ان عربوں پر مشتمل ہے جو انیسویں صدی کے آخر میں شام، لبنان اور فلسطین سے آئے تھے اس زمانے میں یہ ملک ترکوں کی سلطنت عثمانیہ میں شامل تھا اس لیے یہ عرب سلطنت عثمانیہ کے پاسپورٹ پر آئے تھے۔ اسی وجہ سے اہل پیرو ان کو اب تک ترک کہتے ہیں۔ [1] ان اولین آبادکاروں کی اکثریت عیسائی تھی۔ مسلمان بہت کم تعداد میں تھے۔ ان عربوں کی اکثریت کاشت کار یا مزدور تھی، لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے تجارت اختیار کر لی۔ انھوں نے کپڑے کی تجارت کی طرف خصوصی توجہ دی اور جلد ہی کپڑے کے کارخانوں کے مالک بن گئے۔ اس وقت فلسطینی عربوں کا ایک مسیحی خاندان اسٹوروں کے ایک وسیع سلسلے کا مالک ہے جو (scala) کہلاتا ہے۔

عیسائیوں کے برخلاف مسلمان معاشی لحاظ سے پست ہیں۔ ان کی اکثریت چھوٹے دوکانداروں کی ہے۔ پورے ملک میں نہ کوئی مسجد ہے اور نہ دینی مدرسہ، دارالحکومت لیما میں حکومت نے اسلامی مطالعہ کا ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کیا ہے جس کے صدر رفائل گویوارا بازان (Rafael Guevara Bazan) ہیں۔ انھوں نے جدہ میں مسلمان اقلیتوں کے انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ جرنل میں ایک خط میں مذکورہ بالا معلومات فراہم کرنے کے بعد لکھا ہے کہ پیرو کی مسلمان اقلیت کے لئے ایک خصوصی فنڈ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت ایک عرب فنڈ موجود ہے

---

(۱) جرنل (جدہ یونیورسٹی) موسم سرما ۱۹۸۰ء و موسم گرما ۱۹۸۱ء

جس سے عیسائی عرب استفادہ کرتے ہیں۔ پیرو کے اسلامی مطالعہ کے انسٹی ٹیوٹ نے شاہ خالد کی توجہ اسی طرف دلائی ہے اور منصوبہ کی تکمیل کے لیے شاہ خالد سے مالی امداد کی درخواست کی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے صدر نے لکھا ہے کہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق پیرو میں مسلمانوں کی تعداد ۱۹۶ تھی۔ جن میں ایک سو پانچ مرد اور ۹۱ عورتیں تھیں۔ ۱۹۷۲ء کی مردم شماری میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ خانہ مخصوص نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے ان کو دیگر مذاہب کے تحت درج کیا گیا۔ اسلامی انسٹی ٹیوٹ نے اس غلطی کی نشاندہی کر دی تھی لیکن پھر بھی تصحیح نہیں کی جا سکی۔ [1]

محمد سمیع اللہ کی تحقیق کے مطابق پیرو میں مسلمانوں کی تعداد پانچ ہزار ہے۔ لیکن وہ بہت ناگفتہ حالت میں ہیں۔ نہ تو وہ متحد ہیں اور نہ ان کو دین کی فکر ہے۔ شروع میں آنے والے بہت اچھے مسلمان تھے۔ ان کی تبلیغ سے مقامی لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ لیکن اب مسلمانوں کی نئی نسل تشویش ناک حد تک مذہب سے بیگانہ ہے۔ جمعہ اور عیدین کی نمازوں کا بھی کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ مسلمانوں کی بے حسی کے باعث یہاں بہائی مذہب تقویت حاصل کر رہا ہے۔ پیرو کے ایک نومسلم محمد علی لوئی کاسترو نے جو آجکل اسلامی یونیورسٹی مدینہ میں زیر تعلیم ہیں، توجہ دلائی ہے کہ وہاں مسلم اساتذہ اور مبلغین کی اشد ضرورت ہے تاکہ مذہب سے برگشتہ مسلمانوں کو اسلام کی طرف واپس لایا جائے۔ پیرو کے ریڈ انڈین منتظر ہیں کہ کوئی انھیں اسلام کا راستہ دکھائے۔ [2]

---

(۱) دی جرنل (انگریزی) جدہ۔ موسم سرما ۱۹۸۰ء و موسم گرما ۱۹۸۱ء۔

(۲) اردو ڈائجسٹ، لاہور۔ اگست ۱۹۸۱ء

بولیویا

بولیویا کا ملک برازیل اور پیرو کے درمیان واقع ہے اور جنوبی امریکہ کا ایسا ملک ہے جو چاروں طرف خشکی سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں بھی ہندی باشندے آباد تھے جن سے ہسپانیہ کے لوگوں نے ۱۵۳۰ء کے بعد یہ ملک چھینا۔ ۶ اگست ۱۸۲۵ء کو آزادی حاصل ہوگئی۔ آزادی کے راہنما سائمن بولیوار کے نام پر ملک کا نام بولیویا رکھا گیا۔ جنوبی امریکہ کے کئی ملکوں کی طرح یہاں کی آبادی بھی مخلوط ہے۔ ۵۵ فیصد آبادی قدیم باشندوں پر مشتمل ہے۔ تیس فیصد لوگ مخلوط نسل سے ہیں اور دس پندرہ فیصد یورپی باشندے ہیں، جن کی اکثریت ہسپانوی ہے۔ ہسپانوی زبان کو سرکاری حیثیت حاصل ہے لیکن ملک میں مقامی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ مذہب عام طور پر رومن کیتھولک ہے۔ یہودیوں کی تعداد صرف دو ہزار ہے۔

بولیویا کا رقبہ چار لاکھ ۲۴ ہزار مربع میل اور آبادی (۱۹۷۸ء) پچاس لاکھ سے کچھ زیادہ ہے۔ دارالحکومت لاپاز ہے۔

دارالحکومت لاپاز میں دس عرب مسلم خاندان آباد ہیں۔ کچھ مسلمان سانتا کروز میں بھی ہیں جو ملک کا دوسرا اہم شہر ہے۔ لیکن یہاں نہ کوئی مسجد ہے اور نہ کوئی اسلامی سرگرمی دیکھنے میں آتی ہے۔ ایک نوجوان مسلمان بیاب خلیل (پوسٹ بکس نمبر ۲۱۶۔ لاپاز) اسلام کے لیے اس ملک میں کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ [1]

---

(۱) اردو ڈائجسٹ، لاہور۔ اگست ۱۹۸۱ء

برازیل

جنوبی امریکہ کا یہ سب سے بڑا ملک سوویٹ یونین، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور کنیڈا کے بعد رقبہ میں دنیا کا چوتھا سب سے بڑا اور آبادی میں دنیا کا ساتواں سب سے بڑا ملک ہے۔ مغربی قوموں میں یہاں سب سے پہلے پرتگالی پہنچے۔ پیڈرو الوارس کبرال (Pedro Alvares Cabral) وہ پہلا پرتگالی جہاز راں ہے جس نے ۱۵۰۰ء میں برازیل کی سرزمین پر قدم رکھا۔ اس وقت یہاں دریائے امیزن کی وادی میں سرخ ہندی باشندوں کی آبادیاں منتشر حالت میں پائی جاتی تھیں باقی سارا ملک گھنے جنگلوں سے پٹا پڑا تھا اور غیر آباد تھا۔ اس کے بعد پرتگالی باشندے آکر آباد ہونا شروع ہو گئے۔ ۱۵۴۹ء میں یہاں پہلے پرتگالی گورنر کا تقرر کیا گیا۔ پرتگالی چونکہ تعداد میں کم تھے اس لیے وہ افریقہ سے غلاموں کو لاکر ان سے زمینوں پر کام لینے لگے۔ اس طرح برازیل میں پرتگالیوں کے ساتھ ساتھ افریقی آبادی بھی بڑھتی گئی۔ [1] جب نپولین کی فوجوں نے پرتگال پر قبضہ کر لیا تو شاہ پرتگال بھاگ کر ۱۸۰۸ء میں برازیل آ گیا۔ بعد میں بادشاہ واپس چلا گیا، لیکن اس کے لڑکے پیڈرو نے ۷۔ ستمبر ۱۸۲۲ء کو اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور برازیل کو ایک آزاد مملکت قرار دے دیا۔ اس کے جانشین ڈوم پیڈرو ثانی کو ۱۸۸۹ء میں معزول کر دیا گیا اور برازیل کو جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔ پہلے اس ریاست کا نام ریاستہائے متحدہ برازیل رکھا گیا پھر ۱۹۶۷ء میں اس کا نام وفاقی جمہوریہ برازیل کر دیا گیا۔ پہلے رایودی جنیرو صدر مقام تھا۔ ۲۱۔ اپریل ۱۹۶۰ء سے برازیلیہ دارالحکومت ہے۔ برازیل کا رقبہ ۳۲ لاکھ ۸۶ ہزار مربع میل اور

---

(۱) یہ افریقی مزدور شکر، روئی، کافی اور پھلوں کی کاشت کے لیے لائے گئے تھے۔ لیکن ان میں ملاح، کاریگر اور معمار بھی تھے۔ جب پرتگالیوں اور ہسپانویوں کو پتہ چلا کہ ان میں مسلمان بھی ہیں تو انھوں نے سارے لاطینی امریکہ میں چھوٹے چھوٹے محکمۂ احتساب قائم کر دیئے اور اس طرح مسلمانوں کو جنوبی امریکہ سے نیست و نابود کر دیا۔ (جرنل، جدہ یونیورسٹی موسم سرما ۱۹۸۰ء وموسم گرما ۱۹۸۱ء)

آبادی (۱۹۸۰ء) گیارہ کروڑ نوے لاکھ ہے۔ تقریباً ۶۲ فیصد لوگ گوری نسل سے ہیں۔ گیارہ فیصد افریقی ہیں اور ½۲۶ مخلوط نسل سے ہیں اور ملاٹوز (mulattoes) کہلاتے ہیں۔ پانچ لاکھ سے زیادہ ایشیائی بھی ہیں جن کی اکثریت عرب ہے۔ زبان پرتگالی ہے اور نوے فیصد باشندے رومن کیتھولک عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہودیوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ ہے۔

برازیل میں اس وقت مسلمانوں کی ایسی کثیر تعداد موجود ہے جن کے اجداد غلاموں کی تجارت کے زمانے میں افریقہ سے لائے گئے تھے۔[1] ان مسلمانوں کو دوسرے افریقی غلاموں کی طرح عام طور پر ان کے ہم قبیلہ لوگوں کے ساتھ رکھا جاتا تھا۔ یہ مسلمان زیادہ تر ہاوسا، منڈنگو، اور کنوری قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے یوروبا قبیلے کے لوگوں کو مسلمان کرنے کی کوشش بھی کی۔ یہ لوگ باہیا، رایودی جنیرو، ماریانو اور مانیاس جوراس (manusjoras) کے صوبوں میں جمع ہو گئے تھے۔ یہ مسلمان خود کو منتخب اور شرفا کے طبقے سے تصور کرتے تھے۔ صوبہ باہیا میں خاص طور پر ہاوسا اور یوروبا مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ یہ لوگ اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے تھے اور اپنا ایک مذہبی اور قانونی نظام قائم کیے ہوئے تھے۔ رایودی جنیرو کے علاقے میں مسلمانوں کو الوفا (alufa) کہا جاتا تھا جب کہ برازیل کے باقی حصوں میں ان کو مالے (male) کہا جاتا تھا۔

برازیل کے مسلمانوں نے ۱۸۳۵ء تک اپنی غلاموں کی جھونپڑا بستیوں میں اور آزاد شدہ نے غلاموں کے گھروں میں قرآنی مدرسے قائم کر رکھے تھے ایک عالم یا معلم کو تلاش کرنے کے لیے آزاد مسلمان ایک ضلع سے دوسرے ضلع تک چکر لگاتے رہتے تھے۔ ان میں جو دولت مند مسلمان ہوتے تھے وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے افریقہ تک جاتے تھے۔ یہ تمام مسلمان فقہ مالکی کے پیرو تھے۔ معلمی کے فرائض عام طور پر فولانی اور ہاوسا باشندے انجام دیتے تھے جو مقامی بھی ہوتے

(۱) برازیل کے افریقی مسلمانوں کے بارے میں اس مضمون میں جو معلومات فراہم کی گئی ہیں ان کا ماخذ حسب ذیل دو مضامین ہیں: ایک امریکی مسلمان محقق کلائیڈ احمد ونٹرس (Clyde Ahmed Winters) کا مضمون جو ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ اسلامیہ دہلی کے سہ ماہی جریدے ''اسلام اینڈ دی موڈرن ایج'' نومبر ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا رولف رائی شرٹ (rolf reichert) کا مضمون ہے جو شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی، جدہ کے مسلمان اقلیتوں کے امور کے انسٹی ٹیوٹ کے ترجمان جرنل (انگریزی) اشاعت موسم سرما ۱۹۸۰ء اور موسم گرما ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا۔ رولف رائی شرٹ فیڈرل یونیورسٹی آف باہیا میں افریقہ اور مشرق کے مرکز مطالعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

تھے اور افریقہ سے بھی آتے تھے۔ ان ہی میں ایک عالم محمد عبداللہ تھے جو نائیجیریا کے صوبہ کٹسینا کے رہنے والے تھے اور فولانی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا پیشہ نجاری تھا۔ اس کام سے انھوں نے اتنی رقم پس انداز کر لی کہ اس کو دے کر انھوں نے ۱۸۱۸ء میں آزادی حاصل کر لی۔ انھوں نے بعد میں حج بھی کیا۔

شہر سلوادور جس کو پہلے باہیا کہا جاتا تھا اسلامی مطالعہ کا مرکز تھا اور یہاں شرعی عدالتیں بھی قائم تھیں۔ برازیل کے امام اعظم بھی جن کو امام حمادو (Hammadou) کہا جاتا تھا اسی شہر میں رہتے تھے۔ برازیل کے ہر شہر میں جہاں مسلمان رہتے تھے ان کا ایک امام ضرور ہوتا تھا جو جمعہ کی نماز میں امامت کرتا تھا۔ ہاوسا باشندوں نے سترہویں صدی میں صوبہ ماہیا میں ایک شہر بھی آباد کیا تھا جواب پالمیراس کہلاتا ہے۔[1]

ان افریقی مسلمانوں میں چونکہ قیادت کی صلاحیت تھی اس لیے انھوں نے غلاموں کی کئی بغاوتوں میں رہنمائی کا فرض انجام دیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے آخری بڑا جہاد ۱۸۳۵ء میں کیا جس سے ان کا مقصد ایک خاتون امام کے تحت ایک اسلامی ریاست قائم کرنا تھا۔ اس جہاد کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کو سختی سے کچل دیا گیا۔ ان کی ایک بڑی تعداد افریقہ واپس چلی گئی، جہاں انھوں نے بنین، نائیجیریا، گیمبیا اور سیرالیون میں تجارتی مراکز قائم کر لیے۔ مسلمانوں کی ایک تعداد برازیل ہی میں رہی اور بعد میں کچھ مسلمان واپس بھی آ گئے۔ ۱۹۰۸ء میں اندازہ لگایا گیا تھا کہ صوبہ باہیا میں دس ہزار مسلمان ہیں جو خود کو پوشیدہ رکھے ہوئے ہیں کیونکہ ۱۹۴۰ء تک جب بھی برازیل میں کسی افریقی گروہ کے مسلمان ہونے کا پتہ چلتا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے مذہبی رسوم پر عمل پیرا ہے تو اس کو گرفتار کر لیا جاتا تھا۔

رولف رائی شرٹ لکھتے ہیں کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں ان سیاہ فام برازیلی باشندوں میں اسلام کو زوال آ گیا۔ ۱۸۸۸ء میں غلامی کے خاتمہ کے ساتھ اسلام بھی ختم ہو گیا۔ بہت سے مسلمان عیسائی ہو گئے یا انھوں نے قبل از اسلام کے قبائلی رسوم اختیار کر لیے۔ لیکن ان

---

(۱) مزید تفصیل کے لیے کلائیڈ احمد ونٹرس کے مضمون کا اردو ترجمہ روزنامہ جسارت، کراچی مورخہ ۵۔ اکتوبر ۱۹۸۲ء میں ملاحظہ کیجیے۔

باشندوں میں اسلام کے اثرات آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

لیکن کلائیڈ احمد ونٹرس لکھتے ہیں کہ ''مسلمانوں کی ایک تعداد برازیل ہی میں رہی اور اس کی دستاویزی شہادتیں موجود ہیں کہ بعد میں کچھ مسلمان واپس بھی آ گئے۔ ۱۹۰۸ء میں اندازہ لگایا گیا تھا کہ صوبہ باہیا میں دس ہزار مسلمان ہیں جو خود کو پوشیدہ رکھے ہوئے ہیں کیونکہ ۱۹۴۰ء تک جب بھی برازیل میں کسی افریقی گروہ کے مسلمان ہونے کا پتہ چلتا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے مذہبی رسوم پر عمل کرتا ہے تو اس کو گرفتار کرلیا جاتا تھا۔ میرے پاس اب بھی ایسی قابل ذکر شہادتیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ باہیا میں اب بھی مسلمان موجود ہیں۔ ان مسلمانوں میں ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو باہیا میں خاص طور پر سالوادور میں کافی طاقت کی مالک ہے اور برازیل میں سیاہ اقتدار کی جو تحریک چل رہی ہے اس میں سرگرم عمل ہے۔ رایو دی جنیرو میں بھی مسلمان موجود ہیں لیکن ان کی تعداد کم ہے اور ان کی حالت پست ہے۔ ۱۹۲۴ء کے بعد بعض افریقی باشندوں نے احمدیت بھی اختیار کرلی ہے۔ برازیل میں نسل پرستی اور مذہبی تعصب کی وجہ سے مسلمان اپنے عقائد کو پوشیدہ رکھتے ہیں اور اسلام پر چھپ کر عمل کرتے ہیں۔ لیکن توقع ہے کہ برازیل میں مجوزہ شاہ فیصل مسجد کی تعمیر کے بعد مسلمان زیادہ تعداد میں نظر آنا شروع ہوجائیں گے۔''

محمد علی کیتانی نے لکھا ہے کہ ''آج بھی برازیل کے صوبے ماہیا میں بعض کالے خاندان اسلام پر قائم ہیں۔ اقتصادی طور پر وہ بہتر حالت میں ہیں۔ البتہ اسلامی طرز زندگی کے لیے مدد کے متلاشی ہیں۔ اگر نظم وتحمل سے اس علاقے میں تبلیغی کام کیا جائے تو بیشتر حبشی آبادی اسلام کے دائرے میں دوبارہ داخل ہوسکتی ہے۔''[1]

پچھلی صدی کے آخر سے لبنان اور شام کے عربوں کی ایک بڑی تعداد لاطینی امریکہ میں آباد ہونا شروع ہوگئی تھی جس کا سلسلہ موجودہ صدی کے آغاز تک جاری رہا۔ کتانی نے ان عربوں کی تعداد چالیس لاکھ لکھی ہے جن میں دس لاکھ مسلمان ہیں۔ غالباً یہ تعداد مبالغہ آمیز ہے۔ رائی شرٹ نے یہ تعداد بیس لاکھ بتائی ہے۔ جن میں تین لاکھ ۸۵ ہزار مسلمان ہیں۔ ان میں صرف

---

(۱) اردو ڈائجسٹ لاہور۔ اگست ۱۹۸۱ء۔

برازیل میں ایک لاکھ اکیس ہزار مسلمان ہیں۔[1] رائی شرٹ نے یہ بھی لکھا ہے کہ موجودہ صدی کے آغاز میں یہ لوگ پورے براعظم میں منتشر تھے، لیکن اب وہ زیادہ سے زیادہ شہروں میں جمع ہوگئے ہیں۔ عام طور پر مسلمان اپنی مذہبی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔ ان کی انجمنیں، کلب اور رسالے ہیں۔ ساؤ پالو میں ان کی مسجد بھی ہے۔[2]

موتمر عالم اسلامی کے کتابچے کے مطابق برازیل میں مسلمانوں کی تعداد دو لاکھ ہے اور وہ عرب ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ پورے ملک میں منتشر ہیں لیکن سب سے زیادہ ساؤ پالو میں ہیں۔ اس کے بعد وہ رایو دی جنیرو، لندرینا (Londrina) اور برازیلیہ میں ہیں۔ چند مسجدیں ہیں۔ سب سے بڑی جامع مسجد ساؤ پالو میں ہے۔ ایک عمدہ مسجد حال ہی میں لندرینا میں تعمیر ہوئی ہے اور رایو دی جنیرو میں بھی مسجد کا منصوبہ ہے۔[3]

کتانی نے لکھا ہے کہ اب تک برازیل میں بارہ مسجدیں تعمیر کی جاچکی ہیں، ان میں سے ایک ۱۹۶۰ء میں سابق دارالحکومت رایو دی جنیرو میں تعمیر ہوئی تھی۔ برازیل کی سب سے پہلی مسجد ۱۹۵۱ء میں ساؤ پالو[4] میں تعمیر ہوئی تھی جو اس وقت برازیل کا سب سے بڑا شہر ہے۔

برازیل کے ان عرب مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت قابل اطمینان نہیں ہے۔ کتانی نے لکھا ہے کہ ''دو یا تین نسلوں سے یہ مسلمان عرب، اسلام سے کسی قدر بیگانہ ہوگئے ہیں، یہاں تک کہ بعض تو اپنے مذہب کے بنیادی اصولوں سے نابلد ہیں اور بسم اللہ تک درست نہیں پڑھ سکتے۔ مسلم نوجوان نسل برازیلی معاشرے میں مخلوط شادیوں کی وجہ سے مدغم ہوتی جارہی ہے۔ شراب اور عورت، مرد کا آزادانہ اختلاط، مسلم معاشرے کو بھی تباہ کررہا ہے۔ رہن سہن کے طریقے اور لباس میں شائستگی بالکل مفقود ہے۔ کچھ حساس اور مذہب سے لگاؤ رکھنے والے لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ یہ خرابیاں ختم ہوجائیں اور اس ملک میں اسلامی تعداد اور اسلامی ثقافت دوبارہ اجاگر ہوجائے۔ عرب مسلمان زیادہ تر پسماندہ ہیں، عموماً تجارت اور صنعت سے منسلک ہیں۔ قانون

(۱) جرنل (انگریزی) جدہ موسم سرما ۱۹۸۰ء موسم گرما ۱۹۸۱ء

(۲) ایضاً۔

(۳) مسلمان اقلیتیں (انگریزی)، کراچی ۱۹۷۷ء

(۴) اردو ڈائجسٹ، لاہور، اگست ۱۹۸۱ء

ساز اداروں اور ملازمتوں میں ان کی کوئی نمائندگی نہیں۔ اس کے برخلاف عیسائی عرب خوشحال اور باثر ہیں۔ ان کے اپنے ریڈیو، ٹی وی اسٹیشن اور ہفتہ وار اخبارات ہیں۔"[1]

ایک اطلاع کے مطابق برازیل ریڈیو ساد پالو نے روزانہ شام کو ایک گھنٹہ کا اسلامی پروگرام مقامی مسلمانوں کے لیے شروع کر دیا ہے۔ اتوار کی صبح ایک گھنٹہ کا پروگرام پہلے سے ہوتا تھا۔[2]

---

(۱) اردو ڈائجسٹ، لاہور، اگست۔ ۱۹۸۱ء۔

(۲) اسلامک ہیرلڈ (انگریزی) کوالالپور جلد ۴ شمارہ ۷۔ ۸

ارجنٹائن

جنوبی امریکہ میں رقبہ اور آبادی کے لحاظ سے برازیل کے بعد دوسرا بڑا ملک ارجنٹائن ہے۔ ہسپانوی ۱۵۱۵ء کے قریب یہاں پہنچے۔ اس وقت یہاں سرخ ہندی باشندے خانہ بدوشی کی حالت میں تھے۔ امریکہ کے دوسرے ملکوں کی طرح یوروپی باشندوں نے ان کے خلاف مسلسل جنگیں کیں، یہاں تک کہ انیسویں صدی کے آخر میں سرخ ہندی باشندوں کی تقریباً پوری نسل ختم کردی گئی۔ اندازہ ہے کہ اب پورے ملک میں بیس تیس ہزار سے زیادہ سرخ ہندی باشندے موجود نہیں۔ انیسویں صدی کے آخر سے ہسپانویوں کے علاوہ اطالوی اور جرمن باشندے بھی کثرت سے ارجنٹائن میں آباد ہوئے۔ ۱۸۱۶ء میں ارجنٹائن نے اسپین سے آزادی حاصل کرلی۔ اس کے بعد خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا جو ۱۸۵۳ء میں ختم ہوئیں اور ملک میں ایک مستحکم حکومت قائم ہوگئی۔ ارجنٹائن اگرچہ ایک جمہوریہ ہے لیکن کافی عرصہ سے وہاں عملاً فوج حکمراں چلی آرہی ہے۔ بیونس ایرس دارالحکومت ہے۔ ملک کی زبان ہسپانوی ہے۔

ارجنٹائن کا رقبہ دس لاکھ ۷۲ ہزار مربع میل (۲۷ لاکھ ۷۷ ہزار مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) دو کروڑ ۸۷ لاکھ ہے۔ باشندے تقریباً تمام رومن کیتھولک ہیں۔ یہودیوں کی تعداد تین لاکھ ہے۔ باشندے تقریباً تمام رومن کیتھولک ہیں۔ یہودیوں کی تعداد تین لاکھ ہے۔ جنوبی امریکہ میں سب سے زیادہ یہودی اسی ملک میں ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد تین لاکھ اور پانچ لاکھ کے درمیان بتائی جاتی ہے جو تقریباً سب شام، لبنان اور فلسطین کے عرب ہیں۔[1] جو انیسویں صدی کے آخر میں آئے تھے۔ موتمر عالم اسلامی کی اطلاع کے مطابق بعض مقامات پر مسجدیں

(۱) موتمر عالم اسلامی کراچی کے مطابق مسلمان تین لاکھ سے کچھ زیادہ ہیں، جبکہ محمد سمیع اللہ نے اردو ڈائجسٹ اگست ۱۹۸۱ء میں غالباً کتانی کی کتاب کے حوالہ سے پانچ لاکھ لکھا ہے اور عیسائی عربوں کی تعداد پندرہ لاکھ لکھی ہے جو مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے۔

ہیں، لیکن بعض مسجدوں میں مستقل امام یا عملہ نہیں ہے۔صدر مقام بیونس ایرس میں اسلامی مرکز میں مسجد ہے۔دوسری مسجدیں کورڈوبہ اور دوسرے مقامات پر ہیں۔اسلامی شخصی قوانین نہ تو نافذ ہیں اور نہ مسلمان ان پر عمل کرتے ہیں۔بنیادی اسلامی تعلیم دلانے کا کوئی انتظام نہیں۔مسلمان عام طور پر تاجر ہیں۔

ارجنٹائن کے مسلمانوں سے متعلق حاصل ہونے والی معلومات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت برازیل کے عرب مسلمانوں سے بھی زیادہ خراب ہے۔ محمد سمیع اللہ لکھتے ہیں کہ:

''ارجنٹائن کے مسلمانوں نے مغربی طرز زندگی اپنا لیا ہے۔اکثریت کو مذہب کی بہت کم معلومات ہے۔عربی زبان جاننے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔بیونس آئرس میں مسلمانوں کی ایک شاندار عمارت اسلامی مرکز کے طور پر استعمال کی جاتی ہے، لیکن اس میں شاذونادر ہی کوئی اسلامی سرگرمی دیکھنے میں آتی ہے۔ماسوا جمعہ کی نماز کے جس میں تیس سے چالیس نمازی شریک ہوتے ہیں۔چالیس بچے جن میں زیادہ تر عیسائی ہیں اس مرکز میں عربی زبان سیکھتے ہیں۔دینی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں۔موجودہ امام صاحب کو دارالافتاء ریاض (سعودی عرب) نے بھیجا ہے۔نام ارشاد اعظمی ہے اور لکھنؤ سے تعلق رکھتے ہیں۔مسلمانان ارجنٹائن کی مذہبی حالت بے حد تشویش ناک ہے۔اگرچہ وہ کافی آسودہ حال ہیں، لیکن اس طرف توجہ نہیں دیتے۔۱۹۸۰ء میں برازیل سے آٹھ افراد نے حج کیا تھا لیکن ارجنٹائن سے کوئی حج کو نہیں گیا۔[1]

قرآن کریم کا ہسپانوی زبان میں ترجمہ ایک عیسائی رافیل کیسٹیانوس اور ایک مسلم شیعہ عالم احمد عبود نے مل کر کیا ہے۔یہ بغیر متن کے چھاپا گیا ہے اور اس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ ترجمہ کی صحت کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ اغلاط سے پاک نہیں۔[2]

محمد سمیع اللہ نے اپنے مضمون میں ایک اور اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ اس وقت ارجنٹائن اور برازیل بہت بڑی مقدار میں یخ بستہ گوشت عرب ممالک کو برآمد کر رہے

(۱) اردو ڈائجسٹ، لاہور۔اگست ۱۹۸۱ء

(۲) ایضاً

ہیں۔ یہ گوشت صحیح طور پر مسلمانوں کے لیے حلال نہیں کیونکہ یہاں جانور اسلامی شریعت کے مطابق ذبح نہیں کیے جاتے۔ برآمد کرنے والے ادارے چالاکی سے اپنی اشیاء پر حلال کا لفظ لکھ دیتے ہیں، حالانکہ ان کے ہاں کوئی مسلم قصاب یا نگران نہیں۔

یہودیوں کی آبادی اگرچہ مسلمانوں کے برابر ہے، گرچہ ان کی ساٹھ عبادت گاہیں اور نوے اسکول ہیں۔[1]

---

(1) اردو ڈائجسٹ، اگست ۱۹۸۱ء

چلی

چلی بحر الکاہل کے کنارے اور ارجنٹائن کے مغرب میں واقع ہے۔ ہسپانوی باشندوں کے آنے سے پہلے چلی کے شمالی حصے قدیم ہندی باشندوں انکا کی سلطنت کا حصہ تھے۔ اسپین نے ۱۵۴۰ء میں قبضہ کیا۔ ۱۸۱۸ء میں چلی نے آزادی حاصل کرلی۔ سان ٹیاگو دارالحکومت ہے۔

چلی کا رقبہ دو لاکھ ۸۶ ہزار مربع میل (½۷ لاکھ مربع کلومیٹر) اور آبادی (۱۹۸۰ء) ایک کروڑ گیارہ لاکھ ہے۔ ۶۶ فیصد باشندے ہسپانوی اور ہندی باشندوں کے درمیان شادی بیاہ کی وجہ سے مخلوط نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہسپانوی ۲۵ فیصد ہیں اور خالص ہندی ۵ فیصد۔ سرکاری زبان ہسپانوی ہے۔ نوے فیصد لوگ کیتھولک عیسائی ہیں۔ یہودیوں کی تعداد ۲۷ ہزار ہے۔

چلی کے مسلمانوں کے بارے میں محمد سمیع اللہ لکھتے ہیں:

> ''یہاں تقریباً دو ہزار مسلمان رہتے ہیں جو موجودہ صدی کے پہلے دو عشروں میں شام، فلسطین اور لبنان سے ترک وطن کر کے یہاں آباد ہوئے ان میں سے اکثر نے چلی کی عیسائی عورتوں سے شادیاں کرلیں اور شاید یہ اسی اختلاط کا اثر ہے کہ وہ غیر مسلم معاشرے میں جذب ہوتے جارہے ہیں۔''

چلی کے مسلمانوں کی ایک سوسائٹی قائم ہے جس کے صدر ایک شامی مسلمان توفیق رومیا ہیں۔ کچھ علامتی امداد رابطۂ عالم اسلامی سے ملتی ہے جس سے وہ بمشکل اس مکان کا کرایہ ادا کرتے ہیں جو ان کے دفتر اور رہائش گاہ کا کام دیتا ہے۔ جمعہ کی نماز ان کے رہائشی کمرے میں ہوتی ہے۔ مصر کے ڈاکٹر عبدالسلام امامت کرتے ہیں جو سینٹ یاگو یونیورسٹی میں عربی کے استاد ہیں۔ چلی کے مسلمان اپنے بچوں کے مستقبل کی طرف سے فکرمند ہیں۔ وہ ایک مسجد اور اسکول بنانے کی

کوشش کررہے ہیں۔ اگر ان مسلمانوں کی مذہبی، تعلیمی اور اسلامی زندگی کی طرف رہنمائی پر توجہ نہ دی گئی تو اس بات کا خطرہ ہے کہ رواں صدی کے آخر تک وہ اپنا وجود کھودیں گے۔ چلی میں سعودی عرب مصر اور شام کے سفارت خانے موجود ہیں۔''[1]

---

(1) اردو ڈائجسٹ، لاہور۔ اگست ۱۹۸۱ء

ضمیمہ

تحریک اتحاد اسلام اور بین الاقوامی اسلامی ادارے اور تنظیمیں

اسلام میں اگرچہ مسلمانوں کے باہمی اتحاد و اتفاق پر زور دیا گیا ہے اور انتشار اور افتراق سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے لیکن اس کے باوجود مسلمان افتراق کے اس فتنہ کا جلد ہی شکار ہو گئے۔ دعوت اسلامی کے آغاز کو ابھی ۴۵ سال ہی ہوئے تھے اور اسلامی جماعت کے سیاسی ڈھانچے کی تشکیل کے بعد صرف ۳۵ سال گزرے تھے کہ تیسرے خلیفہ راشد حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے اور اس طرح تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ خانہ جنگی کا آغاز ہوا، جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ ۶۶۱ء/ ۴۱ھ میں حضرت حسینؓ کی دانش مندی اور ایثار نے مسلمانوں کے منتشر شیرازہ کو بظاہر پھر ایک لڑی میں پرو دیا لیکن اختلاف اور افتراق کی جو بنیاد پڑ چکی تھی وہ بڑھتی ہی رہی۔ انتشار اور افتراق کی ان قوتوں کے باوجود مسلمان ۷۵۰ء/ ۱۳۲ھ تک ایک سیاسی ڈھانچہ کے تحت متحد اور منظم رہے، لیکن اس سال بنی امیہ کی نام نہاد خلافت کے خاتمہ کے ساتھ یہ سیاسی اتحاد بھی ختم ہو گیا۔ ۷۵۶ء/ ۱۳۸ھ تک اسلامی دنیا دو سیاسی وحدتوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک بغداد کی عباسی خلافت اور دوسری اندلس کی امارت ۷۸۵ء/ ۱۶۹ھ میں مراکش میں ادریسی خاندان کی حکومت کے قیام کے بعد اسلامی دنیا تین حکومتوں میں تقسیم ہو گئی یہ صورت حال تقریباً ایک سو سال اور قائم رہی، اس کے بعد یعنی تیسری صدی ہجری کے نصف آخر سے اسلامی دنیا شدید طوائف الملوکی کا شکار ہو گئی اور وہ خطہ جو ایک سو بتیس سال تک ایک سیاسی وحدت کے تحت رہا اب اس میں بے شمار حکومتیں قائم ہو چکی تھیں۔ یہ صورت حال آج تک قائم ہے۔ اور اسلامی دنیا اس وقت کم و

بیش چالیس آزاد اور متعدد نیم آزاد اور غلام سیاسی وحدتوں میں تقسیم ہے۔

مسلمانوں کو جب تک عروج حاصل رہا، انھوں نے اتحاد کی ضرورت کو کبھی سنجیدگی سے محسوس نہیں کیا، صلیبی جنگیں، اندلس کا المیہ اور تاتاریوں کی یلغار، ان میں سے کوئی بھی مسلمانوں کو اتحاد کی طرف مائل نہ کر سکا۔ یہ سب مقامی اور وقتی حادثے تھے۔ ہر علاقے کے مسلمانوں نے ان کا کسی نہ کسی طرح سامنا کر لیا اور خطروں کو دور کر دیا۔ ان خطروں کے ٹلنے کے بعد مسلمان پہلے سے بھی زیادہ قوت کے مالک بن گئے۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں کو ایک ہزار سال تک کسی ایسے خطرے کا سامنا نہیں کرنا پڑا جو پوری ملت اسلامیہ کے لیے تباہ کن ہو، لیکن ۱۶۹۹ء میں کارلووٹز کے معاہدے کے بعد، جس کے تحت عثمانی ترکوں کو ہنگری سے دست بردار ہونا پڑا، مسلمان یورپ کے مقابلے میں ایسی پسپائی پر مجبور ہوئے کہ جس کا سلسلہ ۱۹۱۸ء میں پہلی عالمی جنگ کے خاتمے تک پورے دوسو انیس سال جاری رہا۔

مغرب کی طرف سے ظہور میں آنے والا یہ خطرہ پچھلے تمام خطروں سے مختلف تھا۔ اندلس سے مسلمانوں کے اخراج، صلیبی جنگوں اور تاتاریوں کی یلغار سے جو خطرے پیدا ہوئے تھے یہ نیا خطرہ ان سب سے بڑا تھا۔ یہ خطرہ اسلامی دنیا کے کسی ایک حصہ تک محدود نہ تھا بلکہ اس کی زد میں پوری اسلامی دنیا تھی۔ اس خطرے نے ساری اسلامی دنیا کو ہلا دیا اور سارے اسلامی ملکوں کو مغرب کی غلامی پر مجبور کر دیا۔ پھر یہ خطرہ سابقہ خطروں کی طرح صرف سیاسی نوعیت کا نہیں تھا بلکہ ثقافتی خطرہ بھی تھا۔ اس نے پوری اسلامی تہذیب اور اسلامی اقدار کو ایک چیلنج دے رکھا تھا اور مسلمان زندگی کے ہر محاذ پر مغربی تہذیب کے مقابلے میں پسپا ہو رہے تھے۔ اس کے مقابلہ میں ملت اسلامیہ کا پورا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا۔ یورپ یا مغرب کی طرف سے آنے والے اس مہیب خطرے کی سنگینی کے پیش نظر مسلمانوں نے پہلی مرتبہ اپنے زوال کے اسباب کی نشاندہی کرنے، اور اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے اتحاد کی ضرورت محسوس کی۔ جمال الدین افغانی (۱۸۳۹ء تا ۱۸۹۷ء) پہلے رہنما تھے جنھوں نے مغرب کے بڑھتے ہوئے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے اتحاد کی ضرورت کو محسوس کیا اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مسلمانوں میں اتحاد کی اس ضرورت کا احساس بھی بڑھتا گیا۔ روس میں اسماعیل گسپر الی (۱۸۵۱ء تا ۱۹۱۴ء) نے، ترکی میں عاکف، اشرف ادیب، سعید نورسی اور نجم الدین اربکان نے، عرب ملکوں میں احمد شوقی (مصر)،

امیر شکیب ارسلان، مفتی اعظم فلسطین، اخوان المسلمون کے رہنماؤں اور شاہ فیصل نے اسلامی ہند اور پاکستان میں مولانا ابوالکلام، مولانا محمد علی، اقبال، مولانا مودودی اور ابوالحسن علی ندوی نے اور انڈونیشیا میں ڈاکٹر ناصر نے اتحاد اسلام کی اس تحریک کو پروان چڑھانے میں نمایاں حصہ لیا۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں مختلف ملکوں کے مسلمان غیر سرکاری سطح پر یکجا ہونا شروع ہوئے۔ سرکاری سطح پر مسلمان یکجا ہو ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ تمام اسلامی ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ سلطان عبدالحمید نے پہلی مرتبہ سرکاری سطح پر اتحاد اسلام کی تحریک کو مضبوط بنانا چاہا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ صیہونی سازش کا شکار ہو گئے اور خود ترک قوم پرستوں نے ان کو ۱۹۰۸ء میں معزول کر دیا۔

اتحاد اسلامی کو تقویت دینے کے سلسلے میں ۱۹۰۸ء سے ۱۹۶۲ء تک جو بین الاقوامی اسلامی اجتماعات ہوئے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) ۱۹۰۸ء میں پہلی بین الاقوامی [1] اسلامی کانفرنس قاہرہ میں ہوئی تھی۔ یہ کانفرنس روس کے عظیم مسلمان رہنما اسماعیل گسپر الی کی کوششوں سے ہوئی تھی لیکن وہ خود اس میں شریک نہ ہو سکے۔

(۲) ۱۹۲۶ء میں دوسری اسلامی کانفرنس مکہ میں ہوئی۔ اس کو سلطان ابن سعود نے طلب کیا تھا۔ یہ پہلی کانفرنس تھی جس کو موتمر عالم اسلامی کا نام دیا گیا تھا۔

(۳) ۱۹۲۷ء میں علمائے ازہر کی کوششوں سے تیسری اسلامی کانفرنس ۱۳، تا ۱۹، مئی قاہرہ میں ہوئی۔

(۴) ۱۹۳۱ء میں چوتھی بین الاقوامی اسلامی موتمر مفتی اعظم فلسطین الحاج امین الحسینی کی کوششوں سے ۶۔ ستمبر سے ۱۵۔ ستمبر ۱۹۳۱ء تک بیت المقدس میں ہوئی۔ اس میں پاکستان اور اسلامی ہند سے علامہ اقبال اور مولانا شوکت علی نے شرکت کی تھی۔

(۵) ۱۹۳۵ء میں پانچویں اسلامی کانفرنس جنیوا (سوئٹزرلینڈ) میں ہوئی۔ اسے شامی رہنما

---

(۱) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پہلی بین الاقوامی کانفرنس شام کے ممتاز قوم پرست رہنما عبدالرحمن الکواکبی نے ۱۸۹۷ء میں حج کے موقع پر طلب کی تھی، لیکن یہ صرف چند عرب ملکوں تک محدود تھی۔ مجھے اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

امیر شکیب ارسلان نے طلب کیا تھا۔ اس میں یورپ کے ملکوں سے مسلمان رہنما کثرت سے آئے۔

(٦) ۱۹۴۹ء میں چھٹی بین الاقوامی اسلامی کانفرنس کراچی میں ہوئی۔ اس کو ایک مقامی تنظیم جمعیت اخوت الاسلامیہ نے طلب کیا تھا۔ یہ کانفرنس ۱۸۔ مئی تا ۱۹۔ مئی مولانا شبیر احمد عثمانی کی صدارت میں ہوئی۔

(٧) اسی سال یعنی ۱۹۴۹ء میں ۲۵۔ نومبر سے ۱۰۔ دسمبر تک کراچی میں پہلی بین الاقوامی اقتصادی اسلامی کانفرنس کراچی میں ہوئی، جس کا افتتاح وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خان نے کیا۔ اس میں اٹھارہ اسلامی ملکوں نے شرکت کی اور اس میں اسلامی ایوانہائے تجارت وصنعت کے بین الاقوامی وفاق کی تشکیل کا فیصلہ کیا گیا۔

(٨) ۱۹۵۲ء میں آٹھویں بین الاقوامی اسلامی کانفرنس بھی کراچی میں مئی کے مہینے میں ہوئی۔ اس میں ترکی کے ممتاز قانون دان علی فواد باشگل نے شرکت کی۔[1]

(٩) ۱۹۵۳ء میں موتمر عالم اسلامی کا ایک اجتماع ہوا، جس میں پاکستان سے مولانا مودودی کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی لیکن مولانا نظر بندی کی وجہ سے اجلاس میں شریک نہیں ہوسکے۔

(١٠) ۱۹۵٦ء میں دمشق میں موتمر عالم اسلامی کا اجلاس ہوا، جس میں پاکستان سے مولانا مودودی نے شرکت کی اور ایک اجلاس کی صدارت بھی کی اور وہ موتمر کی تبلیغ ودعوت اسلامی کی کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔

اسلامی کانفرنسوں کی تاریخ سے متعلق ابھی تک تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ اوپر جو معلومات فراہم کی گئی ہیں وہ ابھی نامکمل ہیں مزید تحقیق کے بعد اور کانفرنس کا پتہ چل سکتا ہے جو ہوسکتا ہے مذکورہ بالا اجتماعات کی طرح بڑی نہ ہوں اور محدود نوعیت کی ہوں جیسا کہ ۱۰۔ ستمبر تا ۱۵۔ ستمبر ۱۹۴۹ء کو تونس میں ہونے والی اسلامی کلچرل کانفرنس تھی، جس میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے شرکت کی تھی۔[2] یا اسلامی دنیا کی خواتین کی پہلی کانفرنس جو کل پاکستان خواتین ایسوسی ایشن کے تحت ۲۹۔ فروری ۱۹۵۲ء کو لاہور میں ہوئی تھی۔ نصف صدی کی ان کوششوں کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ

(١) علی فواد باشگل: دین اور سیکولرازم (ترکی) حصہ دوم صفحہ ۳۳، استنبول ۱۹۵۵ء

(٢) اسلامک ریویو، ورکنگ لندن جولائی ۱۹۵۰ء

بال آخر ایک مضبوط بین الاقوامی اسلامی تنظیم کے لیے راہ ہموار ہوگئی۔ سعودی حکومت نے اس سلسلے میں پہل کی اور اس کے امداد و تعاون سے دنیائے اسلام کے چار سو ممتاز راہنماؤں کا ایک اجتماع ۱۹۶۲ء میں حج کے موقع پر مکہ معظمہ میں ہوا۔ اس اجتماع میں رابطۂ عالم اسلامی (the world muslim league) کے نام سے ایک مرکزی تنظیم قائم کی گئی۔ اس کی مجلس تاسیس کے لیے ہندوستان سے مولانا ابوالحسن علی ندوی اور پاکستان سے سید ابوالاعلیٰ مودودی منتخب کیے گئے۔ اسی طرح دوسرے اسلامی ملکوں سے ممتاز لوگ اس میں شامل ہیں۔

رابطۂ عالم اسلامی

رابطۂ عالم اسلامی دراصل ایک نیم سرکاری ادارہ ہے۔ اپنی مالی امداد کے لئے وہ سعودی عرب کی حکومت کا محتاج ہے اور سعودی حکومت کی مصلحتیں اس کی پالیسی پر اثر انداز ہوتی ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ ایک مفید ادارہ ہے اور اپنی کارروائیوں میں بڑی حد تک خود مختار ہے۔ سعودی عرب سے وابستگی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ادارہ کو اپنی سرگرمیوں کے لیے وافر مقدار میں فنڈ فراہم ہوجاتے ہیں جس کی وجہ سے رابطہ کی مختلف ذیلی شاخیں وسیع پیمانہ پر اشاعت اسلام کا کام انجام دے رہی ہیں۔ اس کے علاوہ رابطہ اسلامی دنیا کے مسائل میں گہری دلچسپی لیتا ہے۔ اگرچہ اس کی سرگرمیوں کا محور مسئلہ فلسطین ہے، لیکن مسئلہ کشمیر، فلپائن کے مسلمانوں کا جہاد آزادی، پٹانی کا مسئلہ، صومالیہ میں مہاجرین کا مسئلہ، قبرص، افغانستان اور اری ٹیریا کی طرح دوسرے مسئلوں پر بھی ضروری توجہ دی جاتی ہے۔ اس وقت رابطہ کے تحت جو ذیلی شاخیں کام کر رہی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) عالمی کونسل برائے مساجد

اس کونسل کا صدر دفتر مکہ معظمہ میں ہے ارکان کی تعداد چالیس ہے جو پوری اسلامی دنیا سے لیے گئے ہیں۔ پاکستان سے میاں طفیل محمد رکن ہیں۔ کونسل کا کام دنیا بھر میں مسجدوں کی تعمیر، مرمت اور تجدید کے لئے مالی امداد فراہم کرنا ہے۔ مثال کے طور پر ٹوکیو کی مسجد اور اسلامی مرکز کے لئے اسی نے مالی امداد فراہم کی ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں علاقائی شاخیں قائم ہیں جیسے یورپ کے لیے ایک یوروپی کونسل برائے مساجد ہے۔ اس علاقائی کونسل کے تحت ہر ملک میں ایک

ایک کونسل قائم ہے۔ ۱۹۸۲ء کے آغاز میں پیرس میں یوروپی کونسل برائے مساجد کا جو اجلاس ہوا تھا اس میں رابطہ کے سکرٹری جنرل محمد علی الحرکان نے بتایا کہ مساجد کونسل کی سفارش پر رابطہ عالم اسلامی نے فرانس کی تین سو مسجدوں کی مرمت اور دیکھ بھال کے لئے تیس لاکھ فرانک فراہم کیے ہیں۔[1] یوروپی کونسل کا مرکز بروسلز (بلجیم) میں ہے۔ونسل برائے مساجد کے کام کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جنوری ۱۹۸۲ء تک شاہ خالد نے کونسل کو جو ذاتی امداد دی تھی وہ نوے لاکھ ریال ہے۔ سعودی حکومت نے ساڑھے چار کروڑ ریال کی جو امداد دی وہ اس کے علاوہ ہے۔[2]

(۲) رابطہ عالم اسلامی کی ایک اور ذیلی شاخ ''اسلامی مجلس فقہ'' ہے جو بیس افراد پر مشتمل ہے۔ یہ افراد الجزائر، پاکستان، تونس، انڈونیشیا، عراق، لبنان، موری تانیا، نائیجیریا اور ہندوستان سے لیے گئے ہیں۔ پاکستان سے عبدالقدوس ہاشمی کو لیا گیا ہے۔

(۳) اسلامی رابطہ کونسل برائے افریقہ بھی رابطۂ عالم اسلامی کی ایک اہم شاخ ہے۔ اس کا مرکز سینگال کا صدر مقام ڈاکر ہے جہاں اس کا پہلا اجلاس ۱۹۷۶ء/۱۳۹۷ھ کو ہوا تھا۔ اس کونسل کا مقصد افریقہ کی اسلامی تنظیموں کے درمیان باہمی رابطوں کو مضبوط بنانا ہے تاکہ افریقہ میں غیر اسلامی سرگرمیوں کا زیادہ قوت کے ساتھ مقابلہ کیا جاسکے اور اسلام کی اشاعت کی جاسکے۔

گزشتہ سات سال میں رابطہ عالم اسلامی اس ادارے کے توسط سے نوے لاکھ ریال افریقہ کے اسلامی اداروں کو دے چکا ہے۔ اس میں تیس لاکھ ریال مبلغوں کی تربیت اور ان کے دوروں کے لئے دیئے گئے اور تیس لاکھ ریال قرآن کی طباعت اور افریقی مسلمانوں میں قرآن تقسیم کرنے صرف کیے گئے۔

رابطہ کی طرف سے مکہ معظمہ سے انگریزی میں ایک معیاری ماہنامہ دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل شائع ہوتا ہے۔ جس میں رابطہ کی سرگرمیوں کے علاوہ اسلامی دنیا سے متعلق مفید اور معلومات افزا مضامین شائع ہوتے ہیں اور اسلامی دنیا کے اہم مسائل کی طرف دنیا کو توجہ دلائی جاتی ہے۔

(۱) دی مسلم ورلڈ لیگ جرنل (مکہ) فروری ۱۹۸۲ء

(۲) ایضاً

اسلامی ملکوں کی تنظیم

جس طرح رابطہ عالم اسلامی دنیائے اسلام کی غیر سرکاری تنظیم ہے، اسی طرح اسلامی ملکوں کی تنظیم اسلامی دنیا کی سرکاری تنظیم ہے جو تمام اسلامی ملکوں کی حکومتوں پر مشتمل ہے۔ چونکہ یہ تنظیم ستمبر ۱۹۶۹ء میں رباط میں اسلامی ملکوں کے سربراہوں کی کانفرنس کے فیصلوں کے تحت قائم کی گئی اس لیے اس کا صحیح نام اسلامی کانفرنس کی تنظیم ہے۔

۹۔ رجب/ ۲۲۔ ستمبر تا ۱۲۔ رجب/ ۲۵ ستمبر ۱۹۶۹ء/۱۳۸۹ھ رباط میں تقریباً چالیس سربراہوں کا جو اجماع ہوا تھا وہ ایک تاریخ ساز واقعہ ہے کیونکہ اسلامی تاریخ میں پہلی مرتبہ تمام اسلامی ملکوں کے سربراہ اس اجتماع میں شریک ہوئے تھے۔ اس اجتماع نے اتحاد اسلام کے اس خواب کو حقیقت کا جامہ پہنا دیا، جو جمال الدین افغانی نے سو سال پہلے دیکھا تھا۔ رابطہ عالم اسلامی کی تشکیل کی طرح مسلمان سربراہوں کے اس اجتماع کے سلسلے میں اور اس کے بعد اسلامی ملکوں کی تنظیم کی تشکیل میں بھی بنیادی کردار سعودی عرب اور شاہ فیصل نے ادا کیا تھا اس کے بعد اسلامی سربراہوں کی کانفرنس اور اسلامی وزرائے خارجہ کی کانفرنس کے اجتماعات معمولات میں سے ہو گئے۔

اسلامی ملکوں کی تنظیم ستمبر ۱۹۶۹ء میں رباط میں مسلمان سربراہوں کی کانفرنس کے فیصلوں اور اس کے بعد مارچ ۱۹۷۰ء میں جدہ میں اور ستمبر ۱۹۷۰ء میں کراچی میں اسلامی وزرائے خارجہ کی کانفرنسوں کے فیصلوں کے نتیجے میں مئی ۱۹۷۱ء میں قائم کی گئی۔ صدر دفتر جدہ میں ہے جو اسلامی سکرٹریٹ کہلاتا ہے۔

اسلامی تنظیم کے تحت گزشتہ دس سالوں میں جو ادارے قائم کیے گئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) بین الاقوامی اسلامی خبر رساں ایجنسی: یہ دسمبر ۱۹۷۲ء میں قائم کی گئی لیکن بعض اسباب

کی بناء پر ابھی تک کام شروع نہیں کر سکی۔صرف دفتر قائم ہے۔

(۲) اسلامی کمیشن برائے معاشی، ثقافتی اور سماجی امور (iceasa) یہ اسلامی تنظیم کا خاص ادارہ ہے۔ وزرائے خارجہ کی کانفرنسوں میں منظور کی جانے والی قراردادوں پر عمل درآمد کی ذمہ داری اسی ادارہ پر ہے۔ یہ کمیشن لاہور میں ہونے والی دوسری سربراہ کانفرنس (۱۹۷۴ء) کے فیصلوں کے مطابق قائم کی گئی ہے۔

(۳) اسلامی ترقیاتی بنک: یہ بنک ۱۹۷۴ء میں قائم ہوا لیکن کام کا صحیح معنوں میں آغاز جنوری ۱۹۷۷ء سے ہوا۔ صدر دفتر جدہ میں ہے۔ ڈھائی ارب ڈالر کے سرمایہ سے شروع کیا گیا ہے اور اسلامی ملکوں کو بلاسودی قرضے فراہم کرتا ہے۔ سعودی عرب کے ڈاکٹر محمد علی صدر ہیں۔

(۴) اسلامی استحکام فنڈ (ISF) یہ فنڈ لاہور کی سربراہی کانفرنس ۱۹۷۴ء کی ایک قرارداد کے تحت قائم کی گیا ہے۔ اس کا مقصد اسلامی ممالک میں ہونے والی دینی تعلیمی اور سماجی کاموں میں مدد کرنا اور ان کا معیار بلند کرنا ہے۔

(۵) اسلامی ایوان تجارت، صنعت وتبادلۂ اجناس: اس کا صدر دفتر کراچی میں ہے ایوان کا پہلا اجلاس فروری ۱۹۸۰ء میں ڈاکر (سینیگال) میں ہوا تھا۔

(۶) اسلامی ملکوں کی نشریاتی تنظیم (ISBO) وصدر دفتر جدہ میں ہے۔ اس تنظیم کا مقصد اسلامی ملکوں کے نشریاتی پروگراموں کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کرنے میں مدد دینا ہے۔

(۷) اعداد وشمار اور معاشی اور سماجی ترقی اور تربیت کا مرکز۔ یہ مرکز ۱۹۷۸ء میں قائم کیا گیا۔ صدر دفتر انقرہ (ترکی) میں ہے۔

(۸) فنی اور پیشہ ورانہ تربیت اور تحقیق کا مرکز۔ ڈھاکہ میں مارچ ۱۹۸۱ء میں سنگ بنیاد رکھا گیا۔ ۱۹۸۳ء سے کام شروع کرے گا۔

(۹) اسلامی تاریخ، آرٹ اور کلچر کا تحقیقی مرکز۔ یہ مرکز استنبول میں قائم کیا جا رہا ہے اور اس کے استحکام فنڈ نے رقم فراہم کی ہے۔

(۱۰) اسلامک بنکنگ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ: یہ ادارہ ۲۸۔ مارچ ۱۹۸۱ء میں قبرص میں قائم کیا گیا۔

(۱۱) اسلامک کونسل آف یورپ: یہ کونسل، اسلامی وزرائے خارجہ کی تیسری اور چوتھی کانفرنس کی قراردادوں کی تعمیل میں مئی ۱۹۷۳ء میں قائم کی گئی اس کا صدر دفتر لندن میں ہے۔

مذکورہ بالا اداروں کے علاوہ دو اور ادارے بھی ہیں جن کا اگرچہ اسلامی ملکوں کی تنظیم سے تعلق نہیں لیکن وہ بھی بین الاقوامی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں ایک شاہ فیصل فاونڈیشن ہے جو ۱۹۷۶ء میں شاہ فیصل شہید کی یاد میں قائم کی گئی اور جس کی طرف سے ہر سال اسلامی اور علمی و ادبی کارناموں پر شاہ فیصل ایوارڈ دیا جاتا ہے۔ یہ اسلامی دنیا کا پہلا اور سب سے بڑا انعام ہے اور یورپ کے نوبل انعام کی طرح ہے۔ یہ انعام دو لاھ ریال کا ہوتا ہے۔

دوسرا ادارہ ''اسلامی بنکوں کی بین الاقوامی'' ایسوسی ایشن ہے جس کے صدر شاہ فیصل کے صاحبزادے شہزادہ محمد فیصل ہیں۔ اس کا مقصد بنکوں کو اسلامی اصولوں کے مطابق چلانے میں مدد کرتا ہے۔

عالمِ اسلام کے معروف مصنفین کی چار مقبول ترین کتابیں

خطبات
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اسلام اور ایمان کی جامع تعریف اور عبادات کی منفرد تشریح
ایسی کتاب جس نے لاکھوں زندگیوں کو تبدیل کر دیا

محمد عربی ﷺ
محمد عنایت اللہ سبحانی

اسوہ رسول ﷺ کا تحریکی انداز میں مطالعہ
سیرت پاک ﷺ کی مقبول ترین کتاب

راہِ عمل
مولانا جلیل احسن ندوی

احادیث رسول ﷺ کی روشنی میں راہنمائی کا انمول خزینہ
مختصر مگر جامع تشریح

آدابِ زندگی
مولانا محمد یوسف اصلاحی

بندگانِ خدا کے دلوں میں اسلام کا جذبہ شوق
وعقیدت بیدار کرنے کے لیے قرآن اور حدیث
کی روشنی میں کامیاب زندگی کے سنہری اصول
ہر طبقہ فکر میں یکساں مقبول

★ چاروں کتابیں یکساں سائز، خوبصورت ٹائٹل، امپورٹڈ کاغذ، معیاری طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ
★ عید، شادی اور دیگر خوشی کے مواقع پر خوبصورت تحفہ

3-969-423-065-8
00312

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
منصورہ ملتان روڈ، لاہور پاکستان 042-35252501-2